خصوصی دعائے استغفار

حدیث شریف میں آیا ہے:

ایک شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں (روتا پیٹتا) ''ہائے میرے گناہ، ہائے میرے گناہ'' کہتا آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شخص کو مندرجہ ذیل دعا تعلیم فرمائی۔ اس نے اسی طرح دعا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''دوبارہ کہو'' اُس نے دوبارہ یہی کلمات کہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''سہ بارہ کہو''۔ اُس نے تیسری مرتبہ یہی کلمات کہے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اٹھو جاؤ اللہ نے (تمھارے گناہ) بخش دیے۔''

(بحوالہ حصن حصین)

اَللّٰهُمَّ مَغْفِرَتُكَ أَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِيْ وَرَحْمَتُكَ
أَرْجٰى عِنْدِيْ مِنْ عَمَلِيْ ○

اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت زیادہ وسیع ہے
اور مجھے اپنے عمل کی بہ نسبت تیری رحمت کی بہت زیادہ امید ہے۔

طالب شاہد انجم جتوئی (کراچی)

نعتیہ ادب کا کتابی سلسلہ

نعت رنگ

شمارہ ۱۰ | اپریل ۲۰۰۰ء

اس شمارے کی قیمت

پاکستان : ۱۰۰ روپے

بیرون ملک

(بذریعہ ایئر میل)

سعودی عرب : 25 ریال
یو اے ای : 30 درہم
امریکا : 18 ڈالر
برطانیہ : 5 پاؤنڈ

سرورق پر

عکس خطاطی
غلام حسین امیر خانی

ناشر

اقلیم نعت

CONTACT :
E-13, Phase V, T&T Flats,
Shadman Town II,
North Karachi 75850
Pakistan
Tel : (92-21) 6901213
Fax : (92-21) 4941733
Email : naatrang@yahoo.com

مرتب و ناشر [illegible] نے [illegible] (پرائیویٹ) لمیٹڈ سے چھپوا کر مرکزی دفتر اقلیم نعت
[illegible] شادمان ٹاؤن نمبر ۲، نارتھ کراچی [illegible] سے شائع کیا

جن لوگوں پہ ہے انعام ترا اُن لوگوں میں لکھ دے نام مرا
محشر میں مرا رہ جائے بھرم اللہ کرم اللہ کرم

(صبیح رحمانی)

منجانب

صوفی سید محمد جمال (کراچی)

نعت گوئی میں اپنے والہانہ آہنگ کے سبب شہرت پانے والے

حضرت مولانا محمد اکبر وارثیؒ

حضرت مولانا ضیاء القادری بدایونیؒ

حضرت مولانا اختر الحامدی بدایونیؒ

حضرت بہزاد لکھنویؒ

حضرت منور بدایونیؒ

اور

حضرت شاہ ستار وارثیؒ

کے نام

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز کی اہم مطبوعات

کتاب	حصہ	صفحات	مصنف	قیمت
۱- احسن البیان فی تفسیر القرآن	حصہ اول	صفحات ۴۴۸	سید فضل الرحمٰن	170/=
۲- //	حصہ دوم	// ۴۰۸	// //	170/=
۳- //	حصہ سوم	// ۴۶۴	// //	170/=
۴- //	حصہ چہارم	// ۴۶۴	// //	170/=
۵- استحکام پاکستان، سیرت طیبہ کی روشنی میں		// ۶۰	سید عزیز الرحمٰن	30/=
۶- افکار زواریہ		// ۲۸۰	ترتیب سید فضل الرحمٰن	120/=
۷- تحریک پاکستان کے فکری محرکات		// ۹۶	سید فضل الرحمٰن	40/=
۸- تحفہ ابراہیمیہ، (مکتوبات دوست محمد قندھاریؒ)		// ۱۹۲	ترجمہ صوفی محمد احمد صاحبؒ	50/=
۹- تعمیر شخصیت و فلاح انسانیت،		// ۶۰	سید عزیز الرحمٰن	30/=
۱۰- خطبہ حجۃ الوداع		// ۴۴	سید فضل الرحمٰن	25/=
۱۱- خطوط ہادئ اعظم ﷺ		// ۷۲	// //	40/=
۱۲- رہبر حج (جیبی سائز)		// ۱۹۲	// //	20/=
۱۳- زبدۃ الفقہ خلاصہ عمدۃ الفقہ	حصہ اول	// ۱۲۸	مولانا سید زوار حسین شاہ صاحبؒ	35/=
۱۴- // // //	حصہ دوم	// ۲۵۶	//	50/=
۱۵- // // //	حصہ سوم	// ۱۲۸	//	35/=
۱۶- عمدۃ السلوک		// ۳۸۴	//	120/=
۱۷- مقالات زواریہ		// ۵۶۸	ترتیب سید فضل الرحمٰن	185/=
۱۸- موسیقی کی حقیقت		// ۴۰	سید عزیز الرحمٰن	25/=
۱۹- ہادئ اعظم ﷺ کا شجرۂ طیبہ (آرٹ پیپر سائز ۲۰x۳۰)			سید فضل الرحمٰن	30/=

زوار اکیڈمی پبلی کیشنز
الفضل-اے-۴/۱۷، ناظم آباد نمبر ۴، کراچی نمبر ۱۸، پوسٹ کوڈ ۷۴۶۰۰، فون: ۶۶۸۴۷۹۰

دھنک

فکر و فن

نعتیں

عزیز احسن (کراچی)

دل پر مرے احساس نے جو حرف لکھا ہے
ہے تیرے سوا کون کہ جس نے وہ پڑھا ہے
تصویر تری کثرتِ جلوہ سے ہے معدوم
آئینہ حیرت ہے کہ آغوش کشا ہے
ہر آنکھ ہے رنگوں کی فراوانی سے خیرہ
وحدت کا تری بھید کھلا تھا نہ کھلا ہے
تو نے ہی تو ہر مرحلۂ شوق میں یارب!
اس چشمِ تماشہ کو نیا عزم دیا ہے
جو تو نہیں چاہے وہ کبھی ہو نہیں سکتا
ہر کام فقط تیرے ارادے سے ہوا ہے
ہر جاں کو تسلی کہ حفاظت میں ہے تیری
ہر زخم تری چشمِ عنایت سے بھرا ہے
ایماں ترے ہونے کا، مری جاں کا اثاثہ
ایمان ترے قرب کا اس دل کی جلا ہے
تو نے ہی مجھے نطق کی دولت سے نوازا
تو نے مرے احساس کو اظہار دیا ہے
احسن پہ عنایات کے در باز ہوں یارب
یہ دشتِ تحیر میں تجھے ڈھونڈ رہا ہے

☆

خراب فردِ عمل ہو نہ جائے اے سیماب
اسے جنابِ رسالت مآب ﷺ دیکھیں گے

(سیماب اکبر آبادی)

منجانب

کیپٹن (ر) وارث النبی اعوان

ابتدائیہ

نعت رنگ کا دسواں شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ اللہ رب العزت کے کرم خاص، سرور کائنات ﷺ کی توجہ، قلمی معاونین کی سچی لگن، مستعدی اور سرپرستوں اور قارئین کی مسلسل حوصلہ افزائیوں کا کمال ہے کہ نعت رنگ تیزی سے اپنا ادبی مشن اور اشاعتی سفر طے کر رہا ہے۔

آج نعت رنگ کو علمی و ادبی دنیا میں جو اعتبار حاصل ہوا ہے وہ صرف اس لئے نہیں ہے کہ یہ جریدہ ایک خاص موضوع سے متعلق ہے یا اس کا مقصد حبِ رسالت ﷺ کی تبلیغ و ترویج ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ نعتیہ ادب میں موجود برسوں کے تنقیدی جمود کو توڑنے اور اس پر ہونے والی گفتگو کو ایک خاص روایتی فضا سے نکال کر خالص ادبی و شعری معیارات کے تناظر اور شرعی مسلمات کی روشنی میں پرکھنے اور نعت کو ادبی سطح پر عام کرنے کی کوششوں کے سبب ہے۔

نعتیہ ادب پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے۔ اس کے آثار و نتائج سے انکار ممکن نہیں لیکن ادبی حیثیت سے اس کا جائزہ بہت کم نظر آتا ہے اور اگر کچھ کام ہوا بھی ہے تو وہ یکجا نہیں، اس اعتبار سے نعت رنگ کے شمارے خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم نے ہمیشہ یہی کوشش کی ہے کہ نعت رنگ کے شماروں میں ایسے مضامین و مواد پیش کیا جائے جو آئندہ نعت پر کام کرنے والوں کی علمی اور حوالہ جاتی ضرورت بن جائے۔ نعت رنگ کا یہ شمارہ بھی ہماری اسی خواہش کا اظہار ہے۔

صبیح رحمانی

رشید وارثی
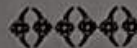
اُردو نعت میں ادب رسالت کے منافی اظہار کی مثالیں

اُردو کی نعتیہ شاعری میں کثرت سے ایسے اشعار موجود ہیں جن میں ذات رسالت مآب ﷺ کے والہانہ عشق و محبت، آپ کے اسوۂ حسنہ، سیرت طیبہ اور شمائل و فضائل مبارکہ سمیت، صنف نعت کے شایانِ شان سیکڑوں موضوعات کو ایسی لطیف و اعلیٰ مضمون آفرینی اور ثقاہت بیان کے ساتھ شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے کہ ان تقدیس مآب نعت نگاروں کے عشق کی صداقت، علم کی وجاہت، بیان کی لطافت اور فن کی عظمت و جلالت کو بے اختیار خراج تحسین پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان مقدس اور مفید و نیف اشعار میں کتاب و سنت کے عمیق مطالعے، گہرے تدبر و تفکر اور فیضانِ عشق رسالتمآب (ﷺ) کے زیر اثر احترام رسالتؐ اور مقام مصطفائیؐ سے ان مداحین سرور انام ﷺ کی ممکنہ حد تک آشنائی کی حقیقت ہماری عقل سلیم اور معیار تفہیم کے مطابق ہم پر عیاں ہوتی ہے جس سے ہمارے خیال و فکر کی تہذیب ہوتی ہے اور ہمارے قلوب عشق سرکار دو عالم (ﷺ) کی حیات افزا حرارت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

بارگاہِ رسالت کے ادب و اقرار کی جلوہ گری کے آئینہ دار اور عرفان و آگہی کی روشنیاں بکھیرتے ہوئے ان ہزاروں اشعار کی خوشگوار موجودگی سے قطع نظر ہم اس روح فرسا حقیقت کو بھی فراموش نہیں کر سکتے کہ اُردو کے نعتیہ ادب میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں جو بارگاہِ محبوب و ممدوح کردگار صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور آپ کے ادب و احترام کو ہر آن پیش نظر رکھنے کے حوالے سے کتاب و سنت کی واضح تعلیمات کے نہ صرف منافی ہیں بلکہ ان میں سے بعض اشعار میں تو غیر مودب اظہار کی ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن میں موجود رکیک، سوقیانہ و عامیانہ بلکہ معاذاللہ گستاخانہ حد تک گرے ہوئے الفاظ و معانی اور انداز بیان سے کسی طور چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ فقہی اعتبار سے یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں کسی شخص کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنے کے بجائے ان کی نشاندہی ہر صاحب علم پر واجب ہو جاتی ہے تاکہ لاعلمی یا ناواقفیت کی بناء پر ان غلطیوں کو دُہرائے جانے کا سدِباب کیا جا سکے یہی وہ احساس ہے جس نے مجھے اس بات پر غور و فکر کرنے کا حوصلہ عطا کیا کہ نعتؐ جیسی رفیع الشان اور مقدس صنف سخن میں بعض شعرائے

کرام کے اس غیر محتاط رویے کی آخر وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟

اس حوالے سے طویل غور و خوص اور اپنی مقدور بھر کوشش و جستجو کے نتیجے میں یہ احقر العباد اُردو نعت میں بعض شعرائے کرام کے غیر محتاط رویے کی جو وجوہات سمجھ سکا ہے ان میں سے کچھ اہم وجوہات درج ذیل ہیں:

(۱) نعتیہ اشعار کے شایان شان بلند معانی اور اسلوب بیان پر خاطر خواہ توجہ دینے کے بجائے شعرائے کرام کا اپنی قادر الکلامی کے احساس کے تحت محض قافیہ پیمائی اور فن بدیع کے محاسن پر ہی پوری توجہ مرکوز رکھنا۔

(۲) اس حقیقت سے بے خبری کہ نعت نگاری کے تقاضے عام قصیدہ گوئی کے لوازمات سے بہت ارفع و اعلیٰ ہیں۔

(۳) فن نعت گوئی پر نقد و نظر سے بے اعتنائی یا نعتیہ ادب کو غیر مسلم مغربی مفکرین کے وضع کردہ نقد و نظر کے پیمانوں ہی سے ماپنا اور کسی نہ کسی صورت میں انہی پیمانوں پر انحصار کرنا۔

(۴) اس بات کا ادراک نہ رکھنا کہ محض رہوار تخیل کی اساس پر مضمون آفرینی نعت جیسی مقدس اور ارفع و اعلیٰ صنف سخن کے تقاضوں سے فروتر ہے۔

(۵) غزل سے نعت کی جانب پیش رفت کرنے والے شعرائے کرام کی یہ روش کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر نعتیہ اشعار میں ایسے مضامین نظم کر جاتے ہیں جن میں شوخی و بے باکی اور بعض اوقات عامیانہ پن بھی در آتا ہے۔

(۶) دور جدید میں بعض شعرائے کرام کا یہ رویہ کہ وہ نعت نگاری کے تقاضوں کو پس پشت ڈال کر اپنے معاصرین میں ایک منفرد مقام حاصل کرنے کے لئے غیر محتاط انداز میں نعتیہ شعر نظم کر جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا ایسی دیگر وجوہات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ نعت نگاری میں اکثر بے احتیاطیوں کی سب سے بنیادی اور عام وجہ یہ ہے کہ ہمارے اکثر نعت گو شعرائے کرام ذات محبوب خدا علیہ السلام کی عظمت و توقیر اور آپ کی تعظیم و تکریم کے فرض عین ہونے اور آپ کے اسوۂ کامل، آپ کے محاسن اخلاق، آپ کی جلالت شان اور بارگاہِ کبریائی میں آپ کے مقام رفیع کے حوالے سے کتاب و سنت کی تعلیمات سے واجبی سی بھی آگاہی نہیں رکھتے چنانچہ نفس مضمون پر براہِ راست گفتگو سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم نعتیہ ادب کے اپنے ساتھی طلبہ کی خدمت میں بارگاہ رسالت کے ادب و احترام کے حوالے سے نصوص شریعہ کی روشنی میں مناسب مواد پیش کریں۔

رسولِ اکرم ﷺ کی عظمت شان اور آپ کی بارگاہ اقدس کا ادب و احترام

حضور اکرم ﷺ کی تعظیم و توقیر حرمات الٰہی میں شامل ہے۔ آپ باعث تخلیق کائنات ہیں جیسا کہ حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لولاک لما خلقت الافلاک" یعنی (اے حبیبؐ) اگر آپ نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو ہی پیدا نہ کرتا۔ (تفسیر روح المعانی بحوالہ امام ماوردیؒ) آپ اصل کائنات ہیں جیسا کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ العزیز معارف لدینہ میں تحریر فرماتے ہیں

"کسی چیز کا ظہور بغیر تعین اور امتیاز ہونے کے ناممکن ہے لہٰذا ذات کی تجلی اور ظہور (ھوالظاہر) تعین ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے اور یہ تعین اول ہی ہے جو تمام تعینات میں سب سے وسیع تر اور عظیم تر ہوتا ہے۔ اس کو "وحدت" کہتے ہیں اور وہ اسم جو آنحضرت ﷺ کا مبداء تعین ہے، وہ یہی "وحدت" ہے۔ لہٰذا حقیقت محمدیہ (ﷺ) کل ہوگی اور باقی تمام موجودات کے حقائق اس کے اجزاء ہوں گے۔"

تو اصل وجود آمدی از نخست
دگر ہرچہ موجود شد فروع تست

(شیخ سعدیؒ)

مولانا اشرف علی تھانوی صاحب نے نشر الطیب میں مسند عبدالرزاق اور دیگر ماخذ سے حضور اکرم ﷺ کے اصل کائنات ہونے پر دلائل پیش کئے ہیں۔

اسی طرح آپ اللہ تعالیٰ کا نور ہیں، جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

"جاننا چاہئے کہ پیدائش محمدی (ﷺ) تمام افراد انسان کی پیدائش کی طرح نہیں بلکہ افراد عالم میں سے کسی فرد کی پیدائش کے ساتھ نسبت نہیں رکھتی کیونکہ آنحضرت ﷺ باوجود عنصری پیدائش کے، حق تعالیٰ کے نور سے پیدا ہوئے ہیں جیسے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا "خلقت من نورِ الله" (یعنی میری تخلیق اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوئی)

(تفسیر ضیاء القرآن، جلد سوم، بحوالہ مکتوبات امام ربانی، مکتوب نمبر ۱۰۰)

اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں تمام انبیاء علیہم السلام سے آپ کی تصدیق کرنے اور مخالفوں کے مقابلے میں آپ کی تائید کرنے کا عہد لیا جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"اور یاد کرو جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں سے یہ عہد لیا کہ میں انہیں کتاب اور

حکمت عطا فرماؤں پھر تمہارے پاس وہ رسول آجائے جو اس چیز (کتاب) کی تصدیق کرنے والا ہے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور ان پر ایمان لانا اور ان کی تائید کرنا۔ (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اور میرے اس بھاری عہد کو قبول کرتے ہو؟ انہوں نے کہا ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا پس گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔ (آل عمران: ۸۱)

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بعض حدیثوں میں ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو انہیں بھی میری اتباع کے سوا چارہ نہ تھا۔ پس ثابت ہوا کہ ہمارے رسولؐ خاتم الانبیاء ہیں اور امام اعظم (امام الانبیاء) ہیں۔ جس زمانے میں بھی آپ کی نبوت ہوئی آپ واجب الاطاعت ہوئے اور تمام انبیاء کی تابعداری جو اس وقت ہوئے آپ کی اطاعت مقدم رہی۔ یہی وجہ تھی کہ اسراء کی شب بیت المقدس میں تمام انبیاء کے آپ ہی امام بنائے گئے اسی طرح میدانِ محشر میں بھی بارگاہِ الٰہی میں آپ ہی شفیع ہوں گے۔ یہی وہ مقام محمود ہے جو آپ کے سوا اور کسی کے لائق نہیں (تفسیر ابن کثیر)

یوں تو اللہ تعالیٰ کے سب رسول نفس رسالت میں اور تمام انبیاء نفس نبوت میں برابر ہیں لیکن جن مراتب و کمالات سے دیگر انبیاء و رسل علیہم السلام کو سرفراز کیا گیا، اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وہ سب مراتب و کمالات اعلیٰ ترین صورت میں عطا فرمائے یعنی حضور اکرم ﷺ تمام انبیائے سابقین کے کمالات و معجزات کے جامع ہیں اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب گذشتہ صحف سماوی کی مصدق اور جامع ہے۔ آپ کی شان محبوبیت ہی کی معجز نمائی ہے کہ آپ کو دیگر انبیاء و رسل پر یوں بھی فضیلت عطا فرمائی گئی کہ آپ کو نہ صرف تمام بنی نوع انسان بلکہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کیلئے رسول بنایا گیا جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے اُرسلت الی الخلق کافة یعنی مجھے تمام مخلوق کیلئے رسول بنایا گیا۔ (صحیح مسلم) اس حدیث پاک سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جناب حبیب خدا ﷺ کی رسالت زمان و مکان کے تعینات سے ماوراء ہے۔ آپ چونکہ منصب ختم نبوت پر فائز ہیں لہٰذا قیامت تک آپ کی شریعت نافذ رہے گی اور ازل سے ابد تک کے تمام افراد آپؐ ہی کے عرصہ رسالت میں محشور ہوں گے۔ آپ صاحب مقام محمود ہونے کی حیثیت سے صرف اپنی اُمت مرحومہ ہی کے شفیع نہیں بلکہ شفیع الامم کے منصب پر بھی فائز ہوں گے۔

حضور اکرم ﷺ کی عظمت شان کے حوالے سے خاص طور پر یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے اسمائے حسنیٰ میں سے کم و بیش ۸۸ اسمائے مبارکہ سے اپنے محبوب پاک علیہ الصلوٰۃ و تسلیم کو متصف فرمایا ہے جن کی تفصیل بیروت کے معروف محقق علامہ یوسف بن اسماعیل نبہانی

رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الاسمی" کے مقدمے میں بیان کی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ موصوف نے اپنی کتاب "احسن الوسائل فی اسماء النبی الکامل" میں جناب رسالتمآب ﷺ کے تقریباً آٹھ سو بیس اسمائے طیبہ کی صراحت فرمائی ہے جن کی برکت سے نعتیہ ادب کے طلباء کو شان رسول انام ﷺ کے حوالے سے بڑی حد تک رہنمائی مل سکتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے اسمائے مبارکہ پر دعوتِ فکر دینے سے پہلے میں اپنے نعت نگار ساتھیوں سے مودبانہ گزارش کرنا چاہوں گا کہ وہ سر دست ذیل میں دی ہوئی قرآنی آیات اور ان کی تفسیر کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کریں تو انہیں حضور ﷺ کی رفعت شان کے حوالے سے گوہر مراد حاصل ہو سکتا ہے۔

(۱) رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ (سورۃ النساء، آیت: ۸۰)

(۲) حضور اکرم ﷺ کی محبت و اطاعت اللہ تعالیٰ کی محبت کی نوید ہے۔ (آل عمران: ۳۱)

(۳) حضور اکرم ﷺ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ (الحجرات: ۱)

(۴) حضور اکرم ﷺ کی عطا اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ (التوبہ: ۵۹)

(۵) حضور اکرم ﷺ کا فضل اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ (التوبہ: ۷۴)

(۶) حضور اکرم ﷺ کو اذیت دینا اللہ تعالیٰ کو اذیت دینا ہے۔ (الاحزاب: ۵۷)

(۷) حضور اکرم ﷺ کا دست مبارک اللہ تعالیٰ کا دست مبارک ہے۔ (الفتح: ۱۰)

(۸) حضور اکرم ﷺ کی بیعت اللہ تعالیٰ کی بیعت ہے۔ (الفتح: ۱۰)

(۹) حضور اکرم ﷺ کا عمل اللہ تعالیٰ کا عمل ہے۔ (الانفال: ۱۷)

(۱۰) حضور اکرم ﷺ کی رضا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ (التوبہ: ۶۲)

(۱۱) حضور اکرم ﷺ کی مخالفت اللہ تعالیٰ کی مخالفت ہے۔ (التوبہ: ۶۳)

(۱۲) حضور اکرم ﷺ کا حکم اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ (الاحزاب: ۳۶)

(۱۳) حضور اکرم ﷺ کا انکار اللہ تعالیٰ کا انکار ہے۔ (التوبہ: ۵۴)

(۱۴) حضور اکرم ﷺ کی حرام کردہ چیز اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیز ہے۔ (التوبہ: ۲۹)

(۱۵) حضور اکرم ﷺ کا کسی کو بلانا اللہ تعالیٰ کا بلانا ہے۔ (الانفال: ۲۴)

محولہ بالا چند قرآنی آیات کے علاوہ اگر قرآن حکیم کا کم از کم ایک بار کسی معیاری ترجمے اور تفسیری حاشیوں کے ساتھ مطالعہ کر لیا جائے تو حضور اکرم ﷺ کی مدح و ثنا کے بے شمار پہلو ہم پر عیاں ہو سکتے ہیں اس طرح ہمارے قلب و ذہن روشن و منور ہوں گے اور ہمارے خیال و فکر میں وسعت کے ساتھ مزید اعتماد پیدا ہو گا۔

بارگاہِ رسالتمآب ﷺ کا ادب واحترام

ادب انسانی سرشت کا وہ جوہر ہے جو عشق ومحبت کا ثمرہ ہے اور کسی شخص کے معیار اطاعت کا اندازہ اس کے حسن ادب ہی سے کیا جاتا ہے۔ بقول ابو حفص حداد رحمۃ اللہ علیہ انسان کا ظاہری حسن ادب اس کے باطنی حسن ادب کا عنوان ہے۔ یہی وہ جوہر ہے جو انسان کی روحانی ترقی اور فائز المرام ہونے کا پیش خیمہ ہے۔

"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"

قرآن کریم میں کئی مقامات پر حضور اکرم ﷺ کی تعظیم و توقیر کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "اور ان کی مدد کرو اور دل سے ان کی تعظیم و توقیر کرو اور صبح وشام اللہ کی پاکی بیان کرو۔" (الفتح :۹) چونکہ آپ کی حقیقی تعظیم وتکریم کا جذبہ آپ کی محبت کے بغیر دل میں پیدا نہیں ہو سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی اور اپنے محبوب کی محبت کو تمام دنیاوی محبتوں پر مقدم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے "(اے حبیب!) آپ (مسلمانوں سے) فرمایئے اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں گھاٹے کا تم اندیشہ کرتے ہو اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) لے آئے اور اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہدایت نہیں دیتا جو نافرمان ہے۔ (التوبہ :۹) اسی طرح سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جانوں سے زیادہ مالک ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ آپؐ سے عرض کیا کہ میرے پہلوؤں کے درمیان جو میری جان پوشیدہ ہے اس کے علاوہ آپ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا تم میں کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔ یہ ارشاد پاک سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا اگر ایسا ہے تو قسم ہے اس ذات پاک کی جس نے آپ کو حق وصداقت کے ساتھ کتاب ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے فرمایا، اے عمرؓ اب تمہارا ایمان مکمل ہوا ہے۔ (کتاب الشفا) قرآن وحدیث کے ان نصوص سے یہ ثابت ہوا کہ آپ کی محبت ہی ایمان کی اساس ہے اور آپ کی تعظیم وتکریم ہر مسلمان پر واجب ہے۔

آپ کی بارگاہِ اقدس کے ادب واحترام کے حوالے سے بھی قرآن کریم اور کتب احادیث کے مطالعے سے ہمیں جو رہنمائی حاصل ہوتی ہے اس کی سب سے زیادہ سبق آموز مثال سورۃ الحجرات کی ابتدائی

آیات اور ان کی شان نزول ہے جسے ہم اس موضوع پر اپنے اب تک کے مطالعے کا حاصل سمجھتے ہیں۔ اس ایک مثال میں بارگاہِ محبوب کردگار ﷺ کے ادب واحترام کے ہزارہا پہلو ہمیں دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات میں ارشاد باری تعالیٰ ہے "اللہ اور اس کے رسول کی اجازت سے پہلے تم سبقت نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ایمان والو! اپنی آوازیں اونچی نہ کرو اس غیب بتانے والے (نبی) کی آواز سے اور ان کے حضور بات چلا کر نہ کہو جیسے آپس میں ایک دوسرے کے سامنے چلاتے ہو کہ کہیں تمہارے اعمال اکارت نہ ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو۔"

ابن کثیر اس آیہ مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں "یہ آیت حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے بارے میں نازل ہوئی۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے کہ قریب تھا کہ دو بہترین ہستیاں ہلاک ہو جائیں یعنی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ۔ ان دونوں کی آوازیں (باہمی تکرار میں) حضور اکرم ﷺ کے سامنے بلند ہو گئیں جبکہ بنی تمیم کا وفد حاضر ہوا تھا۔ (ان دونوں اصحاب میں سے) ایک تو اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ کو کہتے تھے جو بنی مجاشع میں تھے اور دوسرے ایک اور صاحب (یعنی حضرت قعقاع بن معبد رضی اللہ عنہ) کی بابت کہتے تھے (کہ اس وفد کا انہیں امیر بنائیے) اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم تو میرا اخلاف ہی کیا کرتے ہو۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جواب دیا نہیں نہیں آپ یہ خیال بھی نہ فرمائیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضرت ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس طرح حضور ﷺ سے نرم کلامی کرتے تھے کہ آپ کو دوبارہ پوچھنا پڑتا تھا۔ مسند بزاز میں ہے کہ آیت لاترفعوا...... کے نازل ہونے کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یارسول اللہ! خدا کی قسم اب تو میں آپ سے اس طرح باتیں کروں گا جس طرح کوئی سرگوشی کرتا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ان آیات کی شان نزول کے بارے میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی بحوالہ بالا حدیث بخاری نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "(یہاں) اللہ تعالیٰ کا ذکر حضور اکرم ﷺ کی عظمت کے اظہار کے لئے کیا گیا ہے اور اس بات کی طرف ایما کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول پر تقدم گویا اللہ تعالیٰ پر تقدم ہے کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک آپ کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ آپ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور آپ سے بے ادبی کرنی اللہ تعالیٰ سے بے ادبی کرنی ہے۔" (تفسیر مظہری)

ابن کثیر اس آیت کے نزول کے بعد بعض دیگر صحابہ کرام کے روح پرور واقعات بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں "امیر المومنین حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ (حضور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد) دو

شخصوں کی کچھ بلند آوازیں مسجد نبوی میں سن کر وہاں آئے اور ان سے فرمایا کہ تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کہاں ہو؟ پھر ان سے پوچھا تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا کہ طائف کے۔ آپ نے فرمایا اگر تم مدینے کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں پوری سزا دیتا۔ علمائے کرام نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر انور کے پاس بھی بلند آواز سے بولنا مکروہ ہے۔ جیسے آپ کی حیات (ظاہری) میں مکروہ تھا۔ اس لئے حضور ﷺ جس طرح اپنی (ظاہری) زندگی میں قابل عزت واحترام تھے اب دور ہمیشہ تک آپ اپنی قبر شریف میں بھی باعزت اور قابل احترام ہیں۔ پھر آپ کے سامنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے جس طرح عام لوگوں سے باتیں کرتے ہیں (اس طرح) باتیں کرنی منع فرمائیں بلکہ آپ سے تسکین ووقار، عزت وادب، حرمت وعظمت سے باتیں کرنی چاہئیں۔ جیسے اور جگہ (فرمان الٰہی ہے) اے مسلمانو! رسول کو اس طرح نہ پکارو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو (سورہ نور : ۶۳) پھر فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس بلند آوازی سے اس لئے روکا ہے کہ ایسا نہ ہو کسی وقت حضورؐ ناراض ہو جائیں اور آپ کی ناراضگی کی وجہ سے خدا ناراض ہو جائے اور تمہارے کل اعمال ضبط کرلے اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ چلے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مولانا سید نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ حاشیہ کنزالایمان میں لکھتے ہیں کہ اس آیت (سورہ نور : ۶۳) میں حضور ﷺ کا اجلال واکرام اور ادب واحترام تعلیم فرمایا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے ندا کرتے میں ادب کا پورا لحاظ رکھیں۔ جیسے آپس میں ایک دوسرے کو نام لیکر پکارتے ہیں اس طرح نہ پکارو بلکہ کلمات ادب وتعظیم وتوصیف وتکریم والقاب وعظمت کے ساتھ عرض کرو جو عرض کرنا ہے کہ ترک ادب سے نیکیوں کے برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔

سورۃ الحجرات کے محولہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ جل جلالہ کی بارگاہِ اقدس میں اس کے حبیب پاک شافع محشر، مالک کوثر ﷺ کی عظمت وجلالت اور مقام قرب کی تجلیوں سے ہماری چشم بصیرت خیرہ ہوتی ہے اور ہمارے قلوب لرز اٹھتے ہیں کہ جب ایسی مقدس ہستیاں جو حضور فخر موجودات ﷺ کی رفاقت سرمدی کے اعزاز سے بہرہ مند اور اس عالم رنگ وبو میں آپ کی نیابت کی سزاوار ہیں بارگاہِ رسالت میں ان کی صرف بلند آواز میں گفتگو پر اللہ تعالیٰ نے اس قدر اظہار ناپسندیدگی فرمایا کہ اس حوالے سے قرآن حکیم میں تمام مسلمانوں کو ادب رسالت کی خصوصی تلقین فرمائی اور آئندہ اس غیر محتاط رویے کی پاداش میں تمام اعمال ضائع ہو جانے کی وعید بیان فرمائی تو ہم جیسے بے علم وبے عمل اور خطاونسیان کے پیکر کس گنتی میں آتے ہیں یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی ستاری وغفاری کی جلوہ سامانی اور اس کے محبوب پاک کی شان رحمۃ للعالمینی کا اعجاز ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب سے اس کے عفو ودرگزر کی پناہ میں ہیں۔

نعت نگاری میں شانِ رسالت کے منافی الفاظ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ الفاظ کا صحیح استعمال ہی کسی شے کے حسن وقبح کی عکاسی کرتا ہے لہٰذا یہ بات لازمی ہے کہ حضور ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں عرض مدعا کیلئے ایسے الفاظ، کلمات اور محاورات استعمال کئے جانا چاہئیں جن سے حتی المقدور حضور ﷺ کے ادب واحترام، آپ کی عظمت شان کا اظہار ہوتا ہو ہمیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جب عام گفتگو میں حضور ﷺ کی تعظیم وتوقیر کا اظہار واجب ہے تو آپ کی توصیف وثنا تو ایک ایسا رفیع الشان موضوع ہے جو بہتر سے بہتر الفاظ اور اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین ہی کا متقاضی ہے۔ ذیل میں بعض شعرائے کرام کی نعتوں سے اخذ کردہ ایسے اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن میں ادب رسالت کے منافی الفاظ کا استعمال نمایاں ہے:

۱۔ آدمی کو لباس تمدن دیا اس نے باب جہالت میں تحریف کی

اس شعر کے مصرعہ ثانی کا انداز بہت رکیک ہے جس میں شاعر صاحب نے شاید اپنی لاعلمی کی بناء پر تحریف جیسے منفی اور مذموم رویے کو ذات رسالت مآب ﷺ سے منسوب کیا ہے حالانکہ تحریف ایک ایسا فعل ہے جو رزائل اخلاق میں شمار ہوتا ہے۔ تحریف ایک قرآنی اصطلاح بھی ہے جو علمائے یہود کے اس رویے کیلئے استعمال کی گئی ہے کہ وہ کلام الٰہی (توریت) کی آیات میں بیان کردہ بعض احکام اور حضور ﷺ کی صفات عالیہ کو بدل دیا کرتے تھے۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں "تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنی ومفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنی پہنا دینا جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیر وتبدل کرنے کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ (تفہیم القرآن) قرآن کریم میں سورۃ البقرہ کی ۷۵ ویں اور دیگر آیات میں تحریف کرنے کو حق پوشی اور بد دیانتی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس کی پاداش میں علمائے یہود پر وعید آئی ہے۔

اسی طرح معلم کتاب وحکمت صاحب ام الکتاب ﷺ کی شان میں یہ کہنا کہ اس نے باب جہالت میں تحریف کی آپ کی اہانت کے مترادف ہے۔ حضور ﷺ نے تو جہالت کا سدباب کر کے صریح گمراہی میں مبتلا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنا سنا کر اپنے نور باطن سے نفوس کا تزکیہ فرمایا اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم سے آراستہ فرمایا۔ (دیکھئے سورۃ آل عمران، آیت ۱۶۴) لہٰذا "باب جہالت میں تحریف" جیسی ترکیب کو موجودہ صورت میں لفظی اور معنوی ہر دو اعتبار سے ایک جاہلانہ اختراع ہی کہا جا سکتا ہے۔ البتہ شعر کے مصرعہ ثانی کو اس طرح پڑھا جائے تو کسی حد تک یہ سقم دور ہو سکتا ہے۔

اس نے باب جہالت کی تنسیخ کی

۲۔ عالم کون کا خود راج دلارا ہو کر اپنے خادم کو بھی پہلو میں بٹھانے والے

ہندی زبان میں راج دُلارا بادشاہ کے بیٹے یعنی شہزادہ یا ولی عہد کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں حضور سرورِ کونین ﷺ کو عالم موجودات کا شہزادہ کہا گیا ہے (نعوذ باللہ) یہود و نصاریٰ کے عقائد کی طرح خدائے لم یلد کی اولاد ہونے کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں حضور ﷺ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے آخری نبی، بندۂ خاص اور خلیفۂ اعظم ہیں چنانچہ تمام مخلوقات پر آپ کی اطاعت فرض ہے۔ انہی معنی میں آپ کو سرورِ کونین اور سلطان کائنات کہا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہر مسلمان کا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس لم یلد ولم یولد ہے البتہ بعض شعرائے کرام نئی تراکیب اختراع کرنے کے چکر میں "کیا تم کو کہوں اے رب کے کنور تم جانت ہو من کی بتیاں" یا "عالم کون کا خود راج دُلارا ہو کر" جیسے اسلامی تعلیمات کے منافی مصرعے کہہ جاتے ہیں۔ نعت گو شعرائے کرام کو اس رویے سے اجتناب لازم ہے۔

حضور ﷺ کی سلطانی اور اختیار رسالت کے حوالے سے جناب اعجاز رحمانی کا یہ شعر کتنا خوبصورت ہے۔

خالق نے بنایا جنہیں مختار دو عالم پھر کیوں نہ کہیں ہم انہیں سرکار دو عالم

۳۔ بنا تھا جو شب معراج عرش پر دولہا اُسی حسین سے مہماں کی یاد آتی ہے

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں حضور اکرم، نور مجسم کیلئے "حسین سے مہماں" کے الفاظ بیان کرنے سے شہ خوباں صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپائے مبارک کے حسن بے مثال کے استخفاف کا پہلو نمایاں ہوتا ہے کیونکہ یہاں لفظ "سے" حرف تشبیہ ہے جس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کسی حسین شخص کی مانند ہیں اور وجہ مماثلت مشبہ بہ (جس سے تشبیہ دی جائے)۔ از روئے حقیقت بہتر درجے کی ہوتی ہے۔ تفاسیر اور کتب احادیث کے مطالعے سے آپ کے حسن یکتا و بے مثال کے بارے میں خاطر خواہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے خصوصاً شمائل ترمذی، الوفا، خصائص کبریٰ اور مدارج نبوت میں آپ کے سراپائے مبارک کے حسن و جمال کے حوالے سے تفصیلی معلومات ملتی ہیں۔ اس حوالے سے درج ذیل شعر کتنا دل آویز ہے:

یہ کہتے ہیں سارے حسینان عالم نہیں دو جہاں میں مثال محمد ﷺ

(حضرت ستار وارثی)

یا

کوئی ثانی ہے نہ ہمتا ہے نہ ہمسر نہ مثیل پاک تشبیہ سے ہے حسن رسول اکرم

(وقار صدیقی)

۴۔ سرکارؐ کا ذکر جو کرتا ہوں اک کیف سا حاصل ہوتا ہے
اس ذکر میں لوگو! ساتھ میرے اللہ بھی شامل ہوتا ہے

اس شعر میں مصرعہ ثانی میں یہ شرعی سقم موجود ہے کہ حضور ﷺ کے ذکر میں شاعر کی شمولیت کی نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کی جانی تھی نہ کہ اللہ کی شمولیت شاعر کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور حقیقت تو یہ کہ اس قسم کے اشعار میں صداقت بیان کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ سورۂ احزاب کی ۵۶ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پاکؐ پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ صاحب ضیاء القرآن کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں فعل صلوٰۃ (درود) کے تین فاعل ہیں (۱) اللہ تعالیٰ (۲) فرشتے (۳) اہل اسلام۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کا یہ معنی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کی بھری محفل میں اپنے محبوب کریم ﷺ کی تعریف وثنا کرتا ہے (بخاری شریف) اور جب اس کی نسبت ملائکہ کی طرف ہو تو صلوٰۃ کا معنی دعا ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کے پیارے رسول کے درجات کی بلندی اور مقامات کی رفعت کیلئے دست بہ دُعا رہتے ہیں۔

اس آیت میں ان اللہ وملائکتہ جملہ اسمیہ ہے لیکن اس کی خبر (یصلون) جملہ فعلیہ ہے کہ یہاں دونوں جملے جمع کردیئے گئے ہیں۔ اس میں راز یہ ہے کہ جملہ اسمیہ استمرار ودوام پر دلالت کرتا ہے اور فعلیہ تجدد وحدوث کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہر دم ہر گھڑی اپنے نبی مکرم ﷺ پر رحمتیں نازل فرماتا ہے اور آپ کی شان بیان فرماتا ہے۔ اسی طرح اس کے فرشتے بھی آپ کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔

عراقی نے کیا خوب لکھا

ثنائے زلف و رخسار تو اے ماہؐ ملائک ورد صبح و شام کردند

اس آیت میں اہل اسلام کو بھی درود پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم نہ شان رسالت سے واقف ہیں اور نہ اس کا حق ادا کرسکتے ہیں اس لئے اعتراف عجز کرتے ہوئے ہم عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ (تو ہماری طرف سے) اپنے محبوب اور ان کی آل پر درود بھیج جو ان کی شایان شان ہے۔ بہر حال یہ تصور بالکل بے بنیاد ہے کہ جب کوئی بندہ حضور ﷺ کا ذکر مبارک کرتا ہے تو اللہ بھی اس ذکر میں اپنے بندے کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں صحیح بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص خلوص دل اور ادب واحترام کے ساتھ آپ کا ذکر کرتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی رضا وتائید حاصل ہوتی ہے اور اس پر رحمت باری تعالیٰ کا نزول ہوتا ہے۔ اسی طرح کچھ فرشتے محافل اوراد واذکار میں حاضر ہوتے ہیں اور حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں آپ کی امت کا انفرادی اور اجتماعی ہدیہ درود وسلام پیش کرتے ہیں اور آپؐ اپنے عشاق کا درود و

سلام اور ہدیہ نعت سماعت فرماتے ہیں۔ (ضیاء القرآن)

۵۔ جو دُعا دل سے مرے نکلی وہ پوری ہو گئی " مجھ سے عاصی کو بھی (تخلص) آپ خفا اس نے کیا

اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ شاعر صاحب کی تمام دعائیں شرف ایجاب کو پہنچیں اس طرح نعوذ باللہ حضور ﷺ نے شاعر کو "خفا" نہیں کیا۔ یہاں لفظ خفا آپ کی اطاعت در حمت اور آپ کی رضائے پاک کے منافی اور سوءِ ادب کے مترادف ہے۔ اس مصرعے میں ایسا لفظ استعمال کیا جانا چاہئے تھا کہ جس میں مصرعہ اولی کی نسبت سے شکران نعمت کے طور پر یہ معنی پیدا ہوتے کہ اس بندۂ عاصی کو بھی آپؐ نے اپنے فضل وکرم سے محروم نہ رہنے دیا۔ سورہ توبہ کی ۲۴ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے تمام عزیز و اقارب اور مال واولاد سے زیادہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت کرنی چاہئے۔ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ سوائے اپنی جان کے مجھے آپ دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہ سن کر آپؐ نے ارشاد فرمایا، تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کو اس کی جان سے بھی زیادہ محبوب نہ ہوں۔ یہ ارشاد مبارک سن کر حضرت فاروق اعظمؓ نے کہا اگر ایسا ہے تو قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق وصداقت کے ساتھ کتاب ہدایت دے کر مبعوث فرمایا، آپؐ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، اے عمر! اب تمہارا ایمان مکمل ہوا ہے۔ (کتاب الشفا)

کتاب وسنت کی روشنی میں حب رسول ﷺ کا تقاضا یہی ہے کہ آپ کا ہر اُمتی ہر حال میں آپؐ کی رضائے پاک کے حصول کیلئے آرزومند اور کوشاں رہے۔

قربان تجھ پہ حسرت و ارمان زندگی اے روح کائنات نگہبان زندگی

ہمیں درکار آقا کی رضا ہے پشیماں اب کرم کی التجا ہے

یہ ترے فقیر در کی شب و روز التجا ہے وہی میرا مدعا ہو، جو حضورؐ کی رضا ہے

۶۔ یہ قلب سلیم اس کا پڑھتا ہے کلمہ جس الیلے افعی نے اس کو ڈسا ہے

یہ شعر ایک قادر الکلام شاعر کی ایک طویل نعتیہ نظم سے اخذ کیا گیا ہے۔ شعر میں بیان کیا گیا ہے کہ شاعر کا قلب سلیم اُسی انوکھے یا خوب صورت ناگ کا کلمہ پڑھتا ہے جس نے اُسے ڈسا ہے۔ یہاں معاذاللہ آپؐ کی ذاتِ اقدس کیلئے ایک خوب صورت ناگ کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے اور آپ کے عشق مبارک کی تاثیر کو ڈسنے سے تعبیر کیا گیا ہے حالانکہ سانپ ایک موذی کیڑا ہے جس کی انسان دشمنی کی بناء پر

نماز کی نیت توڑ کر اسے مارنے کا حکم ہے۔ اسی طرح ڈسنا ایسا لفظ ہے جس کے کسی بھی صورت مثبت معنی نہیں نکلتے۔ محسنِ انسانیت ﷺ کیلئے ایک موذی اور انسان کے ازلی دشمن کیڑے کا استعارہ استعمال کرنے کی سنگینی کا اندازہ ہر شخص خود لگا سکتا ہے۔ اس روح فرسا عبارت پر مزید لکھنا ______

۷۔ طبیعت میں وہ قدرتی شرم جیسے کہ پردہ نشیں کوئی ناکتخدا ہے

کتب شمائل میں حضور ﷺ کے مزاج مبارک میں شرم و حیا کے نمایاں ہونے کا بیان بھی آتا ہے۔ مزاج اقدس میں شرم و حیا کا عنصر آپ کی مردانہ وجاہت اور کریم النفسی کے زیر اثر تھا۔ مندرجہ بالا شعر میں آپ کی طبع مبارک میں شرم و حیا کے عنصر کو موضوع بنایا گیا ہے لیکن اس بے احتیاطی کے ساتھ کہ شرم و حیا کے ضمن میں آپ کو پردے میں بیٹھی ہوئی کنواری لڑکی سے تشبیہہ دی گئی ہے جو آپؐ کے ادب و تعظیم اور جلالت شان کے پیش نظر بڑی روح فرسا جسارت ہے۔ واضح رہے کہ حضرت ابو سعید خدری کا یہ قول کتب احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ میں کسی پردہ نشین عورت سے بھی زیادہ حیا تھی۔ اس قول پر شارحین نے نکتہ چینی فرمائی ہے جیسے کہ مدارج نبوت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اس تشبیہہ کو آپؐ کے ادب و تعظیم کے حوالے سے پسندیدہ نہیں سمجھا۔

کسر شان مضمون آفرینی

آداب نعت میں یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل ہے کہ آپ کی توصیف میں ایسے مضامین نظم کیے جائیں جن سے آپ کی عظمت و احترام اور شان رفیع کا اظہار ہوتا ہو۔ اس ضمن میں قاضی عیاضؒ کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کی تعریف و توصیف میں ایسے مضامین بیان کرنا جو آ کے معروف و مشہور اوصاف کے منافی ہو یا خلافِ شان ہوں، کفر ہے۔ کیونکہ اس طرح واصف سے آپ کی تکذیب کا صدور اور آپ کے اوصاف مشہورہ کا انکار صادر ہوا۔ قاضی عیاضؒ نے امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کو غربت اور مفلسی پر شرم دلائی۔ یہ سن کر اس مفلوک الحال شخص نے کہا کہ تم مجھے غربت سے عار دلاتے ہو حالانکہ سید عالم ﷺ نے بھی بکریاں چرائی تھیں۔ قائل کے اس قول کے بارے میں امام مالک رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس غریب شخص نے حضور اکرم ﷺ کا ذکر بے موقعہ کیا لہٰذا یہ شخص قابل سزا ہے۔ ان آداب کی روشنی میں ایک بزرگ شاعر کی نعت کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ گر مصر کے بازار میں ہوتے شہ یثرب یوسفؑ کا کوئی مفت خریدار نہ ہوتا

اس شعر کے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ جس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو بظاہر غلام کی حیثیت سے مصر کے بازار میں فروخت کیلئے پیش کیا گیا تھا، اگر معاذاللہ سلطان مدینہ ﷺ بھی وہاں ہوتے تو ہر خریدار آپ کی جانب ہی دوڑتا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو کوئی مفت بھی قبول نہ کرتا۔ اس شعر میں

حضور اکرم ﷺ کی اہانت کا جو پہلو مضمر ہے اسے اہل علم خوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ "یوسف کا کوئی مفت خریدار نہ ہوتا" کہہ کر اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں جو ہتک آمیز مضمون آفرینی کی گئی ہے وہ بھی لائق گرفت ہے۔ اس کے علاوہ شریعت اسلامیہ میں انبیاء علیہم السلام کے مابین تقابل جائز نہیں۔ کتب احادیث میں اس پر وعید آئی ہے۔ البتہ اس شعر کو اگر یوں پڑھا جائے تو یہ شرعی سقم دور ہو سکتا ہے۔

گر مصر کے بازار میں ہوتے شہ طیبہ　　　　یوسفؑ کا کوئی "اور" خریدار نہ ہوتا

اس طرح مصر کے بازار میں حضور اکرم ﷺ کے بطور خریدار ہونے کی بھی صراحت ہو جاتی ہے اور حضرت یوسف علیہ السلام کی قدر و منزلت کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔

۲۔ ہمیں کیوں یا نبیؐ کہنے سے آخر منع کرتے ہو　　　　نبیؐ سے تم کہو وہ چھوڑ دیں چارہ گری اپنی

اس شعر کا مصرعہ ثانی اصلاح طلب ہے۔ جب ایک عام مسلمان کیلئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کو ایک اچھے کام کے ترک کرنے کا مشورہ دے تو خواہ طنزاً ہی سہی کسی صاحب ایمان کا یہ شیوہ نہیں کہ وہ دوسرے مسلمانوں سے یہ کہے کہ تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہو کہ آپؐ اپنی امت کی چارہ گری فرمانا چھوڑ دیجئے۔ ایسا کہنا بارگاہ رسالت میں کتنی بڑی بے ادبی اور قرآن و سنت کے احکام کی کس قدر نافرمانی ہے۔ جناب رحمت عالم ﷺ انیس بیکساں اور چارہ بیچارگاں ہیں۔ آپ کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ آپ کا ہر قول مبارک اور فعل مبارک احکام خداوندی اور اللہ رب العزت کی منشا کے مطابق ہے۔

۳۔ لکھوں جو نعت تو ہوتا ہے ہر گھڑی محسوس　　　　میں حرف ہوں تو میری لے کا معجزہ تو ہے

یہ مضمون آفرینی بھی حضور اکرم ﷺ کی شان اقدس کے منافی ہے۔ اس شعر کے مصرعہ ثانی میں شاعر نے حضور اکرم ﷺ کو اپنی لے کے معجزے سے تعبیر کیا ہے جبکہ حضور اکرم ﷺ کو کسی اولوالعزم پیغمبر کا بھی معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہیں۔

۴۔ غور سے دیکھا جب دل کے آئینے میں خود حقیقت بنی حسن کا آئینہ
ساری دنیا نظر آئی اک سانس میں جلوۂ ساغر جم ہے نام آپ کا

اس شعر میں موجود کئی ابہامات سے قطع نظر مصرعہ ثانی میں حضور اکرم ﷺ کے نام اقدس کو فارس کے ایک کافر بادشاہ کے اس روایتی پیالے کا جلوہ قرار دیا گیا ہے (جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس پیالے میں جمشید طلسماتی طور پر تمام حالات کا عکس دیکھ لیتا تھا) اس طرح اللہ تعالیٰ کے حبیب پاک کے نام

اقدس کی بے حرمتی سرزد ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا نام اقدس "محمد" (ﷺ) اسم الٰہی سے مشتق ہے جیساکہ مفسرین کرام اور علمائے لغت نے صراحت فرمائی ہے۔ اسی طرح حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ نے ان کا نام ان کے اعزاز کیلئے اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ صاحب عرش محمود ہے اور یہ محمد (ﷺ) ہیں۔

مولانا جامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں

اگر نامِ محمدؐ را نیا وردے شفیع آدم
نہ آدم یافتی تو بہ نو نوحؑ از غرق نجینا
نہ ایوب از بلاراحت نہ یوسف حشمت و شوکت
نہ عیسیٰ آں مسیحا دم، نہ موسیٰ آں یدبیضا

۵۔ جا زندگی مدینے سے جھونکے ہوا کے لا شاید حضورؐ ہم سے خفا ہیں منا کے لا

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں شاعر صاحب کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ اے زندگی مجھے مدینہ منورہ لے چل تاکہ میں بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر رحم و کرم کی التجا کر سکوں اور حضور اکرم ﷺ اپنے عفو و کرم سے مجھے معاف فرمادیں۔ اس کے برعکس شاعر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ حضور سرورِ کونین ﷺ کو منا کر میرے پاس لا۔ یہ بات دنیاوی حکمرانوں کے بھی ادب کے خلاف ہے کہ کوئی مجرم حاکم وقت کے پاس جاکر معافی کا خواستگار ہونے کے بجائے یہ کہے کہ حاکم وقت کو منا کر میرے پاس لاؤ۔ تو سرورِ دو عالم ﷺ کیلئے ایسی بات کہنا کتنی بڑی بے ادبی اور گستاخی ہے۔

محبت کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ بعض اوقات یہ عاشق کو بیباک بنا دیتی ہے لیکن یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ ذاتِ رسالتمآب ﷺ کی محبت کی اساس ادب پر ہے لہٰذا نعت نگاری میں عشق صادق کے زیر اثر جناب ممدوح کردگار ﷺ کے ادب و تعظیم کا بدرجہ اتم لحاظ رکھنا لازم ہے۔

وہ بارگہ ناز ہے دربار محمد ﷺ مشتاق نگاہی بھی جہاں سوءِ ادب ہے

(حضرت ستار وارثیؒ)

ذاتِ اقدس سے مماثلت تلاش کرنا

میں اپنی خاک سے گلشن کھلاؤں تیری طرح تری طرح میں تمنائے رنگ و بو نہ کروں
وہ میرے خون کا پیاسا ہزار ہو لیکن تری مثال میں بد خواہیِ عدو نہ کروں

میں پھیل جاؤں تری طرح ان فضاؤں میں　　یوں مجھ کو رنگ و نور کی صورت اچھال دے

میں کروں تیری طرح تسخیر یہ ارض و سما　　یوں شب معراج کے سانچے میں خود کو ڈھال لوں

محولہ بالا اشعار میں شاعر نے ذات رسالتمآب ﷺ سے اپنی مماثلت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جو فقہی اعتبار سے لائق سرزنش ہے۔ قاضی عیاض علیہ الرحمہ نے کتاب الشفا میں حضرت عمر بن عبدالعزیز (جنہیں مجازاً پانچواں خلیفہ راشد بھی کہا جاتا ہے) کا ایک واقعہ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے منشی سے ایک ایسا جملہ ادا ہو گیا جس میں حضور اکرم ﷺ سے مماثلت کا پہلو پایا جاتا تھا۔ چنانچہ امیر المومنین نے فرمایا (گستاخ) تو سرکارِ دوعالم کی ذات اقدس سے مماثلت تلاش کرتا ہے چنانچہ اس بے ادبی کی سرزنش میں آپ نے اسے برخواست کر دیا اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے شخص کے لائق تعزیر ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔

بارگاہِ رسالتؐ میں استفہامیہ خطاب کی جسارت

نعت نگاری میں تخاطب کا کلمہ حضور اکرم ﷺ کی تعظیم و تقدیس کیلئے ہوتا ہے اور اسے ایسے ہی موقع پر استعمال کرنا چاہئے۔ اس کے برعکس درج ذیل اشعار میں غیر مودب استفہامیہ خطاب کی مثال ہیں:

باب رحمت مری سرکار کھلے گا کہ نہیں　　حق کی میزان پہ انصاف ملے گا کہ نہیں

داغ مظلومیٔ انسان دُھلے گا کہ نہیں　　تا بہ کے اپنے مقدر میں یہ خوں پیرہنی

یہ کیا ستم ہے کہ بادہ کشانِ روز الست　　بہت دنوں سے پریشاں ہیں یا رسول اللہ

غلام زادوں کی سب خطائیں معاف کیجئے رسول رحمت
برہنہ سر ہم کھڑے ہیں کب سے حضورؐ! کب تک سزا ملے گی

ان اشعار میں شرعی حیثیت کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

صلح حدیبیہ بظاہر جن سخت شرائط کے تحت عمل میں آئی تھی ان سے بعض صحابہ کرام کو اضطراب تھا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا ملال ضبط نہ کر سکے۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حضرت عمرؓ آئے اور کہا کیا ہم حق پر نہیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا ہاں ہم حق پر ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا تو ہم دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں؟ آپؐ نے فرمایا "میں خدا کا پیغمبر ہوں اور خدا کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتا، خدا میری مدد کرے گا۔" حضرت عمرؓ نے کہا، کیا آپؐ

نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم لوگ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپؐ نے فرمایا "لیکن یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے" حضرت عمرؓ اٹھ کر حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور وہی گفتگو کی۔ حضرت ابو بکرؓ نے کہا وہ رسول خدا ہیں، جو کچھ کرتے ہیں خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ (بخاری) حضرت عمرؓ کو اپنی ان گستاخانہ معروضات کا جو بے اختیاری میں ان سے سرزد ہوئیں، تمام عمر سخت رنج رہا اور اس کے کفارے کیلئے انہوں نے نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، خیرات کی اور غلام آزاد کیے۔ بخاری میں اگرچہ ان اعمال کا ذکر اجمالاً ہے لیکن ابن اسحاق نے تفصیل سے یہ باتیں گنائی ہیں" (سیرت النبی، جلد اول)

اس واقعے کی روشنی میں محولہ بالا اشعار کا جائزہ لیا جائے تو کیا یہ بارگاہِ رسالت میں گستاخی کے مترادف نہیں۔ جب حضرت عمرؓ جیسے خلیفہ راشد ایسے سوالات کے کفارے کیلئے اتنی مساعی جمیلہ فرماتے ہیں تو کیا ان نعت گو شعراء کو اپنے ان گستاخانہ اشعار پر اظہار ندامت بھی نہیں کرنا چاہیے تھا؟ اور وہ یہ سب کچھ ادب رسالت سے لاعلم رہتے ہوئے کہہ گئے ہیں تو ہمارے معاصر نعت گو شعرائے کرام کو اس بات پر توجہ دینی چاہیے کہ نعت کیلئے نہ ہی صرف قادر الکلامی کافی ہے اور نہ ہی صرف علم بلکہ اس صنف لطیف میں ثقاہت علمی اور محاسن فن کے ساتھ نعت گو کے سچے جذبہ اطاعت اور حب رسول سے دل کی سرشاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

استفہامیہ خطاب کے ذیل میں اوپر دیئے ہوئے اشعار کے حوالے سے یہ بات بھی باعث اطمینان ہوگی کہ قرآن کریم کی سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۰۱ اور صحیحین کی احادیث میں حضور اکرم ﷺ کی بارگاہِ اقدس میں کثرت سوال کی ممانعت بیان ہوئی ہے۔

بارگاہِ اقدس میں خود ستائشی کی جسارت

خود ستائشی کا شمار اخلاق ذمیمہ میں ہوتا ہے۔ یوں تو اردو نعت میں شاعرانہ تعلی کی سیکڑوں مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں لیکن ذیل میں دیئے گئے شعر میں بارگاہِ افصح العرب میں خود ستائشی کی جس طرح جسارت کی گئی ہے وہ نہ صرف آداب نعت کے منافی ہے بلکہ اپنے منہ میاں مٹھو کے مصداق شاعر کی پست خیالی اور نعتیہ ادب کے مطالعے سے شاعر کی بے خبری پر دلیل ہے:

۱۔ مری نوائیں چمکتی ہیں بن کے قندیلیں — عجیب شان کا طرز کلام لایا ہوں

ذرا سوچئے کہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں شاعر کا اپنی نواؤں کے قندیل بن کے چمکنے کی بات کرنے اور اپنے طرز کلا کو عجیب شان کا طرز کلام کہہ کر شاعر اپنی زبان سے اپنی ہی تعریف کر رہا ہے۔ اس خود ستائشی کو کس زاویہ نگاہ سے نعت سرور کائنات سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کہاں ہے تیرگی خاکداں کہ میں امشب — فلک سے تیری تجلی اٹھا کے لایا ہوں

شعر کے دوسرے مصرعے میں شاعر صاحب بارگاہِ رسالت میں فلک سے آپ کی تجلی اٹھا کر لانے کا دعویٰ فرما رہے ہیں۔ یہ کذب بیانی کی بد ترین مثال ہے اور زبان و بیان کے حوالے سے بھی یہ سقم موجود ہے کہ تجلی ایسی لطیف شے ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے اس میں وہ ثقل کہاں جو اسے اٹھا کر لایا جا سکے۔

بارگاہِ رسالت میں جملہ تاکید کی جسارت

۱۔ اے شہنشاہ کونین جود و سخا میری جانب ذرا غور سے دیکھئے
ظرف دامان ہستی کے پیش نظر مجھ کو کم ہی نہیں کم سے کم چاہئے

شاعر صاحب اس شعر میں شہنشاہ کونین (ﷺ) سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ میری جانب ذرا غور سے دیکھئے۔ یہ جملہ تاکید ہے اور اس وقت کہا جاتا ہے جب کسی کم رتبہ شخص سے لاپرواہی سرزد ہونے کا امکان ہو۔ لہٰذا اس میں حضور اکرم ﷺ کی اہانت کا پہلو مضمر ہے۔

۲۔ کہیں ایسا نہ ہو شاعر کو اپنے بھول ہی جاؤ
مرے مولا ذرا تم دھیان رکھنا روز محشر کا

اس سے ماقبل شعر طرح "اس شعر میں "ذرا تم دھیان رکھنا" جملہ تاکید ہے۔ جو عموماً اس شخص سے کہا جاتا ہے جس سے بھول چوک اور غفلت و لاپرواہی یا سہو و نسیان سرزد ہونے کا احتمال ہو۔ لہٰذا اس میں بھی اہانت کا پہلو موجود ہے۔

نعت نگاروں کو لازم ہے کہ وہ تعظیم و تکریم نبوی کو ہر آن مد نظر رکھیں چونکہ ان کی حیثیت عشق رسول کے مبلغ کی بھی ہے لہٰذا وہ اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کریں۔ نعتیہ اشعار میں ایسے الفاظ، کلمات اور محاورات استعمال کریں جو مکارم اخلاق سے مزین اور انسانی کمزوریوں سے مبرا ہوں۔ نصوص صریحہ سے ثابت ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی ذات اقدس نہ صرف انسان کی تمام فطری کمزوریوں سے عمداً اور سہواً دونوں حالتوں میں معصوم و محفوظ تھی بلکہ اپنے امتیوں کے قلوب کا تزکیہ فرما کر تمام برائیوں سے پاک کرنے والے ہیں۔ (دیکھئے سورہ آل عمران: ۱۶۴) روز محشر شفاعت کے حوالے سے حضرت سواد بن قارب کا یہ شعر کتنا مودب اور خوب صورت ہے:

ترجمہ: (یارسول اللہ!) اس روز سواد بن قارب کی شفاعت فرمائیے جبکہ حضور ﷺ کے بغیر کسی کی شفاعت کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔

عشق و محبت اور ایمان و یقین سے لبریز یہ اشعار سن کر حضور ﷺ ہنس دیئے یہاں تک کہ آپ کے دندان مبارک ظاہر ہو گئے اور فرمایا اے سواد! تو دونوں جہاں میں کامیاب ہو گیا۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

اسی طرح مولانا جامی علیہ الرحمہ نے اس مضمون کو کس خوبصورتی سے ادا فرمایا ہے۔

چو بازوئے شفاعت را کشائی بر گنہ گاراں

مکن محروم جامی را دراں آں یا رسول اللہ ﷺ

بارگاہِ اقدس میں صیغہ امر کے مترادف خطاب

۱۔ اے خواجہ کیہاں مرے ہاتھوں کی طرف دیکھ　　بیداریٔ ملت کی دعا مانگ رہا ہوں

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ "مرے ہاتھوں کی طرف دیکھ" کہنا کلمہ امر کے مترادف ہے، جو خلاف ادب ہے۔

۲۔ عجیب مشکل میں کارواں ہے نہ کوئی جادہ نہ پاسباں ہے

بشکل رہبر چھپے ہیں رہزن اُٹھو ذرا انتقام لے لو

اس شعر کے مصرعہ ثانی میں دو امر یہ کلمات ہیں یعنی آپ کی خدمت اقدس میں یہ کہنا کہ "اُٹھو" اور دوسرا کلمہ "ذرا انتقام لے لو" لہٰذا یہ شعر بھی آپ کی کسر شان اظہار کی ایک مثال ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بات محل نظر ہے کہ شعر میں کوئی ایسی بات بیان نہیں کی گئی ہے جو انتقام کی متقاضی ہو یعنی اگر کارواں مشکل میں ہے، کوئی جادہ و پاسباں نہیں اور رہبر کی شکل میں رہزن چھپے ہوئے ہیں تو یہ استغاثہ کیا جانا چاہئے کہ یا رسول اللہ! اس مشکل صورتحال میں میری مدد فرمائیے اور رہبران وقت کے شر و فتنے سے مجھے اپنی پناہ عطا فرمائیے وغیرہ۔

رحمت عالم ﷺ کے بارے میں بے التفاتی کا گمان

میری تاریک راتیں جگمگا دو　　کبھی سوئے غریباں بھی نظر ہو

کبھی تو رحم آ جائے میری آشفتہ حالی پر　　کبھی تو ہو گزر سوئے غریباں یا رسول اللہ

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ (اے محبوب) ہم نے تمہیں سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (سورۃ الانبیاء: ۱۰۷) رحمت اپنے معنی میں رقت اور تعطف (یعنی احسان و مہربانی) کے مجموعے کا نام ہے۔ امام راغب اصفہانی تشریح فرماتے ہیں کہ رحمت اس رقت کو کہتے ہیں جو اس شخص پر احسان کرنے کا تقاضا کرے جس پر رحمت کی جا رہی ہے۔ پھر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت میں رقت نہیں (کیونکہ وہ اس سے پاک ہے) بلکہ صرف تعطف اور احسان ہے۔ (المفردات) لیکن اللہ تعالیٰ نے مخلوق پر احسان فرماتے ہوئے اپنے محبوب کو رحمت کے دونوں مفہوموں سے نوازا ہے یعنی آپ کو ہر دردمند کے دکھ کا احساس بھی ہے اور قاسم نعمت کے منصب پر فائز ہونے کے سبب اللہ تعالیٰ کی عطا سے آپ ہر دکھ کا مداوا بھی فرماتے ہیں۔ آپ انیس الغریبین ہیں اور مسکینوں سے اس قدر محبت فرماتے ہیں کہ آپ دُعا فرماتے تھے کہ

پروردگار قیامت کے روز مجھے مسکینوں میں اُٹھانا۔ ان حقائق کی روشنی میں محولہ بالا اشعار کا جائزہ لیا جائے تو "کبھی سوئے غریباں بھی نظر ہو" سے یہ تاثر اُبھرتا ہے کہ آپ امیروں ہی پر توجہ فرماتے ہیں لہٰذا یہ التجا کی جا رہی ہے کہ "کبھی" غریبوں کی جانب "بھی" نظر کرم فرمایئے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں بھی کے ساتھ تو کا اضافہ کر کے آپ کی شان غریب پروری کی نفی کے معنی پیدا ہو گئے ہیں اور یہ فریاد کی جارہی ہے کہ یارسول اللہ! آپ کبھی تو غریبوں کی جانب گزر فرمایئے۔ یہ انداز بیان آپ کے اسمائے مبارک رحمت للعالمین، حمی، حریص علیکم اور رؤف الرحیم کی نفی کے مترادف ہے۔ آپ کی شان بندہ نوازی، یقین کرم اور ادب و تعظیم کے حوالے سے یہ شعر کتنا خوب صورت ہے

سخی کے در پر سوال کرنا خلافِ حدِ ادب ہے آقاؑ
تجھے خبر ہے تجھے پتا ہے جو حال تیرے سعیدؔ کا ہے

(ڈاکٹر سعید وارثی)

نعت میں کفران نعمت

۱۔ ہر تقرب مجھے سرکارؐ دیئے جاتے ہیں — کیوں پشیماں پہ پشیماں کئے جاتے ہیں

اس شعر کے مصرعہ اولیٰ میں بارگاہِ رسالت میں شاعر محترم نے دولت تقرب پانے کا تذکرہ فرمایا ہے جو شکرانِ نعمت کا محل ہے لیکن اس نعمت عظمیٰ پر سجدہ شکر بجالانے کے بجائے شاعر صاحب مصرعہ ثانی میں حضور اکرم ﷺ کے اس کرم خاص پر کہتے ہیں کہ سرکار مجھے کیوں بار بار پشیمان کئے جاتے ہیں۔ یہ صورتحال اس وقت پیش آتی ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا احسان مند ہونا نہ چاہتا ہو اور اس پر بار بار احسان کیا جائے تو اس کو بارِ احسان کے سبب پشیمانی ہوتی ہے لیکن جس ذات اقدس کو اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان عظیم یعنی سراپا احسان قرار دیا ہو، اس محسن انسانیت کے احسانات سے روگردانی اللہ تعالیٰ کی ناشکری اور کفرانِ نعمت ہے اور رسول اکرم ﷺ کی عطاؤں سے گریزاں ہونا آپ کی اطاعت کے منافی ہے۔ اسی طرح یہ شعر بھی ملاحظہ فرمایئے۔

۲۔ غلاموں کو غلامی کا شرف کافی بہت کافی — طبیعت پر گراں سا ہو کرم ایسا بھی ہوتا ہے

اس شعر میں بھی کفرانِ نعمت پایا جاتا ہے پھر یہ کہ غلامی صرف شرف کی حد تک قبول نہیں کی جاتی بلکہ آقا کی ہر بات کو بہ صمیم قلب ماننا اور اس کی رضا کا طالب ہونا غلامی کے تقاضے ہیں۔ یہاں تو کرم کی بات ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے اگر کسی مسلمان پر حضور اکرم ﷺ کا کوئی بھی حکم، کوئی بھی قول، کوئی بھی فعل مبارک گراں گزرے تو یہ نفاق کی علامت ہے لہٰذا شعر میں غلامی کے شرف کا اعتراف کرنے کے بعد طبیعت پر آقا کے کرم کا گراں ہونا ایک مہمل عبارت ہے۔

۳۔ میرا وجدان مجھے روز یہ دیتا ہے خبر روبرو ساقی کوثر کے بھی پیاسا ہوا

اس شعر میں جناب شافع محشر، ساقی کوثر ﷺ کے سامنے بھی پیاسا رہنے کی بات کو معنی کے اعتبار سے وجدان کی خبر کے بجائے القائے شیطانی سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر خدانخواستہ واقعی کسی شخص کی پیاس اتنی شدید ہو جیسے نعوذباللہ جناب ساقی کوثر ﷺ کی موجودگی بھی نہ بجھا سکے تو آخر اس پیاس کی شدت کا سبب سوائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کی ناراضگی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں شفیع روزِ محشر کی خدمت اقدس میں باریابی کے باوجود پیاسا رہنے کی بات کفرانِ نعمت ہی کی ایک صورت ہے۔

نعت میں کتاب وسنت کے منافی مضامین

نعت نگاری کتاب وسنت کی تعلیمات اور محبوب رب العالمین کی ذات اقدس، آپ کے کمالات وفضائل اور آپ کے ادب وتعظیم کے تقاضوں سے ضروری آگاہی کی متقاضی ہے جس کے بغیر بعض نعت گو شعرائے کرام سے ایسی معنوی لغزشیں سرزد ہو جاتی ہیں جو نعت گوئی کے مقاصد کے خلاف ہوتی ہیں جس کی کچھ مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ حضور پاک شاہی کو مٹانے کے لئے آئے ملے اذن تخاطب تو کہوں میں کس طرح شاہا

قرآن وحدیث میں حضور اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تکمیل، کتاب وحکمت کی تعلیم، لوگوں کو جہالت وگمراہی کے اندھیروں سے نکال کر علم وہدایت کے منور راستے پر گامزن کرنا اور ان نفوس کا تزکیہ کرنا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس شاعر صاحب یہ تصور پیش فرما رہے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اس عالم رنگ وبو میں بادشاہت کو مٹانے کیلئے تشریف لائے اور پھر خود ہی فرما رہے ہیں کہ اگر مجھے اجازت ملے تو میں یہ پوچھوں کہ اے بادشاہ؟ آپ کس طرح شاہی کو مٹائیں گے۔ لہٰذا یہ شعر مہمل اور کتاب وسنت کی تعلیمات کے منافی ہے۔

۲۔ حق و باطل میں گوارا نہ ہوا سمجھوتہ کفر و اسلام کو آپس میں لڑانے والے

معنوی اعتبار سے یہ شعر بھی مہمل ہے۔ اللہ تعالیٰ انبیائے کرام کو حق وباطل میں سمجھوتے کیلئے نہیں بلکہ باطل کو مٹا کر حق کا بول بالا کرنے کیلئے مبعوث فرماتا ہے۔ اسی طرح مصرعہ ثانی میں "آپس میں لڑانے والے" کی ترکیب بھی بے محل ہے اور یہ شعر قرآنی تعلیمات سے لاعلمی کا ترجمان ہے۔

۳۔ قصاص غیر بھی خود اپنی ذات سے لیتے عبور کر گئے حد عدل کی، مرے آقا

اس شعر کا پہلا مصرعہ محض قیاس آرائی ہے۔ دوسرے مصرعے میں اہانت رسول کا پہلو مضمر ہے کیونکہ اسلام کا منشا ہر کام میں میانہ روی اور اعتدال ہے جو چیز حد سے گزر جاتی ہے اس میں خرابی آجاتی ہے۔ عدل کا شمار مکارم اخلاق میں ہوتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے مکارم اخلاق کو حد کمال پر پہنچایا ہے جس

طرح سورج کا نصف النہار تک پہنچنا اس کے سفر کا نکتہ عروج ہوتا ہے جس سے گزر کر زوال آفتاب شروع ہو جاتا ہے اسی طرح مکارم اخلاق میں بھی تجاوز کرنے سے انسانی حقوق پامال ہونے کا امکان ہوتا ہے لہٰذا اسوۂ حسنہ سے اُمت مسلمہ کو میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ بہر حال یہ شعر بھی شریعت اسلامیہ سے شاعر محترم کی لاعلمی کا غماز ہے۔

نعت نگاری میں محاورات کا غیر محتاط استعمال

اُردو نعت میں بعض شعرائے کرام بے محل اور غیر محتاط انداز میں محاورات استعمال کرتے ہیں جس سے نعت کا تقدس مجروح ہوتا ہے مثلاً

۱۔ قول الطائع لی سن سن کر ان کی رحمت کی ہوا باندھتے ہیں

اس شعر میں "ہوا باندھتے ہیں" کا محاورہ بے محل استعمال کیا گیا ہے۔ ہوا باندھنے کا مطلب ہے جھوٹ موٹ کسی کی عزت قائم کرنا لہٰذا اس شعر میں اہانت رسول کا عنصر شامل ہو گیا ہے۔

۲۔ تری حدیث ترے روبرو سناؤں تجھے یہ آرزو ہے کبھی آئینہ دکھاؤں تجھے

اس شعر میں آئینہ دکھانے کا محاورہ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی ہیں عیب و ہنر ظاہر کرنا۔ اس محاورے کا استعمال منفی انداز میں زیادہ کیا جاتا ہے اور اکثر منفی معنی ہی لئے جاتے ہیں لہٰذا یہ شعر ادب رسالت کے منافی ہے۔

جمال مصطفویؐ کے تقدس کے منافی اظہار

۱۔ جمی ہے چہرۂ پُرنور پر مری نظر (تخلص) ہے کلک دل مقرر مدحت سلطان خوباں پر

اس شعر میں رسول اکرم ﷺ کے چہرہ اقدس کو شاعر نے نظر جما کر دیکھنے کی بات بیان کی ہے جو خلاف حقیقت ہے۔ آپ کے رُعب حسن سے کسی کو آپ سے نظر ملا کر بات کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ اسی طرح یہ شعر بھی دیکھئے۔

۲۔ جب بھی دیکھا ترا رُخ روشن لوٹ کر آسکی نہ اپنی نگاہ

اس شعر میں بھی چہرہ اقدس پر نظر جم جانے کی بات کی گئی ہے جو خلاف ادب اور خلاف حقیقت ہے۔ اگر شعر کے پہلے مصرے کو اس طرح پڑھا جائے تو حقیقت پر مبنی مضمون آفرینی ہوگی

جب بھی دیکھا ہے سبز گنبد کو

اس مضمون کو جناب بشیر حسین ناظم نے کتنی احتیاط سے بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

بن جاتا ہے دل مہبط انوار الٰہی جم جاتی ہیں جب گنبد خضریٰ پہ نگاہیں

۳۔ شمع کو پوچھتا پھرتا ہے کہیں پروانہ   آپ کے جلوے تو خود جان لے جاتے ہیں

اس شعر کا دوسرا مصرعہ خلافِ ادب اور غلط بیانی پر مبنی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے جلوے حیات افزا اور عاشقوں کے مضطرب دلوں کی راحت ہیں اور شاعر صاحب جلوہ مبارک کو جاں لیوا بیان کر رہے ہیں۔

عشق رسول کے فیضان سے بے خبری

عشق رسول ؐ ایک ایسا عظیم عطیہ الٰہی ہے جو دو عالم کے دُکھوں کا مداوا ہے۔ اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہوئے ایک شاعر محترم کا انداز بیان ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ مرا ہر نفس ہے عذاب جاں، ترا عشق ایسا وبال ہے
کرم اے شہ عرب و عجم میری زندگی کا سوال ہے

اس شعر میں حضور اکرم ﷺ کے عشق حیات افزا کو العیاذ باللہ ایسا وبال بیان کیا گیا ہے۔ جس سے شاعر کا ہر سانس وبال جان بنا ہوا ہے۔ یہ عشق رسول کی اہانت کے مترادف ہے۔

۲۔ اب ان کی محبت ہمیں جینے نہیں دیتی   مرنے کا تقاضا ہے مسیحا کی طرف سے

حضور اکرم ﷺ کی محبت ایسا جاں بخش انعام الٰہی ہے جو اس دنیائے فانی سے کوچ کر جانے کے بعد بھی محبِ صادق کو مرنے نہیں دیتی۔ لہٰذا مصرعہ اولیٰ خلافِ حقیقت ہے اور مصرعہ ثانی میں لفظ "تقاضا" خلاف ادب ہے۔ اس کے برعکس جو خوش نصیب فیضان عشق رسالتمآب ﷺ کے راز آشنا ہیں ان کی تو آرزو یہی ہوتی ہے۔

عشق کا گھاؤ کسی طور نہ بھرنے پائے   اے مسیحا! تو مرے زخم کو گہرائی دے
(حضرت ستار وارثی)

خُلقِ عظیم کی اہانت کے مترادف اظہار

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وانك لعلى خلق عظيم (القلم: ۴) یعنی (اے حبیب!) بے شک آپ صاحب خُلق عظیم (عظیم الشان اخلاق کریمانہ کے مالک ہیں) تفاسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ذات ان تمام کمالات کی جامع ہے جو گذشتہ انبیاء و رسل علیہم السلام میں متفرق طور پر پائے جاتے تھے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ حسن خُلق اللہ تعالیٰ کا خُلق عظیم ہے (طبرانی) یعنی حسن خُلق صفات باری تعالیٰ کا عکس یا ظل ہے۔ اس بارے میں بہ کثرت احادیث مشہور و معروف ہیں جن کی روشنی میں درج ذیل اشعار کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ جس کے صید و شکار سر کش ہیں   دام خُلقِ نبی سا جال کہاں

۲۔ حسن اخلاق شہ کونین نے لوٹا جہاں   فاتح اقلیم دل ہے نرمی گفتار دوست

پہلے شعر کے مصرعہ ثانی میں دام خلق نبی کی ترکیب اور "جال" کے لفظ سے اخلاص عمل کی نفی ہوتی ہے۔ دام اور جال ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں جن سے فریب اور دھوکہ دہی کے معنی بھی پیدا ہوتی ہیں لہٰذا یہ شعر حضور اکرم ﷺ کی شان خلق عظیم کے منافی ہے اور نعت نگاری کے مطلوبہ معیار سے فروتر ہے۔

اسی طرح دوسرے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں کہا گیا ہے کہ سردارِ کونین ﷺ کے حسن اخلاق نے جہاں کو لوٹ لیا جبکہ لوٹنے کے معنی ہیں کسی کا مال زبردستی چھین لینا، غارتگری کرنا وغیرہ اور کنایہ کے طور پر یہ لفظ کسی کو عاشق کر لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ قرآن کریم میں حضور اکرم ﷺ کے لئے ایسے لفظ استعمال کرنے کی ممانعت بیان کی گئی ہے جو ذو معنی ہوں اور اس میں مدح و ذم دونوں کے پہلو نکلتے ہوں لہٰذا یہ شعر آپؐ کے حسن اخلاق کے حوالے سے کسر شان ہے۔

نعت میں ناشائستہ اندازِ بیان

نعت گو حضرات کیلئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ وہ نعت گوئی کی سعادت حاصل کرنے سے پہلے اس امر پر پوری طرح غور و فکر کر لیا کریں کہ کون سی باتیں اور موضوعات ایسے ہیں جن کی نسبت آقائے دو جہاں ﷺ کے ساتھ جائز ہے اور کون سی باتیں ایسی ہیں جو ذات ممدوح خدا (ﷺ) کی توصیف یا نعتیہ شاعری میں بیان کرنا جائز نہیں۔ ذیل میں ان امور پر غور و فکر میں تساہل یا لاپرواہی کے ترجمان بعض اشعار ہدیہ قارئین ہیں:

۱۔ کون دیتا ہے کسی کو کوئی محبوب اپنا   جانے کس طرح کیا ہے یہ گوارا حق نے

اس شعر میں کسی کو اپنا محبوب دینے کا عامیانہ تصور پایا جاتا ہے جو نعت محبوب خدا (ﷺ) کے حوالے سے جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو اپنا محبوب دیا نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق کی ہدایت و رہنمائی کے لئے ان کی جانب مبعوث فرمایا ہے۔ ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت اور ان کی محبت کو اپنی محبت قرار دیکر ان کے ادب و تعظیم کو فرض کیا ہے۔

۲۔ ہو مہر درخشاں کی نگاہوں کو چکا چوند   دیکھے جو آئینہ زانوئے محمد ﷺ

اس شعر میں دوسرے مصرعے میں یہ غور نہیں کیا گیا کہ زانوئے مبارک ستر اقدس میں شامل ہے چنانچہ یہ ناشائستہ بیان ہے اور آپ کی حیائے مبارک کی اہانت کے مترادف ہے۔

۳۔ جیسے کوئی دوشیزہ لٹا بیٹھی ہو عصمت   یوں روتے ہیں حافظ کے سمرقند و بخارا

اس شعر کا مصرعہ اولیٰ اس قدر ناشائستہ اور سوقیانہ ہے کہ کوئی شریف انسان اپنے ماں باپ کے

سامنے اس مصرعے کی ادائیگی نہیں کر سکتا چنانچہ جس ذات اقدس کی تعظیم والدین سے بھی زیادہ کرنی واجب ہے، اس کی بارگاہ میں ایسا ناشائستہ انداز بیان کتنی بڑی بے ادبی ہے۔ اس کا جائزہ اس مقالے کے آغاز میں ادب رسالت کے تقاضوں کے بارے میں دیئے ہوئے نصوص کی روشنی میں بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

بات در حقیقت یہ ہے کہ عشق ہی وہ جوہر ہے جو انسان کو مؤدب بناتا ہے اور اس جوہر کی تاثیر ہی ممدوح کی توصیف میں کہے جانے والے اشعار کو الفاظ و معانی کا نورانی پیرہن عطا کرتی ہے اور اگر دل متاعِ عشق ہی سے محروم ہے تو نہ صرف نعت نگاری کے تقاضے پورے نہیں کیے جاسکتے بلکہ حضور اکرم ﷺ کے ادب واحترام اور تعظیم و توقیر میں کوتاہی برتنے سے تمام اعمال کے ضائع ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے۔

از خدا جوئیم توفیق ادب
بے ادب محروم گشت از فضل رب

آپ بھی توجہ فرمائیے

۱۔ مابین عرش و فرش جو بن جائے واسطہ — اس شان کی اک اور بھی انگڑائی چاہیے
۲۔ ہم تو ہیں مدعی غلامی کے — کاش وہ مان لیں غلام اپنا
۳۔ بس بہت عرش معلی کے تماشے دیکھے — دیکھنے حالِ دلِ خاک نشیناں آ جا
۴۔ یہ آرزو ہے کہ میں چاکِ دل رفو نہ کروں — وہ اشک تجھ پہ نہ چھڑکوں جنہیں لہو نہ کروں
۵۔ اس پر ترے سجدوں کے نشاں لمعہ فگن ہیں — برتر ہے ترا تخت شہانہ سے مصلیٰ
۶۔ سکۂ عشق و محبت بھی عطا کرتا — بوجھ بنتا نہیں تو اپنے خریداروں پر
۷۔ اک مشترک کہانی اور وہ بھی جاودانی — کچھ میں سنا رہا ہوں کچھ وہ سنا رہے ہیں
۸۔ ہم نے مانا ہے تجھے تیری عطا سے پہلے — مدعا کوئی نہ ہو ورنہ دعا سے پہلے
۹۔ سارا سالم تری خوشبو سے مہک اٹھا ہے — عود کی طرح سدا خود کو جلایا تو نے
۱۰۔ جلا مجھے کہ مہک اٹھوں اے چراغ حرم — میں اپنے جسم کو صندل بنا کے لایا ہوں
۱۱۔ ہے عجز میں بھی بلندی، ہے فقر میں بھی شکوہ — کہاں یہ وصف کسی اور کج کلاہ میں ہے
۱۲۔ سر چڑھا گیسوئے حضرت کے جو سلجھانے کو — واہ کیا بخت مقدر سے ملا شانے کو
۱۳۔ اگر لوں بوسہ چشم دل سے خاک پاک یثرب کا — تو رضواں آ کے باغ خلد سے چومے قدم میرا
۱۴۔ اے حسن جہاں تاب وہ اندازِ نظر دے — جب آئینہ دیکھوں ترا چہرہ نظر آئے
۱۵۔ اے جنوں نام محمدؐ پہ بہار آئے تو — خواب دیکھوں گا میں بستی میں بھی ویرانوں کے

۱۶۔ قدم قدم پہ ہے خوف رہزن زمیں بھی دشمن فلک بھی دشمن زمانہ ہم سے ہوا ہے برہم تمہیں محبت سے کام لے لو
۱۷۔ آپ کے جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں طور کی بات تو ہے دور مدینے والے
۱۸۔ کرم آقا ہے یوں لذت آزار کے ساتھ کہ مسیحائی کو عزت ملی بیمار کے ساتھ
۱۹۔ جس کو تری گدائی کا اعزاز مل گیا تقدیر اس کی ہمسر تقدیر جم ہوئی
۲۰۔ خدائے پاک کوئی اب نئی زمیں ڈھونڈے کہ اس محیط پہ جنت نشاں حجاز ہوا

بعض شبہات کا ازالہ :

نعت رنگ، شمارہ نمبر ۶ میں "اردو نعت میں تلمیحات کا غیر محتاط استعمال" کے عنوان سے شائع ہونے والے میرے مضمون کے حوالے سے نعت رنگ کے گزشتہ شمارے میں مولانا کوکب نورانی صاحب زید مجدہ' نے اپنے مکتوب گرامی میں اس مقالہ نگار کی حوصلہ افزائی کے ساتھ بعض اعتراضات بھی قائم کئے ہیں۔ ذیل میں یہ اعتراضات اور ان کے مختصر جواب ترتیب وار پیش کئے جاتے ہیں۔

اعتراض نمبر ۱ (الف) : ص ۶۸ پر رسول کریم ﷺ کے لئے "بے ہوشی" کے الفاظ ترجمہ میں بیان کئے ہیں۔

(ب) : ص ۶۷ پر "مرض میں مبتلا ہوئے" کے الفاظ تحریر کئے۔

(ج) : ص ۷۰ پر فرمایا کہ آپ ﷺ کو پسینہ بہت زیادہ آتا تھا۔

ان الفاظ پر وہ توجہ فرمائیں کیا یہ درست ہیں؟ اسی طرح ہونے چاہئیں یا........

جواب : (الف) : یہ ترجمہ صحیح مسلم شریف کے مترجمہ علامہ عبدالدائم جلالی صاحب کا ہے (مطبوعہ کتب خانہ اشاعت اسلام۔ دہلی) مشکوٰۃ شریف مطبوعہ دینی کتب خانہ لاہور میں بھی عربی متن "فاغمی علیہ" کا ترجمہ "تو بےہوش ہو گئے" کیا گیا ہے۔ اور مدارج نبوت جلد دوم صفحہ ۱۶۷ (مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کمپنی) میں اس حدیث شریف کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔ "لیکن بےہوش ہو گئے کچھ عرصے بعد ہوش آیا۔ فرمایا کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟......... تین مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ اُٹھے غسل کیا اور بےہوش ہو گئے"۔ یہ ترجمہ کسی عام عربی داں نے نہیں بلکہ ایک جید عالم دین الحاج مفتی غلام معین الدین نعیمی صاحب علیہ الرحمتہ نے کیا ہے۔ مفتی صاحب موصوف مدارج نبوت کے لئے ترجمے میں صفحہ ۱۰۷ پر تحریر فرماتے ہیں "عجیب وغریب واقعہ جو ابتدائے مرض میں واقع ہوا یہ ہے کہ جب سینہ (اقدس) کا درد شدید ہوا تو کبھی آپ بے ہوش ہو جاتے اور کبھی ہوش میں آجاتے تھے۔" چنانچہ جب ایک ایسے خوش عقیدہ عربی داں عالم جو منصب افتاء پر

بھی فائز ہوں، متن کے مطابق "بے ہوشی" کے الفاظ ترجمہ میں بیان فرمائیں تو بچارے رشید وارثی کی تو حیثیت ہی کیا ہے، خود محترم کو کب نورانی صاحب کو سوچنا چاہیئے کہ کیا یہ درست ہیں؟

(ب) : حضور اکرم ﷺ کے "مرض میں مبتلا" ہونے کے واقعے کو بعض مترجمین نے علیل ہونے، بیمار ہونے یا مرض لاحق ہونے کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔ ان الفاظ کے مقابلے میں مرض میں مبتلا ہونے کے الفاظ انبیاء علیہم السلام کی ابتلا و آزمائش کے قرآنی اسلوب بیان کے حوالے سے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت۔ ۱۲۴ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کیلئے "واذابتلی ابراھیم ربه بکلمت" کے الفاظ آتے ہیں۔ قاضی عیاض رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بعض اوقات انبیاء علیہم السلام کو ابتلا و آزمائش میں ڈالا گیا۔ اور بعض اوقات ان کو آفات سے محفوظ فرمایا گیا اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی حکمت کو ظاہر کرتی ہیں تاکہ ان نفوس قدسیہ کا ان مواقع پر شرف انکی بزرگی ظاہر ہو۔ اور حکم الہیٰ بھی ثابت ہو جائے۔ (الشفا) حضور اکرم ﷺ کا دنیا سے پردہ فرمانا اختیاری تھا۔ جس کا ظاہری سبب مرضی مولا کے مطابق یہ مرض ہوا۔ اس لئے علالت یا بیمار ہونے کے بجائے مرض میں مبتلا ہوئے کہنا ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے (واللہ اعلم)

(ج) : مولانا صاحب کا یہ لکھنا "ص ۷۰ پر فرمایا کہ آپ ﷺ کو پسینہ بہت زیادہ آتا تھا" محل نظر ہے۔ کیونکہ یہاں فدوی نے خود کچھ بھی نہیں کہا ہے بلکہ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کردہ متفقہ علیہ حدیث کا مشکوٰۃ شریف سے ترجمہ من وعن نقل کر دیا ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت کردہ حدیث کا متن درج ذیل ہے:

وعن ام سلیم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یا یتھا فیقیل عند ھا فتبسط نطعا فیقیل علیه وکان کثیر العرق فکان تجمع عرقه فتجعله فی الطیب۔ الخ

(مشکوٰۃ شریف)

یہاں مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ شعر بھی توجہ طلب ہے۔

آب زر بنتا ہے عارض پر پسینہ نور کا
مصحف اعجاز پر چڑھتا ہے سونا نور کا

اعتراض نمبر ۲ : وارثی صاحب ان لوگوں کا نام القاب و آداب سے کیوں لیتے ہیں جو اپنی تحریروں کے حوالے سے گستاخی کا سنگین جرم کر چکے یا گستاخوں کی حمایت کا جرم کر رہے ہیں؟

جواب : بڑی نوازش ہوتی اگر اس بات کی بھی نشاندہی کر دی جاتی کہ وہ کونسی شخصیت ہے جو گستاخی کے جرم کی مرتکب ہو چکی ہو اور فدوی نے اس کا نام القاب و آداب کے ساتھ لیا ہو؟ البتہ علمائے کرام خواہ کسی

مکتب فکر کے ہوں ان کو برا کہنے سے احتیاط برتنا چاہیے کیونکہ اس طرح بعض مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ' سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا لوگوں کے ساتھ مدارات کرنا صدقہ ہے۔ (بیہقی)

قرآن کریم میں تو مشرکین کے باطل خداؤں کو بھی برا کہنے کی ممانعت آئی ہے تاکہ مشتعل ہو کر لا علمی کی بناء پر ہمارے معبود برحق کی جناب میں گستاخی نہ کرنے لگیں (خلاصہ سورۃ الانعام آیت ۱۰۹ ر ۱۰۸)

انسانی فطرت ہے کہ اسے اپنے مذہبی پیشواؤں سے دلی محبت ہوتی ہے لہٰذا اگر ہم یہ چاہتے ہیں کے لوگ ہمارے فقہی بزرگوں کے نام برائی کے ساتھ لینے کے بجائے ادب کے ساتھ لیں تو ہمیں بھی اپنے مخاطب کے فقہی بزرگوں کا نام برائی کے ساتھ لینے کے بجائے مدارات کی بنیاد پر ہی سہی شائستگی کے ساتھ لینا چاہیئے۔ یہی وہ صورت ہے کہ مسلمانوں کے درمیان نفرتوں کی خلیج کو کسی حد تک پاٹا جاسکتا ہے اور مسلمانوں کے باہمی افتراق وانتشار کو کم کرکے اتحاد بین المسلمین کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے اور اس طرح الحاد وبد عقیدگی کی راہیں مسدود کی جاسکتی ہیں۔

پروفیسر شفقت رضوی

اُردو نعت پر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی کتب
(تعارف و تجزیہ)

میں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ ہمارے علمائے ادب مذہبی لٹریچر کو لٹریچر مانتے ہی نہیں ہیں اسی لئے ادبی تواریخ کے صفحات مذہبی لٹریچر کے ذکر سے خالی ہیں اگر کچھ توجہ دی گئی ہے تو صرف محسن کاکوروی کے نعتیہ قصیدہ لامیہ کو اور انیس و دبیر کی مرثیہ گوئی کو۔ اس کی وجہ جو میں نے بتلائی تھی یہ تھی کہ مذہبی لٹریچر کو مقدس سمجھا گیا اسے پڑھا، چوما اور بلند طاق پر رکھ دیا۔ اس کے حسن و قبح پر غور کرنے کو سوء ادب خیال کیا گیا یہی وجہ ہے کہ تنقید و تبصرہ سے گریز کے نتیجہ میں ایک تو ان کے چرچے کم ہوئے اور زمانہ چرچوں (پروپگنڈے) کے بغیر کسی کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی لٹریچر نے لکھنے والے کی نمائندگی نہیں کی اور فن کے تقاضوں کو پورا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ تنقید اور تبصرے نہ ہونے سے خوبیاں اور خامیاں منظر عام پر نہیں آتیں۔ لکھنے والوں کو راہ دکھلانا نقادانِ فن کا فرض ہے اور وہ اس سے پہلو تہی کرتے رہے۔ اردو میں نعت گوئی کی مثال لیجئے۔ اس صنف پر اس وقت سے طبع آزمائی ہو رہی ہے جب سے کہ اردو میں تحریری کام کا آغاز ہوا۔ ساڑھے تین سو سال کے مشق سخن کے احتساب یا تنقید کے مقدار کو دیکھیں تو ایک درجن تصانیف بھی نہیں ملتیں۔ اس رویہ کو لاعلمی یا کم علمی نہیں کہا جائے گا بلکہ دانستہ روگردانی سے ہی تعبیر کیا جائے گا۔ میرا مقصد صرف اعتراض کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے بڑھ کر اظہار افسوس کرنا ہے اور اس میں میں حق جانب ہوں۔

میرے افسوس کے جذبہ کی شدت کم کرنے کے لئے میرے ایک صاحب علم کرم فرمانے بعد تلاش بسیار وہ ساری کتابیں حاصل کر کے مجھے دیں جو نعت کے موضوع پر تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ان کی تعداد بھی ایک درجن کی حد کو نہیں چھوتی چونکہ اگلی سطور میں ان کے حوالوں کے ساتھ بحث کو آگے بڑھایا جائے گا اس لئے ضروری ہے کہ یہاں ان کتب کی فہرست دے دی جائے۔

۱۔ اردو کی نعتیہ شاعری   از   ڈاکٹر طلحہ رضوی برق   مطبوعہ پٹنہ جنوری ۱۹۷۴ء

۲۔ اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء

۳۔ اردو میں نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق مطبوعہ کراچی اکتوبر ۱۹۷۶ء

۴۔ اردو نعت، تاریخ و ارتقاء از سید افضال حسین نقوی فضل فتح پوری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۹ء

۵۔ اردو نعت گوئی از ڈاکٹر ریاض مجید مطبوعہ لاہور ۱۹۹۰ء

۶۔ اردو شاعری میں نعت گوئی از ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی مطبوعہ گیا، بہار ۱۹۹۱ء

۷۔ اردو شاعری میں نعت از ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۹۲ء
(دو جلدیں)

۸۔ فی احسن تقویم از جاوید احسن خان مطبوعہ ڈیرہ غازی خان ۱۹۹۷ء

تعداد میں تےہتلادی ممکن ہے ان کے علاوہ دو ایک کتابیں اور ہوں جو رسائی سے باہر رہی ہوں۔ ان کے مفروضہ اضافہ کے بعد بھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ تعداد کے لحاظ سے یہ کام اطمینان بخش ہے۔ رہا معیار کا مسئلہ تو اس پر آگے چل کر گفتگو ہوگی بہر حال ہماری معلومات کے مطابق جو کام صدی، ڈیڑھ صدی پہلے یقیناً شروع ہونا چاہئے تھا ان کا آغاز موجودہ اختتام پذیر صدی کی آخری دہائیوں میں ہوا اور دنیا جانتی ہے آغاز میں ہر کام خام ہوتا ہے لیکن پھر بھی آغاز کا مطلب بنیاد کا وہ پتھر ہوتا ہے جس پر عمارت کی تکمیل ہوتی ہے۔ دل کے بہلانے کو "دیر آید درست آید" کہہ دینا بھی ایک رسم قدیم ہے اور یہاں اس کا موقع بھی ہے۔

اگرچہ میں اس بحث کو فضول سمجھتا ہوں کہ اردو نعت کے موضوع پر پہلی کتاب کون سی اور کس کی ہے؟ لیکن چونکہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے قدرے "حسنِ تعلّی" کے ساتھ دو "معتبر" شہادتیں اپنی اولیت اور اپنی کتاب کی تقدیم کے لئے فراہم کی ہیں اس لئے انہوں نے گویا اس موضوع پر اظہارِ حقیقت کی دعوت بھی دی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "میری دیرینہ آرزو کے مطابق ڈاکٹر ریاض مجید کی نہایت جامع کتاب بہ عنوان "اردو میں نعت گوئی" اقبال اکیڈمی لاہور ۱۹۹۰ء کے ذریعہ منظر عام پر آئی اور انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں یہ انکشاف کیا کہ "نعت کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی اہم تصنیف ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" (۱۹۷۴ء) ہے جس میں علمی و تحقیقی انداز میں نعت کے فکر و فن کے ضروری پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔"

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اردو میں نعتیہ شاعری، طبع دوم، کراچی ۱۹۹۷ء، ص ۱۰)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے ڈاکٹر نجم الاسلام کی یہ تائیدی شہادت بھی درج کر دی ہے:

> "۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو میں نعتیہ شاعری" طبع ہو کر

لاہور سے شائع ہوئی اور یوں اشاعت کے اعتبار سے اسے تقدیم کی فضیلت حاصل ہے۔"

(ڈاکٹر نجم الاسلام: مضمون "اردو نعت کے مطالعے" مشمولہ "صریر خامہ نعت نمبر" مجلہ شعبہ اردو، جامعہ سندھ)

ڈاکٹر ریاض مجید کے بیان پر تبصرے سے ہم اس لئے گریز کر رہے ہیں کہ انہوں نے تصنیف کے ساتھ "اہم" کی شرط لگادی ہے۔ ظاہر ہے کہ "اہم" قرار دینے کے اپنے اپنے معیار اور وجوہ ہوتے ہیں لیکن ڈاکٹر نجم الاسلام نے سیدھے سادے طور پر ڈاکٹر فرمان کی کتاب کو تقدیم کی فضیلت کا شرف بخشا ہے اسلئے ان کی معلومات میں اضافہ کی جسارت کے طور پر ہم ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی کتاب کا حوالہ دیں گے اگرچہ ڈاکٹر فرمان اور ڈاکٹر طلحہ کی کتابیں ۱۹۷۴ء میں چھپی ہیں لیکن ڈاکٹر طلحہ کی کتاب پر اشاعت کے سال کے ساتھ جنوری بھی درج ہے اس لئے تقدیم کی فضیلت ان کی طرف منتقل ہو جانا چاہیے۔

سال اشاعت ہی کو اولیت کے شرف کے لئے ضروری قرار دینا بھی یوں مناسب نہیں کہ تحقیق میں اشاعت کے سال کو نہیں تحریر کے سال کو اہمیت دی جاتی ہے اگر اسے ملحوظ رکھا جائے تو ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کی کتاب "اردو میں نعتیہ شاعری" سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا اس کے بارے میں ڈاکٹر نجم الاسلام رقمطراز ہیں:

"اب ہم دو ایسی اہم بلکہ اہم ترین تصانیف کی طرف آتے ہیں جن کا موضوع خصوصاً اردو کی نعتیہ شاعری ہے۔ ان میں ضخیم اور مقدم ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کا مقالہ تحقیق "اردو میں نعتیہ شاعری" ہے یہ اس موضوع پر پہلا تحقیقی مقالہ ہے اس پر ناگپور یونی ورسٹی نے فاضل مصنف کو ۱۹۵۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی مگر اس کی طباعت واشاعت کی نوبت ۱۹۷۶ء میں آئی اور اس سے دو سال پہلے ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" طبع ہو کر لاہور سے شائع ہوئی۔" (ڈاکٹر نجم الاسلام: حوالہ مذکورہ، ص ۱۳۲)

تحقیقی نقطہ نظر سے غیر مطبوعہ تحریر بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اشاعت کی شرط لگا کر ہم ان تمام مخطوطات کی اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتے جو شرمندہ طباعت نہیں ہوئے ہیں۔ موضوع کو تحقیق اور تنقید کے لئے منتخب کر کے ڈاکٹر اشفاق نے اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا اور اہل نظر کو مشمولات کی طرف نہ سہی موضوع کی طرف ضرور متوجہ کیا۔ مزید یہ کہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تشنہ تکمیل مضامین لکھے ہیں جن کی بنا پر ان کو "اہم" نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر اشفاق کا مقالہ جامعیت کے لحاظ سے بہت زیادہ گرانقدر اور "اہم" ہے۔ میں نے پہلے ہی لکھ دیا ہے کہ میں اولیت اور تقدیم کی فضیلت کے

مسئلہ کو اہم نہیں گردانتا۔ اس طرح کے اظہار خیال سے کبھی کبھی معلومات کی کمی کی نشاندہی پر پشیمانی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔

متذکرہ کتابوں میں سے چار پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھے گئے مقالے ہیں۔ ان میں پہلا مقالہ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کا، دوسرا ڈاکٹر ریاض مجید کا، تیسرا ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا اور چوتھا ڈاکٹر اسماعیل آزاد فتح پوری کا ہے۔ باوجود اس کے کہ ہم ڈگری کے لئے لکھے گئے مقالوں کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہے اور ان کی خواندگی کے لئے طبیعت کو بالجبر مائل کرتے رہے۔ ان تین مقالوں کا ہم نے بالالتزام مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں ملے جلے رجحان کے ساتھ ان کی اہمیت کو تسلیم کیا۔ ان کا الگ الگ تجزیہ اگلے صفحات میں ممکن ہوگا۔ ابتدائی تین کتابیں یعنی ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر فرمان اور ڈاکٹر اشفاق کی کتابیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ ایسی انفرادی کاوشیں ہیں کہ ان کے مصنفین کے سامنے رہنمائی کے نمونے موجود نہیں تھے گویا ان حضرات نے ایک دوسرے کی کتابیں پڑھی تھیں نہ ان سے فیض پایا تھا۔ یہ ایک خوشگوار عمل تھا جس سے وہ گزرے ہیں ورنہ نمونہ کی کتاب موجود ہوتی تو نفسیاتی طور پر اس کی تقلید کی جانب طبیعت مائل ہوتی اور عدم پیروی کے قصد کے باوجود تائید یا اختلاف کے لئے قلم برجستہ جوہر دکھلاتا۔ ان میں ایسی صورت پیدا نہیں ہوئی۔ جہاں تک تحقیق، تنقید اور موضوع کی جامعیت کا تعلق ہے بلاشبہ ڈاکٹر اشفاق کی پہلی محنت داد کی مستحق ہے۔ ان کی کوشش اولین نوعیت کی ہونے کے باوجود موضوع سے انصاف کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی ہے۔ ان کی اس تحریر کو "تحقیقی مقالہ" کہنا زیب دیتا ہے جبکہ ڈاکٹر طلحہ رضوی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے مقالہ نگاری کے بجائے سرسری مضمون نگاری کو ترجیح دی ہے۔ ڈاکٹر فرمان کی کتاب کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کی اشاعت و تقسیم وسیع پیمانے پر ہوئی اور مصنف نے کتاب لکھنے کا حق پایا کیونکہ بعد کے تمام لکھنے والوں نے اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اس سے استفادہ کیا۔ فضل فتح پوری کو اس موضوع پر متوجہ کرنے اور لکھنے کی ترغیب دینے والی یہی کتاب ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید اور ڈاکٹر رشاد عثمانی کی کتابیات میں بھی یہ شامل ہے۔ آخر الذکر نے ڈاکٹر طلحہ رضوی کی کتاب کو بھی ماخذات میں شامل کیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ادب میں بھی چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ کوئی کتاب موضوع اور مواد کے لحاظ سے جامع ہو یا نہ ہو اگر کسی کے لئے تحقیق مزید کے لئے محرک ثابت ہوتی ہے تب بھی اصل کتاب کی اہمیت مسلم ہو جاتی ہے۔

ایک عجیب و غریب مشترکہ خصوصیت جو ان تمام کتابوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ نعت پر بحث کا آغاز عربی شاعری سے کیا جاتا ہے۔ اگر صنف کی تعریف اور اسلوب کی رہنمائی کے لئے اختصار کے ساتھ عربی کے حوالے دیئے جائیں تو معیوب نہیں اس سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے لیکن عربی قصائد مدحیہ کو کتاب کا اہم موضوع بنا کر اس پر طویل مباحث درج کرنا کتاب کے عنوان سے عدم

مطابقت کا احساس دلاتا ہے جبکہ یہ امر بھی مشکوک ہے کہ عربی قصائد کے حوالہ سے مباحث کا آغاز کرنے والے عربی زبان پر عبور بھی رکھتے ہیں۔ (ڈاکٹر اشفاق کی عربی دانی شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ ان کے پاس اس زبان کی ڈاکٹریٹ بھی ہے) اس طرح قیاس پختہ ہو جاتا ہے کہ حوالے مصنف کی دریافت نہیں بلکہ کسی ذریعہ سے ماخوذ ہیں۔ اس صورت میں مصنف ان کی صداقت کو منوانے کے بوجھ کا شائد ہی متحمل ہو سکتا ہے۔ کم و بیش یہی حال فارسی نعت گوئی کا ہے اگرچہ یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اردو دان طبقے میں عربی دان حضرات کی نسبت فارسی داں حضرات کی اکثریت ہے لیکن ہر دو صورتوں میں اعتراض قائم رہتا ہے کہ عربی اور فارسی نعت گوئی کو تمہید کے طور پر مختصراً پیش کرنا نہایت مناسب ہے جبکہ ان کو اردو نعت گوئی پر گفتگو کرتے ہوئے اصل موضوع کے برابر طوالت دینا غیر ضروری اور بے جوڑ بات ہے۔ ایسی ہی صورت حال اس وقت کھٹکتی ہے جب کسی شاعر کی نعت گوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو اشعار کی جگہ فارسی اشعار کی بہتات نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے علامہ اقبال کے نعتیہ کلام کے جو نمونے درج کیے ہیں ان میں فارسی اشعار کی تعداد پچاس سے تجاوز کر گئی ہے جبکہ اردو اشعار دس بارہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ غالباً ڈاکٹر فرمان نے اقبال کی حضور علیہ السلام سے عقیدت کے حوالہ سے کوئی طویل مضمون لکھا تھا جس میں ان کی فارسی اور اردو شاعری سے استفادہ کیا گیا تھا اور پھر اسی مضمون کو "اردو کی نعتیہ شاعری" میں بلا جواز شامل کر دیا۔

ان تمام کتابوں میں "نعت" کی تعریف و تشریح تو ملتی ہے لیکن تمام مصنفین نے اس بحث سے گریز کیا ہے کہ "نعت" محض "موضوعاتی شاعری" ہے یا اسے صنف سخن قرار دینا جائز ہے۔ "موضوعاتی شاعری" کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

> "موضوعاتی شاعری بہ حیثیت مجموعی خارجی واقعات سے اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق رکھتی ہے۔ غیر موضوعاتی شاعری ان کے (نقادوں کے) نزدیک شاید یوں اہم تر ہے کہ اس کے نفس مضمون کا ادراک ہم آسانی سے نہیں کر سکتے۔ ہم نہیں جانتے کہ جو نظم ہم سننے والے ہیں اس میں کیا کہا جائے گا اور کس نقطہ نظر سے کہا جائے گا یوں سمجھ لیجئے کہ غیر موضوعاتی شاعری عالم محسوسات و کیفیات کی خبر ہونے کے سبب اپنے قاری یا سامع کو قبل از وقت موضوع و مواد کا سراغ نہیں دیتی۔ سننے والا جو کچھ سنتا ہے یکایک سنتا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ اچانک محسوس کرتا ہے۔"
>
> (ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حوالہ مذکورہ، ص ۲۳)

ہم ڈاکٹر فرمان کے بیان سے جزوی طور پر متفق ہیں اور جزوی طور پر اختلاف کرنے کی جسارت پر مجبور ہیں۔ انہوں نے موضوعاتی شاعری کو خارجی نوعیت اور غیر موضوعاتی شاعری کو داخلی نوعیت کی

قرار دیا ہے اور غیر موضوعاتی شاعری کی مزید وضاحت اس طرح کی ہے کہ نفس مضمون کا ادراک آسانی سے ممکن نہیں۔ سامع یا قاری نہیں جانتا کہ کیا کہا جائے گا اور کس نقطہ نظر سے کہا جائے گا۔ اس بارے میں گذارش یہ ہے کہ موضوعاتی شاعری میں مضمون کا ادراک تو ممکن ہے یعنی نظم کے عنوان سے نفس مضمون کی پہچان آسان ہو جاتی ہے لیکن کس نقطہ نظر سے کہا جائے گا یا کس انداز میں کہا جائے گا اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔ شاعری میں موضوع کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اسلوب کو نظر انداز کرنا شاعری کے ہنر کو نظر انداز کرنا ہے۔ ایک ہی موضوع اعلان کے بعد خارجی شاعری میں بیان ہو جاتا ہے تو بلا اعلان داخلی شاعری میں بھی جگہ پا سکتا ہے۔ صرف موضوع جان لینے سے سامع یا قاری پر اثر مرتب نہیں ہو تا بلکہ "وہ کس طرح کہا گیا ہے" کی کھوج میں رہتا ہے اور کہنے کے اسلوب سے ہی اثر انگیزی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ اسلوب کی مہارت خارجی اور داخلی دونوں نوعیتوں کی شاعری میں یکساں طور پر کام دکھاتی ہے۔ نعت کے مضامین سامع اور قاری کے لئے نئے نہیں موضوع میں وسعت ہے اور اساتذہ سخن نے موضوع کے تمام پھول اور کلیاں پہلے ہی چن لئے ہیں۔ اب اگر شاعر کو اپنا بھرم قائم کرنا ہے تو وہ موضوع کی تکرار سے نہیں گھبرائے گا۔ اپنی شاعرانہ قدرت کو کام میں لاتے ہوئے اس میں نیا رنگ بھرے گا اپنے انداز بیان سے دلچسپی کے عنصر کو بڑھائے گا۔ اپنے بیان کی فصاحت سے دل نشینی میں اضافہ کرے گا۔ سو بار سنا ہوا مضمون اس طرح تازہ اور ندرت کا حامل نظر آئے گا۔ نظم (موضوعاتی) میں بھی غزل (غیر موضوعاتی) کی چاشنی پیدا کی جا سکتی ہے۔ خارجی شاعری مشاہداتی یا محض واقعہ نگاری ہے تو تیسرے درجے کی ہی شاعری ہے۔ شاعر تو وہ ہے جو مشاہدہ اور واقعہ کو ذات میں سمو لے اس طرح جذب کر لے کہ وہ اس کا محسوساتی، جذباتی، فکری تجربہ بن جائے۔ وہ مشاہدہ یا واقعہ کو انجذاب کے بعد صورت اختیار کرنے والے تجربے کی صورت شعر میں بیان کرے یہی بڑی اور اچھی شاعری کی پہچان ہے یہاں پہنچ کر خارجیت اور داخلیت باہم مدغم ہو جاتے ہیں۔

ہم محققین اور مصنفین حضرات سے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ نعت کو صنف سخن مانتے ہیں یا موضوعاتی شاعری تسلیم کرتے ہیں۔ اس سوال کا واضح جواب ہمیں ان کتابوں میں نہیں ملا۔

نعت شاعری کی ہر ہیئت میں ملتی ہے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، مخمس، قطعہ، رباعی، ہر ایک میں نعت کے مضامین بیان ہوتے ہیں۔ کیا کسی بھی ہیئت میں مدحت یا ذکر رسول ﷺ نعت کہلائے گی یا اسے ان اصناف کا موضوع ہی کہا جائے گا۔ ہمارے خیال میں صنف سخن کے تعین کے دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک اس کی ظاہری ہیئت (Form) دوسرے اس کا موضوع ___ قصیدہ شاعری کا ایک form ہے۔ اس میں تعریف و توصیف بھی ہو سکتی ہے۔ ذکر و مدحت رسول ﷺ بھی ہو سکتی ہے کسی کی برائی بھی کی جا سکتی ہے۔ موضوع کے لحاظ سے وضاحت کی خاطر اقسام کا تعین کیا جاتا ہے۔ قصیدہ مدحیہ، قصیدہ نعتیہ، قصیدہ ہجویہ ___ اگر اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے قصیدہ مدحیہ کو مدح، قصیدہ نعتیہ کو نعت اور قصیدہ ہجویہ کو ہجو کہنا

جائز ہے تو اس طرح موضوع کے لحاظ سے صنف کا تعین ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں قصیدہ، غزل، مثنوی، مسدس، مخمس، قطعہ یا رباعی ہونے کا اعلان ضروری نہیں سامع یا قاری معمولی سی سخن فہمی سے ہیئت ظاہری کا تعین کر سکتا ہے۔ گویا جس طرح form کے لحاظ سے صنف کا تعین ہو سکتا ہے اسی طرح موضوع کے لحاظ سے بھی صنف کا تعین ممکن ہے۔ اس کی زیادہ واضح مثال غزل اور سلام کی ہو سکتی ہے۔ ہیئت ظاہری دونوں کی ایک ہے لیکن یہ فیصلہ کرنے میں لمحہ بھی صرف نہیں ہوتا کہ یہ غزل ہے یا سلام کیونکہ مضمون خود ہی رہنمائی کر دیتا ہے۔ قابل مصنفین نے اس سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا لیکن بالواسطہ طور پر موضوع کے لحاظ سے نعت کو تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے لکھا ہے:

> "حالی نے ہر صنف سخن میں کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ رباعی، مخمس، غزل، قصیدہ اور مسدس سب میں نعت گوئی کے نمونے ملتے ہیں۔"
>
> (ڈاکٹر فرمان فتح پوری: حوالہ مذکورہ، ص ۷۱)

اگر ڈاکٹر فرمان "ہر صنف سخن" کے بجائے "ہر ہیئت ظاہری" form لکھتے تو ہمارے خیال کی تائید ہوتی۔ ان کے انداز بیان نے ابہام دور نہیں کیا اور بڑھایا؟ وہ اس کے قائل نہیں ہیں انہوں نے واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ:

> "نعت کی حیثیت اردو، فارسی شاعری میں صنف سخن کی نہیں بلکہ ایک موضوع کی رہی ہے۔"
>
> (ڈاکٹر فرمان فتح پوری: پیش لفظ "اردو نعت، تاریخ وارتقاء از فضل فتح پوری: ص ۴۲)

برخلاف ان کے ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کے خیال میں:

> "اردو شاعری میں نعت کا فن ایک مستقل صنف سخن کی حیثیت سے معلوم و معروف نہیں رہا ہے اس لئے کہ نعت کی ہیئت متعین نہیں ہے بلکہ مختلف ہیئتوں میں اس کے موضوع کو برتا گیا ہے اور اپنی فکری اور فنی خصوصیات کے باعث اس کی حیثیت اب ایک مستقل صنف سخن کی ہو گئی ہے۔"
>
> (ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی: اردو شاعری میں نعت گوئی، گیا (بہار) ۱۹۹۱ء، ص ۲۰)

آج کل شائع ہونے والی کتابوں اور رسائل میں کلام غزل، نظم، قطعات، آزاد نظم، رباعی، ہائیکو وغیرہ کی ہیئت میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا عنوان "نعت" ہی دیا جاتا ہے گویا ہیئت ظاہری پر موضوع کو ترجیح دی جاتی ہے گویا نقطہ نظر عمومیت سے تسلیم شدہ ہے کہ صنف سخن کا تعین ہیئت ہی پر منحصر نہیں بلکہ موضوع پر بھی منحصر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل اردو کے مزاج میں غزل رچ بس گئی ہے۔ ابتدائے عہد سے غزل کا رواج رہا۔ اس سے گرمی محفل پیدا ہوتی ہے اس میں دل گدازی کی کیفیت ہے اس کا کیف جسے تغزل

کہیں سب کو بھاتا ہے۔ اس لئے نعت کے لئے بھی اسی ہیئت کو ترجیح دی جاتی ہے ہمارے نعتیہ ذخیرہ شاعری میں کم وبیش نوے فیصد کلام اسی ہیئت میں ہے۔ فضل فتح پوری تو اس بات کے قائل ہیں کہ نعت غزل کی ہیئت میں ہی کہی جانی چاہئے ان کا کہنا ہے کہ:

"ان سب سے (تمام اصناف سخن سے) الگ غزل کی صنف سخن ہے جس میں گداز دلی اور جذب وانجذاب کے عنصر کو ابھارا جا سکتا ہے چنانچہ فارسی غزل سے لے کر اردو غزل تک اس صنف سخن سے متاثر ہو کر اسی صنف سخن کو زمین بنا کر نعت رسول ﷺ کہی گئی۔" (فضل فتح پوری: حوالہ مذکورہ، ص ۲۴)

اسی تسلسل میں نعتیہ غزل کے تجربوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے امیر مینائی کو خراج تحسین پیش کیا ہے غزل کی ہیئت میں نعت گوئی کے تجربے کے حاصل کے طور پر ان کا کہنا ہے کہ

"یہ تجربہ کچھ کم وقیع نہ تھا اس تجربے نے نعت نبی اکرم ﷺ کو ایک نیا آہنگ اور ایک نیا وقار بخشا تا آنکہ آج اردو نعت صرف مدحت نبی اکرم ﷺ میں لکھے ہوئے ہر منظومہ کو نہیں کہہ سکتے بلکہ اردو نعت کہلانے کا صرف اس منظومہ کو حق اور مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے جس میں جذب وانجذاب اور رسول اکرم ﷺ سے محبت اور عقیدت، شیفتگی اور والہانہ پن کی صحیح چھاپ ہو اور یہ مرتبہ اور یہ وصف نعت کو اگر غزل کی زمین کہا جائے تو فی الواقع حاصل ہو سکتا ہے۔"

(فضل فتح پوری: حوالہ مذکورہ، ص ۲۴،۲۵)

غزل اور دیگر اصناف سخن کے بارے میں فضل فتح پوری کے خیالات ذاتی پسند، ناپسند اور مفروضوں کی بنیاد پر ہیں۔ جذب وانجذاب، شیفتگی اور والہانہ پن صنف میں نہیں شاعر کے مزاج اور اس کے رویہ میں ہوتا ہے یہ کہہ کر کہ غزل ہی مدحت رسول اکرم ﷺ کے لئے واحد موثر میڈیا ہے دیگر اصناف سے روگردانی کرنا ادبی شہ پاروں کی عظمت سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ غزل میں نعت گوئی بعد کی بات ہے۔

اگر دکنی سرمایہ شعری کو اردو کی ابتدائی شکل تسلیم کر لیا جائے تو وہاں نعت مروجہ متعدد ہیئتوں میں ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ غور کرنا پڑے گا کہ ولادت نامے، شمائل نامے، معراج نامے، نور نامے، مولود شریف، وفات نامے، معجزے نامے وغیرہ نعت کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں جبکہ ان سب کا موضوع ذات گرامی رسول اکرم ﷺ ہیں۔ ممتاز حسن لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک ہر وہ شعر نعت ہے جس کا تاثر ہمیں حضور نبی کریم ﷺ کی ذات گرامی سے قریب لائے۔ جس میں حضور کی مدح ہو یا حضور سے خطاب کیا جائے۔"

"____ وہ مدح یا خطاب بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ ہو اور وہ شعر نظم ہو یا غزل، قصیدہ ہو یا مثنوی، رباعی ہو یا مثلث، مخمس ہو یا مسدس، اس سے نعت کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ نعتیہ کلام کی معنوی قدر و قیمت کا دار و مدار اس کے نفس مضمون پر ہے۔"

(ممتاز حسن: خیر البشر کے حضور میں، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵)

ممتاز حسن کی صراحت کے مطابق جن شعری کاوشوں کا ذکر کیا گیا اگر ان کے ذریعہ ذات گرامی سے قربت پیدا ہوتی ہے تو وہ بھی نعت کے ضمن میں شمار ہو سکتے ہیں۔ ہماری معاشرتی زندگی میں میلاد شریف، قوالی کی محفلوں کا رواج زمانہ قدیم سے عام رہا ہے ان محافل کا تقدس ذکر رسول اکرم ﷺ کی بنا پر ہی قائم و باقی رہا ہے۔ یہ ذات رسول پاک ﷺ کے وسیلہ سے خدا اور مذہب کی طرف رغبت دلانے کے سبب بنے رہے ہیں۔ دکنی ادبیات کا جائزہ لیا جائے تو اس میں بے شمار میلاد نامے اور معراج نامے ملیں گے۔ ڈاکٹر طلحہ رضوی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ نعت نے غزل کی ہیئت بہت بعد میں اپنائی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق:

"فدوی خاں فدوی اور میر محمد شریف اورنگ آبادی نے غزل اور قصیدہ کے فارم میں نعت گوئی شروع کردی۔" (ڈاکٹر طلحہ رضوی برق: اردو کی نعتیہ شاعری، مطبوعہ پٹنہ، جنوری ۱۹۷۴ء، ص ۳۳)

آج بھی میلاد شریف کی محفلوں کا انعقاد ایک اہم اور واضح حقیقت ہے لیکن ان تمام محققین نے جن کی کتابیں اس وقت ہمارے پیش نظر ہیں انہوں نے ان مروجہ ضمنی اصناف نعت پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے اگر کسی نے ذکر کیا بھی ہے تو کسی شاعر کے ذخیرہ نعت کے حوالہ سے ضمناً اور سرسری طور پر کیا ہے حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک الگ باب قائم کر کے ان پر اجمالاً ہی سہی نظر ڈالی جاتی اور مدلل طور پر اظہار کیا جاتا کہ نعت گوئی میں ان کا کیا مقام ہے؟ آیا یہ نعت کی ذیلی شاخیں شمار کی جاسکتی ہیں یا نہیں؟

نعت کی اقسام کا تعین کرنے کی کوشش ڈاکٹر اشفاق کے مقالہ میں ملتی ہے۔ انہوں نے رسمی، مقصدی، اصلاحی تین قسمیں گنوائی ہیں۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے صرف دو قسمیں بیان کی ہیں، رسمی اور حقیقی۔ ہمارے خیال میں ڈاکٹر ریاض مجید کی احتیاط صائب ہے کیونکہ ڈاکٹر اشفاق نے مقصدی اور اصلاحی نعت کو الگ کر دیا ہے جبکہ اصلاحی قسم مقصدی کی ذیل ہی میں آتی ہے۔ اردو شاعری میں رسمی نعت گوئی کی بہتات ہے۔ ان محققین اور ناقدین کو چاہیے تھا کہ وہ رسمی نعت کے نمونے دے کر ان کی مذمت کرتے تاکہ اس نوع کے شاعروں کی ہمت شکنی ہوتی اور آئندہ نعت کہنے والے احتیاط سے کام لیتے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فضل فتح پوری کی کتاب "اردو نعت، تاریخ اور ارتقاء" کے پیش لفظ میں درست تحریر فرمایا گیا ہے کہ

"ایسے ایسے شعرا کے نعتیہ مجموعے منظر عام پر آگئے ہیں جن کے قول و عمل میں ارتعاش جذبات کا حضور ﷺ کے اسوہ حسنہ سے دور کا واسطہ بھی نظر نہیں آتا بلکہ بعض کی عملی زندگی تو اسوہ رسول ﷺ کے بالکل برعکس بسر ہو رہی ہے۔"

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری: پیش لفظ "اردو نعت، تاریخ و ارتقا" ص ۱۷)

اس نوع کی شاعری رسمی نعت گوئی کی لائق مذمت۔مثال ہے۔ شہرت اور نام و نمود کے بھوکے معاشرہ کے ہر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے وجود کا غیر ضروری احساس دلانا چاہتے ہیں جو انہیں میسر آجائے۔ شہرت طلب مذہبی اجتماعات میں نعت پیش کر کے تعریف و ستائش پاتے اور سینہ پھلاتے ہیں۔ محرم کی مجلسوں میں نو تصنیف مرثیہ پیش کر کے عصر حاضر کے سب سے بڑے شاعر کہلاتے اور جب ترقی پسند بنتے ہیں تو خدا، مذہب، آئمہ اور امام حسینؓ کی شان میں گستاخی کر کے انقلابی کہلانے پر فخر کرتے ہیں۔ ایسے شعراء کے کلام کو در خور اعتنا سمجھنا ہی نہیں چاہئے۔ لیکن ہماری ذہنی مرعوبیت کا یہ حال ہے کہ پروپگنڈا کے زور پر بڑے شاعر بن جانے والوں کی خرافات کو بھی ہم سر آنکھوں پر رکھتے اور اس طرح ان کی بد اعمالی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔

ہمارے محققین اور مصنفین شریف الطبع، نیک طینت اور خوش گفتار ہیں وہ اچھائیوں کا ذکر کر کے اس کو عام کرنے کی سعی کرتے ہیں برائیوں سے صرف نظر کر کے ان کی ہمت شکنی کرتے ہیں اور اس رویہ کو تقاضہ احتیاط اور شرافت کا گردانتے ہیں۔ اردو نعت کے بارے میں لکھی گئی تمام کتابوں میں بطور نمونہ اعلیٰ درجہ کا کلام درج کیا گیا ہے حالانکہ ہمارے ذخیرہ شاعری میں اعلیٰ درجہ کے اشعار کم اور بھرتی کے یا رسمی اشعار زیادہ ہیں۔ مولانا حسرت موہانی نے شاعری کی جو اقسام گنائی ہیں ان میں آمد، آورد اور ان دونوں کی ملی جلی شکل ـــــ گویا شاعری تین قسم کی ہوتی ہے اگر سختی سے محاسبہ کیا جائے تو مجموعی طور پر نعت گوئی میں بھی آورد ہی آورد ملے گی آمد کم، ـــــ آمد کے لئے جذب درون، عشق صادق، وار فتگی کامل اور کھو جانے کی کیفیت کا ہونا ضروری ہے اس عالم میں اگر شعر خود بخود وارد ہو تو وہ آمد ہے لیکن ہمارے شاعر شعوری کوشش سے لفظوں کی نشست و بست کرتے ہیں اس کی مثال کاری گری کی ہے تخلیق کی نہیں۔

نعت گوئی میں ایک عیب تعلّی کا ہے۔ شاعر اپنی ذات کو اس قدر بلند، ارفع اور اعلیٰ بنا کر پیش کرتا ہے جس کا عام حالات میں سان و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ کوئی "شاعر دربار رسول" ہونے کا دعوے دار ہے کوئی حسان ثانی بنا بیٹھا ہے، کسی نے نعت کیا کہی کہ فرشتے اس کے نطق کے بوسے لینے لگے۔ اس وجدانی کیفیت میں جس میں شعر وارد ہوتے ہیں شعور ذات باقی ہی نہیں رہتا اگر باقی رہتا ہے تو وہ ہوش کی شاعری ہے جب شاعر شعور ذات سے غافل ہو جائے تب ہی آمد یا تخلیقی شاعری ہوتی ہے۔ زیر نظر کتابوں میں اس نوع کی رسمی یا آورد کی نعت گوئی پر جتنی سخت تنقید ہونی چاہیے تھی نہیں ملتی۔ رشید وارثی نے اپنے مضمون

"اردو نعت اور شاعرانہ تعلّی" مشمولہ "نعت رنگ" شمارہ (۸) میں اور مختار علیگ نے اپنی کتاب "سوءادب فی سوءادب" میں ناگوار تعلّی کی بے شمار مثالیں درج کی ہیں۔ یہ سب اس امر کی غماز ہیں کہ شعرا نے شہرت طلبی اور خود ستائی کی خاطر نعت جیسی مقدس اور پاکیزہ صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس رجحان کی جس قدر بھی حوصلہ شکنی کی جائے کم ہے۔

نعت گوئی میں ہندی شاعری کی روایات کا اضافہ جدت طرازی میں شمار ہوتا ہے لیکن نعت میں پاس ادب اور عظمت رسول پاک ﷺ کا جو خیال رکھنا چاہئے وہ ہندی روایت سے میل نہیں کھاتے۔ ہندی شاعری چاہے اس پر مذہبی ہونے کی چھاپ ہی کیوں نہ ہو اپنے مزاج کے لحاظ سے مجاز اور عشق مجاز کی شاعری ہے ہندو صنمیات میں اوتاروں کا حال بھی رومانی انداز میں بیان ہوا ہے اور ان میں جنسی تلذذ و چاشنی پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہ ایک انوکھا انداز ہے کہ جذبات عشق و محبت کا اظہار عورت کی طرف سے ہو لیکن رسول پاک ﷺ کے ساتھ عشق مجازی کے لوازمات کے ساتھ جذبات کا اظہار سوء ادب میں شمار ہوتا ہے۔ عشق رسول دراصل عقیدت رسول کی ایک شکل ہے۔ عقیدت و احترام کے بغیر ان سے محبت کا لگاؤ ان کی شان میں بے ادبی کے مترادف ہے۔ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق موضوع کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اسلام میں عشق نبی مرد و عورت دونوں کے لئے اصل ایمان ہے لیکن اسلامی شاعری میں عورت کی زبانی عشق کے اظہار کو ہمیشہ معیوب خیال کیا ہے۔"

> "_____ یوں نعت گو شاعرات نے بارگاہ نبوی ﷺ میں اظہار عقیدت کیا بھی تو عشقیہ مضامین سے وہ عام طور پر پرہیز کرتی رہیں اس لئے کہ اسلامی تمدن کے مذاق پر یہ چیز گراں گزرتی تھی"
>
> (ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق: اردو میں نعتیہ شاعری، کراچی ۱۹۷۶ء، ص ۱۱۳)

حیرت یہ ہے کہ اردو نعت گو شاعرات تو حضور ﷺ کے لئے عشق مجازی کے مضامین کو جنسی وارفتگی کے ساتھ بیان نہیں کرتیں لیکن مرد حضرات عورتوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اس انداز کو اختیار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق نے اس نوع کی شاعری کی توصیف نہ کرنے کے باوجود چند سطروں بعد ہی اس کی تعریف میں لکھ دیا ہے:

> "اس خدمت کو مرد شاعروں نے انجام دیا ہے اور حسن و خوبی اس سے عہدہ بر آء ہوئے چنانچہ ہم نعتیہ کلام میں کثرت سے اس رنگ کے مضامین پاتے ہیں۔ خاص طور پر نعت گو شعراء نے جو ٹھمریاں لکھیں وہ ان ملکی اثرات کی خوبی آئینہ داری کرتی ہیں۔ عشق نبی میں فراق اور بے قراری کے مضمون کا نمونہ درج ذیل

ہے۔" (ایضاً)

جو نمونہ کلام درج ہے اس میں حضور ﷺ کے لئے "طیبہ" کے رنگیلے بانکے" جیسے الفاظ بھی موجود ہیں اور پھر "نبی جی" پر واضح کیا جارہا ہے کہ

بالا پن اور چڑھی جوانی دونوں گئے برباد
"نوڑتے پن میں حرص بڑھی" تھی کیا قضا نے یاد

حمزہ، شائق اور عبدالقدیر حسرت اس طرز کے استاد بتائے گئے ہیں اور حد یہ ہے کہ حضرت امجد حیدر آبادی جیسے درویش کا کلام بھی اس عیب سے خالی نہیں۔ ان کی نظم "مدینہ کی جوگن" کی تعریف میں ہر کوئی رطب اللسان ہے اور کوئی یہ سوچنے پر تیار نہیں کہ اسلام میں "جوگن" کا تصور ہے بھی یا نہیں۔

اس انداز کی شاعری میں حضور ﷺ کے لئے پیا، دلربا، خوش ادا، رام نام والے، گردھا، بلما، عائشہ بی بی کے بالم پیارے" جیسے الفاظ فراوانی سے استعمال کئے گے ہیں ان کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق نے حضور ﷺ کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ "ہندی" اور "ہندستانی اثرات" کو بنیاد بنا کر توصیف کے ڈونگرے برسائے ہیں۔

نعت گوئی شاعری کا نازک مرحلہ ہوتا ہے اس میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے کہ کوئی بیان، کوئی اسلوب، کوئی لفظ شان رسالت کے بر خلاف نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس پر سخت تنقید جائز ہے۔ جن امور کا ذکر کیا گیا ان کے علاوہ حضور کے مرتبہ کو بڑھانے کے لئے دیگر انبیاء سے موازنہ کیا جاتا ہے اور ان کی شان میں گستاخی تک روا رکھی جاتی ہے حالانکہ ایک کی عظمت ثابت کرنے کے لئے دوسروں کی عظمت میں کمی کرنا ضروری نہیں۔ اردو نعت گوئی میں یہ رویہ عام ہے۔ اسی طرح معبود اور عبد کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا اور حضور ﷺ کی ذات پاک کو خداوند تعالیٰ کے برابر اور کبھی کبھی (معاذاللہ) بلند تر بتلایا جاتا ہے یہ رویہ بھی لائق تحسین نہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا گیا ہمارے ادبی محققین، ناقدین اور مصنفین ضرورت سے زیادہ رواداری کا ثبوت دیتے ہیں اس لئے وہ ناگوار مضامین یا اسالیب سے نظر بچا کر گزر جاتے ہیں یا ناجائز طور پر ان کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ تنقید کے معنی ستائش آمیز توصیف نہیں ہوتے انصاف پر مبنی احتساب کے ہوتے ہیں اور اس معاملہ میں چشم پوشی کا رویہ تمام مصنفین نے اپنایا ہے جو کسی طرح جائز نہیں۔

اردو نعت کے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پر مبنی کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد جو تاثرات قائم ہوئے ان کا سرسری اور اجمالی اظہار سطور ما قبل میں کیا گیا۔ اس مطالعہ سے قبل بھی کئی سوالات ذہن کو پریشان کرتے رہے جن کے جواب اس مطالعہ سے حاصل نہ ہو سکے بلکہ کئی نئے سوالات نے جنم لیا جن کو ممکنہ اختصار سے اپنی استعداد کے مطابق جواب کے ساتھ تحریر کر دیا گیا ہے۔ اس تحریر میں نہ کسی کو مخاصمانہ

تنقید کا نشانہ بنانا مقصود رہا اور نہ خواہ مخواہ اپنی علمیت کے سکے جمانے کی خواہش رہی۔ میری نظر میں اچھا طالب علم وہی ہوتا ہے جو تشکیک کی مرحلوں سے گذر کر یقین کی منزل تک پہنچتا ہے۔ میرے سوال میرے شکوک کو ظاہر کرتے ہیں۔

ایک عمومی تاثر کے اظہار کے بعد ان تمام کتب کا جائزہ لینا بھی ضروری قرار پاتا ہے جو اردو نعت کے موضوع پر تاریخی، تحقیقی، تنقیدی نقطہ نظر سے لکھے گئے ہیں۔

اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

اردو کی نعتیہ شاعری کے بارے میں شائع ہونے والی پہلی کتاب (ہماری معلومات کے مطابق) ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی ہے جو نہایت مختصر ہے اور صرف ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور جنوری ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی تھی حرف آغاز پر تاریخ ۱۹ر شوال المکرم ۱۳۹۳ھ درج ہے۔ مصنف کی صراحت کے مطابق:

> "تقریباً چھ سال ہوئے حضرت علامہ ارشد القادری صاحب مدظلہ نے اپنے رسالہ "جام نور" کے لئے مجھے "اردو کی نعتیہ شاعری" پر ایک مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ تعمیل ارشاد میں بہ عجلت ایک سرسری مضمون لکھ کر روانہ کر دیا جو شائع بھی ہو گیا مگر اس مضمون کی تشنگی کا احساس برابر ہوتا رہا۔ فرصت ملی تو اس مضمون کو کچھ بسط دینے کی کوشش کی جوں جوں لکھتا رہا اس قلزم ذخار و بحر ناپید اکنار کی وسعت کا اندازہ ہوا بالآخر اپنے عجز کے شدید احساس نے اس تحریر کو گویا نامکمل ختم کرنے پر مجبور کر دیا۔ احباب کے مشورہ و اصرار پر اب یہ سرمایہ کتابی شکل میں پیش ناظرین ہے۔" (ڈاکٹر طلحہ رضوی برق: حوالہ مذکورہ، ص ۴)

کتاب کیا ہے ایک مضمون کی تفصیلی شکل ہے۔ جو کتابی صورت میں شائع ہونے کے باوجود احساس دلاتی ہے کہ اسے ایک مضمون باور کرتے ہوئے پڑھا جائے۔ خود مصنف کو اعتراف ہے کہ وہ موضوع کی وسعت کے قائل ہیں لیکن اس کا جامع احاطہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کے باوجود کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ایک ایسے موضوع سخن پر جس کا رواج کئی صدیوں پر محیط ہے اور جس کی حیثیت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے اس کے تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی جائزے کی جانب توجہ کرنے کی کوشش تو کی گئی۔ اسے ہم ایک انفرادی کاوش کا نام دے کر گزر جانے کو ادبی بد دیانتی سمجھتے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ کتاب ایسی مدہم لو ہے جس سے خوب روشنی دینے والے چراغوں کو روشن کرنے کی روایت نے جنم لیا۔ اگر جامع اور بسیط کتاب منظر عام پر آجائے تو موضوع سے دلچسپی رکھنے اور اس پر اظہار خیال کرنے کا ولولہ محسوس کرنے والوں کے لئے لکھنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر ایسی صورت میں کوئی کوشش بھی

کرتا ہے تو وہ نقل ہی کرتا ہے البتہ ہنر مندی، فن کاری، خلوص نیت اور اپنی محدود صلاحیتوں اور وسائل کے باوجود قابل توجہ تحریر سامنے آتی ہے تو وہ شوق کو مہمیز کرتی ہے، لوگوں کو عزائم کی صورت دیتی ہے، خواہش تکمیل کار پر مائل کرتی ہے۔ جو کتاب موضوع سے دلچسپی پیدا کرے اور کام کو آگے بڑھانے کا حوصلہ عطا کرے اس کی اہمیت مابعد کی تکمیلی شکل سے کم نہیں ہوتی۔ اہل علم کے اور بعد کے لکھنے والوں نے ڈاکٹر طلحہ کی کتاب کا ذکر کیا ہو یا نہیں، اس سے مستفیض ہونے کا اقرار کیا ہو یا نہیں، علم کے جویا اور علم کے قدردان اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے ہوں گے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی کی شخصیت کو متعارف کروانے کی کوئی کوشش یا تو کی ہی نہیں گئی یا کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ میں اپنی اس کتاب کے ذریعہ پہچان پایا ہوں اور یہ کہنے میں حق جانب محسوس کرتا ہوں کہ وہ اہل علم بھی ہیں اور اہل جذب بھی اگر کسی رسالہ کے مدیر نے ان سے اردو نعت پر لکھنے کی فرمائش کی تو یقیناً وہ ان کے علمی مرتبہ اور بالغ النظری کے قائل رہے ہوں گے۔ ہم ان کے مرتبہ شناس ان کی تحریر سے ہوئے ہیں۔ وہ اردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر عبور رکھنے کی تحریری شہادت کے ساتھ کتاب میں جلوہ گر ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے کہ انہوں نے عربی، فارسی، دکنی، اردو نعتوں کا کمال واقفیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ موضوع کی وسعت کو دیکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے بیان کو پھیلانے کے بجائے سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ طوالت نگاری سے بچنے اور اختصار میں جامعیت کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر طلحہ رضوی اس کتاب کے ذریعہ محقق اور مبصر کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق عربی میں پہلا قصیدہ میمون بن قیس سے منسوب ہے اور عربی زبان کا شعری ادب نعتیہ شہ پاروں سے بھرا ہوا ہے۔ (ص ۷) انہوں نے مذکورہ زبانوں میں نعت کے مضامین کی وسعت کا بھی ذکر کیا ہے کیونکہ وہ معترف ہیں کہ ''ہیئتی طور پر بھی یہ صنف شاعری غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مربع، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، مستزاد حتیٰ کہ آزاد و معرا پیکروں میں بھی موجود ہے۔'' (ص ۵) یہ صرف دعویٰ نہیں اس کی شہادت کے طور پر انہوں نے کلام کے نمونے پیش کئے ہیں نعت کے موضوعات کو اختصار سے بیان کیا ہے تب بھی وہ دو صفحات (ص ۲۳، ۲۴) پر محیط ہیں۔ یہ ایسے عنوانات ہیں جو عام طور پر شعراء کے پیش نظر رہے۔ تخلیق کار کی بساط کے مطابق ان میں بے پایاں اضافہ کی گنجائش موجود ہے۔ مصنف نے بلحاظ ہیئت بھی نعت گوئی کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی۔ جب وہ تاریخ وار جائزہ لیتے ہیں تو ادوار کا تعین نہیں کرتے اور نہ ہر دور کی خصوصیات گنواتے ہیں۔ تحقیق کی روایت کے مطابق ان کا تاریخ وار جائزہ دکنی شعریات سے شروع ہوا ہے اور وہ بھی ہمارے ہم خیال ہیں کہ ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو اردو کی تصنیف شمار نہ کریں۔ انہوں نے واضح طور پر لکھا ہے کہ :

''دکن میں بہمنی دور حکومت کے شاعر فخر الدین نظامی کی مثنوی 'کدم راؤ

پدم راؤ" کا زمانہ تصنیف ۸۲۵ھ سے ۸۳۸ھ تک قیاس کیا جاتا ہے۔ اسے اردو
کی ابتدائی اور قدیم تر تصنیف کہا گیا ہے مگر حقیقتاً اس کی زبان ٹھیٹھ قسم کی ہندی
ہے۔ رسم الخط اور اردو میں مروجہ ایک دو لفظ کے ملنے سے اس زبان کو اردو کہنے
میں مجھے تامل ہے۔" (ص ۲۵)

ڈاکٹر طلحہ کو جس امر میں تامل ہے راقم الحروف کو بھی اس میں تامل ہے لیکن فی الحال یہ بحث کا موضوع نہیں ہے۔

دکنی شعریات کے حوالہ سے مصنف نے کئی مثنویوں کے حوالے دیئے ہیں جن میں نعت شامل ہے مثلاً اشرف (نوسرہار) خوب محمد چشتی (امواج خوبی، خوب ترنگ) ملاوجہی (قطب مشتری) نصرتی (علی نامہ) کی مثنویاں۔

انہوں نے مثنویوں کے بعد "معراج ناموں" پر روشنی ڈالی ہے جس کا دکن میں رواج عام تھا اور "معراج نامہ" کی مقبولیت نے اسے الگ سے ایک صنفی حیثیت عطا کر دی تھی یہاں تک کہ سیرت و اخلاق رسول کے بیان میں "نور نامے، مولود نامے اور وفات نامے نظم ہونے لگے اور اسے بھی بے حد مقبولیت حاصل ہوگئی" (ص ۲۹) اس تمہیدی بیان کے بعد انہوں نے تاریخی ترتیب میں معراج ناموں کا ذکر کیا ہے جن میں ہاشمی بیجاپوری، اعظم دکنی، محمد بن مجتبیٰ، شاہ کمال الدین، سید بلاقی، معظم بیجاپوری، مختار کچھی نرائن شفیق قرلی بیجاپوری، فتاحی کے معراج ناموں کا بالترتیب ذکر کیا ہے وہ فتاحی کو گیارہویں صدی ہجری کے آخر کا شاعر قرار دیتے ہوئے "مولود نامہ" کی ایجاد کا سہرا اس کے سر باندھتے ہیں۔ نعت کے لئے قصیدہ اور غزل کی شکل اس زمانہ میں رائج ہوئی "فدوی خاں فدوی اور میر محمد شریف مفتوں اورنگ آبادی نے غزل اور قصیدہ کے فارم میں نعت گوئی شروع کر دی" (ص ۳۲) جس دور میں دکن میں نعت کی مختلف ہیئتیں رائج ہی نہیں بلکہ مقبول بھی تھیں اس زمانہ میں شمالی ہند میں شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمونؔ، شاکر ناجی، محمد احسن احسنؔ، مصطفےٰ یکرنگ، سراج الدین آرزو، اشرف فغاںؔ شاعری کر رہے تھے ان سب کے کلام میں ڈھونڈنے سے نعتیہ اشعار مل جائیں گے مگر فنی طور پر اہل دکن کی طرح ان حضرات نے نعت گوئی نہیں کی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ شمالی ہند کی شاعری کو معیار قرار دے کر تاریخی اور تحقیقی کتابیں لکھی گئیں چونکہ وہاں نعت گوئی عام نہیں تھی اس لئے اس صنف کے ذکر سے اجتناب برتا گیا اور چونکہ نعت کی متعدد ہیئتوں سے شمالی ہند کے لوگ واقف نہیں تھے اس لئے ادبی تواریخ مولود ناموں، نور ناموں، معراج ناموں، وفات ناموں کے ذکر سے خالی ہیں۔ نعت کے موضوع پر جو کتابیں پچھلی ربع صدی میں منظر عام پر آئی ہیں ان میں بھی ڈاکٹر طلحہ کی طرح خاص توجہ سے ان اصناف کے بارے میں تحقیق سے گریز ملتا ہے۔

ڈاکٹر طلحہ نے دکنی شعریات کا بڑی حد تک احاطہ کیا ہے۔ شاعروں کے مختصر احوال کے ساتھ

نعتیہ اشعار کے نمونے بھی پیش کئے ہیں مگر تنقید و تبصرہ سے گریز کیا ہے۔ اس طرح ان کی کتاب کے اکثر حصے تذکرہ نگاری کے وصف سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔

شمالی ہند میں پہلے قابل ذکر نعت گو کی حیثیت سے مصنف نے سودا کا ذکر کیا جن کا ۱۴۸ اشعار پر مشتمل قصیدہ مشہور ہے۔ "اس قصیدے کو شمالی ہند میں اردو کی نعتیہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ قصیدے کی شان، الفاظ کا شکوہ اور بیان کا زور ایک ایک شعر سے ظاہر ہے۔" (ص ۳۴، ۳۵)

مصحفی کے استادانہ رنگ کے قصائد کے بعد سب سے جاندار اور شاندار نعت نظیر اکبر آبادی کی ہے جو خمسہ کی صورت میں ہے، نعت کیا ہے جذبات اور ہم آہنگ الفاظ کا بہتا دریا ہے۔ ڈاکٹر طلحہ نے انہیں زبردست خراج تحسین دے کر حق شناسی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ انہوں نے اس کے بعد کے ادوار کا جائزہ لیتے ہوئے کسی قابل ذکر شاعر کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ نعت گو کی حیثیت سے دیگر مصنفین نے حسرت موہانی اور جوش ملیح آبادی کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ ڈاکٹر طلحہ ان کو بھی اس صنف کے خدمت گزاروں میں شامل کرتے ہیں۔ جوش کی نعت گوئی کے بارے میں ان کا تبصرہ وہی ہے جو مجموعی طور پر جوش کی شاعری پر کیا جا سکتا ہے۔ یعنی:

> "جوش ملیح آبادی اپنے اسلوب و آہنگ کے لحاظ سے منفرد ہیں مگر ان کے یہاں لفظوں کے طمطراق، شوکت الفاظ، زور بیان اور علوئے تخیل میں گداختگی، قلب میں رقت جذبات کا دور دور پتہ نہیں۔ نعت رسول میں عقیدت و عبدیت کی گھلاوت طرہ امتیاز سمجھی گئی ہے جوش کی نعتیں محض رسم شاعری کے طور پر لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔" (ص ۶۷)

یہ تبصرہ اس وقت کیا گیا جب جوش نے نعت گوئی سے رجوع نہیں کیا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں ان کی بہن کے داماد مائل ملیح آبادی ان سے ملاقات کی غرض سے اسلام آباد تشریف لائے تھے۔ انہوں نے جوش سے کہا تھا کہ

> "آپ کے کلام پر تنقید و تحقیق کرنے والا آپ کے نعتیہ کلام اور مجموعہ مراثی اور منقبت حضرت علی و شہیدان کربلا پر اپنی رائے دے گا تو آپ کو ایک دین دار اور سچا مسلمان ثابت کر کے چھوڑے گا۔" جوش نے جواب دیا "کیا وہ یہ نہیں سوچے گا کہ وہ میرے بالغ ہونے سے پہلے کا کلام ہے۔"

(مائل ملیح آبادی: کتاب "جوش دیار دکن میں" مطبوعہ لکھنؤ، جون ۱۹۸۴ء، ص ۹۸)

غالباً اس بیان کی معنویت سے دیگر مصنفین و محققین ذاتی طور پر واقف تھے۔ کسی نے بھی جوش کی نعتیہ شاعری کو موضوع بحث بنانا گوارہ نہیں کیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہر شاعر کو جس نے رسماً اور روایتاً یا اظہار ہنر کی خاطر دو ایک نعتیں کہی ہوں تو ان کے حسن و قبح کو لائق اعتنا سمجھا جائے۔ اگر نعت کہنے کا مقصد محض شہرت طلبی اور اظہار ہنر مندی سے قاری یا سامع کو مرعوب کرنا مقصود ہو اور اس کی شاعری مجموعی طور پر اس خلوص سے خالی ہو تو اس کا ذکر کرنا بذات خود معیوب ہے۔ یہ بات باعث اطمینان ہے کہ دیگر محققین نے جوش کی دہریت اور خدا سے لاتعلقی کو ذہن میں رکھا اور ان کے ذکر سے اس پاک موضوع پر داغ نہیں لگایا۔

ڈاکٹر طلحہ نے دور جدید کی نعت گوئی کا احاطہ موجودہ صدی کے نصف اول تک کیا ہے ان میں وہ اختر شیرانی کی نعتوں کو ان کی عشقیہ شاعری سے زیادہ وقیع مانتے ہیں۔ (ص ۷۵) دیگر شعراء میں عبدالحمید عدم، عندلیب شادانی، نازش پرتاب گڑھی، شکیل بدایونی، عبدالعزیز عمیق حنفی، بھگوان داس، جگن ناتھ آزاد اور بعض دیگر غیر مسلم شعراء کی نعتوں پر تبصرے کیے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ان میں سب سے زیادہ عبدالعزیز خالد کی نعت گوئی بلکہ ان کی علمیت اور قوت اظہار سے زیادہ متاثر ہیں۔

اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی کا تبصرہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

> "اردو کی نعتیہ شاعری پر تنقیدی و تحقیقی جائزے کے حوالہ سے اردو نعت کا یہ معتبر مطالعہ ہے جو اپنے اندر اختصار کے ساتھ جامعیت بھی رکھتا ہے۔"
>
> (حوالہ مضمون : "اردو میں مطالعات نعت" مشمولہ اُوج نعت نمبر، جلد ۲، مطبوعہ ۱۹۹۲ء لاہور، ص ۷۰۷)

حسب روایت نعتیہ کلام میں کبھی کبھی ایسے اشعار بھی آجاتے ہیں کہ ان کو اس نعت سے الگ کر کے پڑھا جائے تو وہ عام غزل کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں نعت سے متعلق ہونے کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اگرچہ یہ عیب نہیں لیکن احتیاط کا تقاضہ ہے کہ ایسا نہ ہو تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر طلحہ نے ان اشعار کو توصیف کے ساتھ جگہ دی ہے جو مناسب نہیں ہے۔

رہ کے دریا ہی میں رہ سکتا ہے قطرے کا وجود	ملتی ہے شاخوں ہی میں برگ و ثمر کو زندگی
تم جو ہو سب کچھ ہے ورنہ تم نہیں تو کچھ نہیں	گھر کے مالک سے ملا کرتی ہے گھر کو زندگی

(ص ۷۰)

کیا کہوں فرقت میں کیسا حاصل اپنا ہوئے ہے	روز ان اشکوں کا جاری ایک دریا ہوئے ہے
بیچ جو ہر کے ترے گیسو کا سودا ہوئے ہے	گھر سی باہر نکل صحرا بھرا ہوئے ہے

(ص ۹۰)

نہ رکھو ہجر میں بیمار مجھ کو پلا دو شربت دیدار مجھ کو (ص ۹۱)

اپنے پلے کوئی سوغات نہیں اس کے سوا　　نقد جاں نذر کر اے دل یہی دستور ہے آج
(ص ۶۳)

سراپا حسن بن جاتا ہے جس کے حسن کا عاشق　　بھلا اے دل حسیں ایسا بھی ہے کوئی حسینوں میں
(ص ۵۹)

اسی طرح نمونہ کلام میں ایسے اشعار توصیفی انداز میں نقل ہوئے ہیں جو اقدار اسلامی کے خلاف ہیں۔ شاعر کا نام چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو بغیر احتسابی نظر ڈالے ہر شعر کو لائق توصیف قرار دینا بھی زیادتی ہے اور اس کا حوالہ دینا بھی زیادتی ہے۔ ہمارے خیال میں حسب ذیل اشعار کے لئے توصیفی کلمات نہیں کہے جاسکتے۔

میرے شعروں میں جلوہ شاہد معنی کا پیدا ہے　　نظر آتا ہے لفظوں کا فقط ہلکا سا اک پردا
(ص ۵۶)

وہ رخ آئینہ وحدت نما معلوم ہوتا ہے　　نبی کو دیکھتا ہوں اور خدا معلوم ہوتا ہے
(ص ۶۹)

عربی نعت کے مطالعہ کے بعد اردو کی قدیم نعت زیر بحث لائی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ قیام پاکستان اور اس کے بعد کی نعتیہ شاعری کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ دور جدید میں اگرچہ پاکستانی شعراء کی نعتیہ شاعری کا تفصیلی ذکر ہے تاہم بھارت کے نعت گو شعراء کا کلام بھی زیر نظر رہا ہے۔

> "۔۔۔۔۔ کتاب کو اردو نعت کا ایک تفصیلی و جامع جائزہ تو قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن مطالعہ نعت کے حوالہ سے مطبوعہ کتب میں اسے جو اولیت کا اعزاز حاصل ہے وہ کسی اور کتاب کے حصہ میں نہیں آیا۔"
> (ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی: مضمون اردو میں مطالعات نعت مشمولہ رسالہ اوج، نعت نمبر ۲: لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۷۰۷)

اردو کی نعتیہ شاعری　از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

اردو نعت کے حوالہ سے لکھی گئی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" وسیع حلقوں میں متعارف ہوئی ہے۔ جبکہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی کتاب نسبتاً کم معروف رہی بالخصوص پاکستانی حلقوں میں بھارتی مطبوعات کی آسانی سے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے پاکستان کے اہل قلم حضرت نے ڈاکٹر فرمان کی اس کتاب کو اولین ہونے کا اعزاز بخشا۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو یہ پاکستانی ادب میں نعت کے

موضوع پر نقش اول ہے اور یہ اعزاز بھی کچھ کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر طلحہ کی کتاب کی طرح اس کو بھی ایک مضمون قرار دیا جا سکتا ہے ہمارے پیش نظر اس کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ۱۹۹۸ء میں طبع ہوا جبکہ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء کا مطبوعہ ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں جملہ ۲۰۸ صفحات ہیں ان میں صفحہ ۱۱۶ سے آخر تک تبرکات کے عنوان سے نعتوں کا انتخاب ہے۔ نعت کے موضوع پر صفحہ ۲۰ سے ۱۱۸، لگ بھگ ۹۸ صفحات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس میں سے بھی عربی و فارسی نعت کے حوالہ سے تقریباً ۱۰ صفحات مختص کئے گئے ہیں جن صفحات میں اردو نعت کا جائزہ لیا گیا ہے وہ موضوع کی وسعت کی نسبت کم معلوم ہوتے ہیں اور معلومات کے لحاظ سے تشنہ ہیں۔ اسے ایک اچھے مضمون کی کوشش قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی بھی ہمارے خیال سے اتفاق کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے:

"پاکستان میں مطالعات نعت کے حوالہ سے شائع ہونے والی یہ اولین کتاب ہے جس میں نعت اور اردو نعت کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب نے ۹۹ صفحات پر مشتمل مضمون بعنوان "نعت ایک صنف سخن کی حیثیت سے" تحریر کیا ہے جس میں نعت، مضمون، ہیئت، موضوع، عربی نعت اور اس کی صورتیں، حقیقی نعت گوئی، تاریخ وارتقاء اور دیگر مباحث پر بحث کی گئی ہے۔"

(ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی، مضمون "اردو میں مطالعات نعت" مشمولہ رسالہ اوج، نعت نمبر جلد ۲، ۱۹۹۳ء ص ۷۰۷)

ڈاکٹر فرمان نے خود اعتراف کیا ہے کہ:

"میں اعتراف کرتا چلوں کہ میری کتاب نعتیہ شاعری کے موضوع پر کوئی محققانہ کتاب نہیں۔ اسے آپ اردو کی نعتیہ شاعری کی تاریخ بھی نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ اس میں نعتیہ شاعری کے سارے ادوار و افراد اور احوال و آثار کی تفصیل تاریخ وار یا بلحاظ سنین درج نہیں ہے۔ یہ نعت گو شعراء کا تذکرہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ اس میں سارے شاعروں کا ذکر نہیں چند کا ذکر آیا ہے یہ اردو کی نعتیہ شاعری پر جامع تنقیدی تصنیف بھی نہیں ہے بلکہ زیر نظر کتاب اردو کی نعتیہ شاعری کا ایک سرسری مبصرانہ جائزہ ہے۔" (ص ۱۲)

کسی سرسری جائزہ کو اگر ہم ایک مضمون قرار دیں تو نامناسب نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی وجہ سے موضوع متعارف ہی نہیں ہوا بلکہ اس نے شعری ادبیات کی ایک صنف کی جانب توجہ مبذول کرنے کا تقاضہ بھی کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ارباب علم وادب کے لئے

دعوتِ فکر ثابت ہوئی اور وہ صنف جو صدیوں سے تعارف، تحقیق، تنقید کی متقاضی تھی اس طرح توجہ کا مرکز بنی کہ ربع صدی سے کم عرصہ میں (ہماری معلومات کے مطابق) آٹھ کتابیں، سیکڑوں مضامین اور رسائل کے درجنوں خصوصی نمبر شائع ہوئے۔

ابتداء میں ڈاکٹر فرمان نے "نعت ایک صنف سخن کی حیثیت سے" کے زیر عنوان اس کی شاعرانہ حیثیت کے تعین کی کوشش ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

> "نعت کا لفظ شاعری کی کسی ہیئت کی طرف نہیں بلکہ صرف موضوع کی جانب اشارہ کرتا ہے یعنی شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، قطعہ یا مسدس و مخمس وغیرہ میں سے کسی بھی ہیئت میں نعت کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے موضوع سے انحراف یا تجاوز نہیں کیا جاسکتا۔" (ص ۲۱)

ڈاکٹر فرمان نے "ہیئت" کا لفظ استعمال کر کے ابہام پیدا کر دیا ہے۔ بات واضح نہیں کہ انہوں نے ہیئت کو صنف سخن کے معنوں میں استعمال کیا ہے یا نہیں اور اگر صنف کے معنوں میں نہیں ہے تو اس میں اور کتاب کے اس حصہ کے عنوان میں تضاد نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہ ایک قدیم روایت اور طریقہ کار ہے کہ ہیئت سے صنف متعین کی جاتی ہے وقت کے ساتھ تجربات کے تنوع کے مطابق سابقہ روش میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے اس لئے صنف سخن کا تعین ہیئت کے ماسوا موضوع سخن کے لحاظ سے بھی کیا جاسکتا ہے اس میں اعتراض کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ مرثیہ کی اصطلاح عام ہے۔ اس کا رواج صنف سخن کے لئے ہی کیا جاتا ہے۔ اسی طرح "نعت" ایک اصطلاح بن چکی ہے جس سے موضوع کی طرف خاص صنف سخن مراد لی جاتی ہے۔ بہر حال یہ امر بحث طلب ہے جبکہ خواص اور عوام نعت کو صنف سخن تسلیم کر چکے ہیں۔ ان کا تسلیم شدہ امر ہر عالم، ادیب، محقق، مصنف، نقاد اور شاعر سے افضل تر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے خاص ادبی حلقے کے ذہنی تحفظات پر مبنی خیال کی نشاندہی کی ہے انہوں نے لکھا ہے کہ

> "بد قسمتی یہ ہے کہ ہماری نعتیہ شاعری یا ایسی شاعری جس کے موضوع کا متن اسلام یا اسلامی اقدار و روایات سے ہو کچھ زیادہ لائق پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا۔ اول ان اقدار کی متحمل نظموں کو مذہب، اخلاقیات اور تاریخ کا منظوم درس خیال کر کے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور اگر بے دلی و تنگ نظری کے ساتھ کسی نے اس پر توجہ کی تو ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر موضوعاتی شاعری کا نام دے کر انہیں بے وقعت اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے ناقدین کے نزدیک موضوعاتی شاعری بہ حیثیت

مجموعی خارجی واقعات سے اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق
رکھتی ہے۔" (ص ۲۳)

ڈاکٹر فرمان کا بیان قطعی غیر واضح ہے کوئی خیال یا نظریہ محض "نقادوں" کے حوالہ سے کہہ دینا ناکافی ہے۔ آخر یہ نقاد ہیں کون ؟ان کے نام، نشان کا کوئی حال نہیں معلوم !وہ ادب میں کسی حد تک معتبر ہیں۔ کس دبستان نقد سے تعلق رکھتے ہیں ؟ان کی اپنی کوئی فکر ہے یا وہ خیالات کے معاملہ میں بھی کاسہ ئسر لئے غیروں سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان کے ایک حصہ سے کہ نقادان فن مذہبی شاعری کا نام سن کر بھڑک جاتے ہیں اس اعتبار سے غلط نہیں کہ جن کے ضمیر ماسکو میں رہن ہیں، جن کے دماغوں پر برہنائے کم علمی مذہب کے بارے میں معلومات صفر ہیں اور جن کے دماغ پر کسی خاص ازم کی دھول جمی ہوئی ہے وہ مذہب کی ضرورت اور اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ وہ مذہب اور مذہبی اقدار کے دشمن ہیں۔ ایسے دشمن کہ ان کا ہر حربہ بومیرنگ (Boomerang) بن کر ان کے منہ پر آگرتا ہے ان کے منہ لگنا یا ان کی ناسمجھی کو وزن دینا غلطی ہے اور پھر ایسے خود ساختہ نیم خواندہ افراد کے افکار چند برسوں قبل کی بات ہے مذہبی لٹریچر تو صدیوں پرانی روایت ہے۔ اردو ادبیات کا آغاز ہی مذہبی لٹریچر سے ہوا اور صدیوں یہ عمل بلامزاحمت جاری رہا ہے۔ موجودہ صدی کی دوسری دہائی میں اڑنے والی سرخ دھول کے اثرات کوئی زیادہ پرانی بات نہیں۔ اگر ڈاکٹر صاحب سابقہ صدیوں کے حوالہ سے مذہب دشمنی کی مثالیں دیتے تو ان کے وجوہ واسباب پر غور کر کے جواب دیا جاتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ادبی نقاد اور تاریخ نگار "اہل علم" کے اس طبقے سے تعلق رکھتے نہیں جن کا علم محدود اور ذہنی تحفظات پر مبنی ہے۔ وہ غلط روایات کی لکیر پیٹنے والے ہیں "اجتہاد" ان کے ضمیر میں نہیں ہے۔

ڈاکٹر فرمان کے بیان کے دوسرے حصے کا تعلق موضوعاتی شاعری اور غیر موضوعاتی شاعری سے ہے۔ اس معاملہ میں بھی کچھ غلط مبحث ہو گئی ہے۔ یہ مفروضہ غلط ہے کہ موضوعاتی شاعری بہ حیثیت مجموعی خارجی واقعات سے اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق رکھتی ہے اس کا اطلاق ہر نوع اور ہر صنف پر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تو شاعر کا وہ وصف ہے جس سے وہ موضوع کو برتتا ہے۔ معلوم حقائق کے Treatment میں بھی وہ لطف، دلچسپی، اثر اور نیا پن پیدا کیا جا سکتا ہے جو داخلی نوعیت کے اوصاف سمجھے جاتے ہیں۔ میرے اس تبصرے پر کوئی برا نہ مانے کہ مباحث کا یہ حصہ کلاس روم لکچر کا انداز لئے ہوئے ہے جو نیم پختہ ذہنوں کو تو متاثر کر سکتا ہے انفرادی سوچ کے حامل لوگوں کے لئے یہ چیستاں کے سوا کچھ نہیں۔ ڈاکٹر فرمان کی حد تک یہ ان کے پروفیسر ہونے کی مجبوری ہے۔

دوسرے باب میں عربی نعت گوئی پر سرسری اور فارسی نعت گوئی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو فارسی زبان وادب سے خاص شغف ہے۔ وہ اس حقیقت کا بھی اظہار کرتے ہیں

کہ اردو نعت گوئی عربی سے زیادہ فارسی سے متاثر ہے۔ (ص ۳۲) اس پر امیر خسرو (ص ۳۴) اور جامی و قدسی (ص ۳۵) کے گہرے اثرات ہیں لیکن ان اثرات کی نشاندہی نہیں فرمائی ہے۔

تیسرے باب میں نعت گوئی کے اسباب، محرکات اور مقبولیت کے عناصر سے بحث کی ہے جن میں سب سے اہم محرک حصول ثواب کی خواہش ہے۔ محافل میلاد، محافل سماع، سیرت النبی کے جلسہ اس کی ضرورت رہے ہیں۔

تمہیدی مباحث سے گذر کر ڈاکٹر فرمان اردو نعت گوئی کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو تمام قابل ذکر شعراء کے احوال اور ان کی نعت گوئی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے اردو اشعار کم اور فارسی اشعار زیادہ بطور حوالہ دیتے ہیں۔

انہوں نے قدیم ادبی و شعری سرمایہ جس کا دکن سے تعلق ہے نظر انداز کرتے ہوئے شہیدی اور شہید سے اردو نعت گوئی کا آغاز کیا ہے کیونکہ ان کے خیال میں :

> "پرانے شعراء میں صرف دو نام ایسے ملتے ہیں جن کی بدولت نعت گوئی کا معیار "قدرے بلند" ہوا ہے میری مراد کرامت علی شہیدی اور غلام امام شہید سے ہے۔" (ص ۵۲)

گویا ان کے ذوق سلیم نے باور کروادیا ہے کہ شہیدی اور شہید سے قبل نعت گوئی کا معیار انتہائی کمتر تھا جو اس لائق بھی نہیں تھا کہ اس کا ذکر کیا جاتا۔ چار سو سال کی تاریخ کو حرف غلط کی طرح منسوخ کر کے مصنف نے "قدرے بلند معیار کی نعت" سوا سو سال تک محدود کر دی ہے۔

ہم اس بیان کی تکذیب کرنے کی جسارت تو نہیں کر سکتے لیکن کیا برا تھا کہ ڈاکٹر فرمان اس دفتر بے معنی کی مثالیں پیش کر کے اس کے غیر معیاری ہونے کو ثابت کرتے اور قاری کو اپنا ہم خیال بناتے۔ ادب و تنقید میں حسن و قبح دونوں کا مفصل و مدلل تجزیہ ہونا چاہئے کسی کے حکم لگانے سے ساری تاریخ پر خط تنسیخ نہیں پھیرا جا سکتا۔ مستزاد یہ کہ جن سے نعت کا معیار "قدرے بلند" ہوا ہے ان کے وصف خاص کے بارے میں بھی وہ خاموش ہیں اور چار چھ اشعار نقل کر دینے کو کافی سمجھتے ہیں۔ کرامت علی خان کے وصف شاعری کے حوالہ سے ایک جملہ بھی نہیں۔ جبکہ شہید کے ذکر کے ساتھ ان کے فارسی کلام سے اقتباسات دیئے گئے ہیں اردو نعت گوئی میں ان کے حوالوں کا محل کس طرح بنتا ہے اور پھر تبصرہ کا یہ انداز اختیار کیا ہے کہ فارسی اشعار نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

> "زبان و بیان کی یہی شگفتگی اور قادر الکلامی کی یہی شان ان کے یہاں اردو میں بھی نظر آتی ہے۔ چھوٹی بحر ہو یا بڑی دونوں میں ان کی طبیعت دریا کی طرح بہتی ہے۔" (ص ۵۳)

یہ اور ایسے ہی تبصرے کتاب میں جابجا ملیں گے جو ممکن ہے فارسی داں طبقہ کے لئے سامانِ انبساط اور معلومات گراں بہا فراہم کریں۔ خاص اردو دانٔ طبقہ بچارہ اردو نعت کے ہنر د عیب تلاش کرتا رہ جاتا ہے اور اس کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ صفحات ماقبل میں بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ اقبال کی نعت گوئی کے ضمن میں پچاس سے زائد فارسی اشعار بطور نمونہ درج ہیں جبکہ ان کے اردو اشعار کی تعداد درجن بھر بھی نہیں ہے جب ہمارے علماء ادب فارسی کے بغیر لقمہ نہیں توڑتے تو نئی نسل پر کیا اعتراض کیا جائے کہ وہ انگریزی میں اردو بولتے ہیں۔

اردو نعت کے معیار کو "قدرے بلند کرنے والے" شہیدی اور شہید کے دور کے بعد ڈاکٹر فرمان نے اس کے "مقبول ترین" اور "کامیاب ترین دور" کا ذکر کیا ہے جس میں محسن کاکوروی اور امیر مینائی کے نام گنائے ہیں ان دونوں نے کمال فن کا مظاہرہ قصیدوں اور مثنویوں میں کیا ہے (ص ۵۵) ڈاکٹر فرمان کی تحقیق کے مطابق محسن کا پہلا قصیدہ "گلدستہ رحمت" ہے جو ۱۲۵۸ھ م ۱۸۴۲ء میں تصنیف ہوا تھا جبکہ ان کی عمر سولہ سال تھی۔ "گلدستہ رحمت" کے علاوہ ان کے قصائد "ابیات نعت" "مدیح خیر المرسلین" "نظم دل افروز" اور "انیس آخرت" گنوائے گئے ہیں۔ ان میں خصوصیت سے مدیح خیر المرسلین کی تعریف و توصیف بھی کی گئی ہے اور اس کے مضامین کا دفاع بھی کیا گیا ہے۔ اس قصیدہ کو عام طور پر محسن کے "قصیدہ لامیہ" سے موسوم کیا جاتا ہے جس کی تشبیب میں خاص ہندوستانی رنگ چھایا ہوا ہے، برسات کا موسم، اس کے اثرات، ہندوانہ ماحول، ہندوانہ رسم و رواج، ہندوؤں کی مذہبی تقریبات، تہوار، ہندی صنمیات، تشبیہات اور اشارے، مقامی تہذیب کی رنگارنگی، دلفریبی اور دل موہ لینے والی کیفیت، غرض سارے کا سارا ماحول ہندوانہ یا ہندوستانی ہے۔ یہ تشبیب ہمیشہ متنازعہ رہی ہے لیکن اس کے دفاع میں ایک بات تو یہ کہی جاتی ہے کہ عربی روایات کے مطابق تشبیب میں کوئی قید نہیں ہر طرح کے دلفریب مضامین کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ اس لئے عشقیہ مضامین بھی پوری بے تکلفی سے بیان ہوتے رہے ہیں۔ اس صورت حال میں ہندوانہ روایات اور صنمیات کے حوالہ سے بات کیوں نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا نقطہ یہ پیدا کیا جاتا ہے اس طرح تشبیب کے ذریعہ کفر و الحاد سے اسلام اور ایمان کی طرف رخ کیا گیا ہے گویا قصیدہ اول الذکر کی نفی اور ثانی الذکر کے اثبات میں ہے۔ ڈاکٹر فرمان کا استدلال بھی یہی ہے اور انہوں نے اپنے خیال کی تائید میں امیر مینائی کا بیان معترضین کے جواب میں نقل کیا ہے۔ (ص ۶۰) ڈاکٹر فرمان ہی نہیں ان کے بعد کے لکھنے والوں نے بھی اس قصیدہ کی تعریف کی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیا جائے۔

بلاشبہ تشبیب میں ہر قسم کے دل خوش کن مضامین کو جگہ دی جا سکتی ہے اگر محسن نے ہندوستانی روایات اور کیفیات کو جگہ دی تو برا نہیں کیا لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ شعر کس کے لئے کہا جاتا ہے۔ شاعری شعر گوئی اس کی اپنی ذات کے لئے ہے تو وہ جو چاہے کہہ لے۔ اگر شاعری ذریعہ ابلاغ ہے اگر شاعر قاری اور

سامع سے کچھ کہنا چاہتا ہے تو اس کے حدودِ ادراک میں رہ کر کے عمومی ذہنی سطح سے بلند ہو کر کہنے سے ابلاغ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ دوسری بات یہ کہ شعر کسی خاص زمانہ کے لئے ہو تو اس کی قدر وقتی اور عارضی ہوتی ہے اچھی اور بڑی شاعری وہ ہے جس کی قدر ہر زمانہ اور ہر جگہ ہو جو اسی وقت ممکن ہے جب وہ ہر زمانہ میں شوق اور ذوق سے پڑھی جائے اور وسیع پیمانے پر سمجھی جائے۔ محسن کاکوروی کے قصیدہ کی تشبیب کا وہ حصہ جو ہندو صنمیات کی تلمیحات اور اشاروں پر مبنی ہے نعت سے شغف رکھنے والوں کے ایک محدود طبقہ کے لئے نیا نہیں ہوگا۔ برصغیر جنوبی ایشیا کے خاص علاقوں میں اس کے سمجھنے والے ملیں گے۔ مسلم معاشرہ کے بیشتر افراد اس سے ناواقف ہیں بالخصوص برصغیر کی تقسیم کے بعد وہ قطعات زمیں جو ہندو تہذیب، معاشرت اور مذہب سے دور ہو گئے ہیں ان کے لئے صنمیات والا حصہ بالکل اجنبی ہوگا گویا قصیدوں کے تشبیب کی دائمی قدر باقی نہیں رہی اور پھر جس رومانی انداز سے اس تشبیب کی تشکیل و تعمیر ہوئی ہے اس کے سحر سے نکلنا آسان نہیں۔ جب تشبیب قاری و سامع کے ذہن کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لے اس سے گزر کر متضاد نوعیت کی مدح کی طرف رجوع کرنا آسان نہیں۔ ذہن کو تشبیب کے سحر سے آزاد کرنے کے لئے جو پراثر گریز ہونا چاہئے تھا وہ موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر فرمان، ڈاکٹر اشفاق، فضل فتح پوری، آزاد فتح پوری اس ماحول سے آشنا ہوں تو ہوں موجودہ دور کے پاکستانی نعت گو اور نعت گوئی کے مبصروں کے لئے محسن کاکوروی کا قصیدہ ایک اجنبی فضا کو پیش کرتا ہے جس میں مقامی اور وقتی قدروں کے سوا کچھ نہیں۔ سطور بالا میں یہ شک ظاہر کیا گیا ہے کہ محسن کاکوروی کا لامیہ قصیدہ عام قاری و سامع کے لئے نہیں بلکہ یا تو خود ان کے لئے یا خواص کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس کے موضوعات، تشبیہات، تلمیحات اور استعاروں کے عام فہم ہونے میں شبہ ہے جب مفہوم فہم سے بالاتر ہے تو وہ اس کا اثر دل پر کیا ہوگا؟ حسرت موہانی نے فن کے اعتبار سے کامل لیکن اثر سے خالی کلام کے لئے "ماہرانہ" یا "استادانہ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ محسن کے قصیدے پر بڑی حد تک اور احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے دو ایک قصیدوں پر اور عبدالعزیز خالد کے تمام تر کلام پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ فاضل بریلوی کے قصائد مہتمم بالشان ہیں، نہایت اعلیٰ درجہ کے عالمانہ ہیں کیونکہ وہ خود جید عالم تھے۔ ان کو قرآن اور حدیث کے مضامین پر کامل عبور تھا۔ عربی بھی خوب جانتے ہیں۔ اپنی شخصیت کی تمام خصوصیات کو مجتمع کر کے شعر کے سانچے میں سمو دینے کے فن سے واقف تھے لیکن وہ جس ذہنی، روحانی سطح پر فائز رہ کر شعر کہتے تھے وہاں تک رسائی عام پڑھے لکھے افراد کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر فرمان ہی نے نہیں سب اہل علم و اہل قلم حضرات نے ان کی نعت گوئی کی تعریف کی ہے اور جا طور پر کی ہے لیکن عام آدمی کے لئے نہ ہونے کے سبب انہیں وہ مقبولیت حاصل نہیں جس کے مستحق ان کے نعتیہ اشعار ہیں۔ کم و بیش یہی حال دورِ جدید کے شاعر عبدالعزیز خالد کا ہے۔ یہ تینوں شاعر محسن، فاضل بریلوی اور خالد یا تو اپنے لئے شعر کہتے ہیں یا خاص حلقے کے لئے۔

ان کا موازنہ حالی کے نعتیہ کلام سے کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ مقبولیت عوام کے عناصر حالی کے ہاں زیادہ ہے۔

ڈاکٹر فرمان نے محسن کے قصائد کے علاوہ ان کی مثنویوں کی بھی تعریف کی ہے جن میں "صبح تجلی" اور "چراغ کعبہ" شامل ہیں۔ اول الذکر کا موضوع حضور ﷺ کی ولادت اور ثانی الذکر کا معراج ہے۔ چونکہ یہ تصانیف ایک ایسے شاعر کی ہیں جو مصنف کا ممدوح ہے اس لئے اس کے ذکر کرنے اور نمونے کے اشعار پیش کرنے ہی کو توصیف کا حق ادا کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا ہے۔ حالانکہ ولادت ناموں اور معراج ناموں کی اردو میں کثرت ہے۔ ممکن ہے مصنف کی نظر میں ان کا معیار اتنا کم ہو کہ وہ ان کے ذکر سے اجتناب برت گئے۔ حیثیت ایک مبصر ضروری تھا کہ نعت کی ان شاخوں کے حوالہ سے مفصل بحث کی جاتی اور ان میں زبان اور بیان کی اگر خامیاں یا کمزوریاں ہیں تو ان کی نشاندہی کی جاتی اور محسن کے کلام سے موازنہ کیا جاتا۔ اب تبصرہ کا یہ انداز رواج پاتا جا رہا ہے کہ اسے اپنی پسند اور اپنی معلومات تک محدود رکھا جائے۔ ڈاکٹر فرمان کا رویہ یہی ہے۔

ہم اردو کے نعت گو شعراء کی تقسیم یوں کر سکتے ہیں :

ایک طبقہ میں وہ شعراء شامل ہوتے ہیں جنہوں نے مذہبی لٹریچر کے سوا کسی اور قسم کی جانب توجہ نہیں کی اور مذہبی موضوعات پر طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ نعت گوئی بھی کی اگرچہ ان کی تعداد محدود ہے محسن کا تعلق اسی طبقے سے ہے۔

دوسرے طبقہ میں وہ شعراء آتے ہیں جنہوں نے دیگر نوعیت کی شاعری کی اور ساتھ ہی نعت گوئی پر اتنی توجہ کی کہ وہ اس کے حوالہ سے پہچانے جانے لگے۔ امیر مینائی کا شمار اسی طبقہ میں ہوتا ہے۔

تیسرے طبقہ میں وہ شعراء آتے ہیں جو رسماً نعت گوئی کرتے ہیں جن کے کلام میں یہ پاکیزہ ذخیرہ برائے نام یا نہ ہونے کے برابر ہے ان میں حضور ﷺ کے عقیدت مند کم اور شہرت طلب زیادہ ہیں۔ ڈاکٹر فرمان یا کسی دوسرے اہل علم نے اس تقسیم کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔

محسن کے بعد امیر مینائی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں قصیدہ اور نعتیہ غزلوں کی خصوصیات الگ الگ بتلائی گئی ہیں۔ قصائد کے بارے میں لکھتے ہیں :

> "قصائد عام طور پر مشکل زمینوں میں کہے گئے ہیں اور امیر مینائی کی قادر الکلامی و زبان دانی کا سکہ بٹھاتے ہیں۔ قصیدہ نگاری کے لوازم کو بھی یہ پورا کرتے ہیں لیکن بلحاظ شاعری ایسے نہیں کہ انہیں نعت گوئی کی تاریخ میں قابل ذکر اضافہ کہا جا سکے۔" (ص ٦٩)

نعتیہ غزلوں کے بارے میں ان کی رائے ہے ؟

"عقیدت و محبت کا اظہار" جہاں جہاں" بھرپور ہو گیا ہے ان کی نعتیہ غزلوں میں دلکشی و تاثیر پیدا ہو گئی ہے ان کی بعض نعتیں غزلیں "پوری کی پوری" بہت اچھی ہیں اور پڑھنے کے لائق ہیں۔" (ص ۷۰)

اس نوع کے تبصرے "پوری کی پوری" کتاب میں ملیں گے۔

اپنے تبصرہ سے ڈاکٹر فرمان نے امیر مینائی کو غزل اور نعتیہ غزل کا کامیاب شاعر ثابت کیا اور قصیدہ نگاری کے حوالہ سے ناکام شاعر۔ دونوں باتوں کو ثابت کرنے کے لئے طویل مباحث اور بے شمار مثالوں کی ضرورت ہے جس کی گنجائش اس کتاب میں نہیں نکالی جا سکی۔ کم و بیش یہی رویہ دیگر محققین و مبصرین کا ہے حالانکہ حسرت موہانی اس کے برخلاف نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ پی ایچ۔ ڈی کے ایک مقالہ پر ریمارکس دیتے ہوئے انہوں نے اپنے نظریات شاعری کی وضاحت کی ہے۔ ان کی نظر میں شاعری کی ۳ قسمیں ہو سکتی ہیں آمد، آورد اور دونوں کی ملی جلی شکل کی شاعری، پھر ان کی بھی قسمیں گنائی ہیں انہوں نے ماہرانہ شاعری کے بارے میں لکھا ہے:

"شاعرانہ طرز سخن اگر خوبی اثر سے بالعموم محروم ہو تو پھر اس کو شاعرانہ کے بجائے ماہرانہ یا استادانہ کہنا چاہئے۔ مثلاً امیر مینائی و منیر شکوہ آبادی سے لے کر دم اکبر آبادی، ثاقب لکھنوی و ضامن کنتوری تک کی غزلیں نہ عاشقانہ ہیں نہ شاعرانہ بلکہ ماہرانہ ہیں اور آورد کی ذیل میں آتی ہیں۔"

(حوالہ "مضامین حسرت موہانی، مرتبہ شفقت رضوی، مطبوعہ کراچی، اکتوبر ۱۹۹۶ء ص ۱۰۵)

حسرت نے "غزل" کی اصطلاح ہر نوع کی غزل کے لئے استعمال کی وہ نافعانہ شاعری کی وضاحت میں کہتے ہیں:

"عارفانہ شاعری کا بھی یہی حال ہے کہ اگر اس میں عشق و حسن مطلق کی جگہ رسمی حمد یا اصطلاحی تصوف کا جلوہ نظر آتا ہے تو اس کو عارفانہ کے بجائے نافعانہ کہنا چاہئے جو آورد کے تحت ہی آئے گی۔ حکیمانہ و ناصحانہ یا معتقدانہ یا واعظانہ شاعری کا بھی شمار اس قسم سخن میں کیا جائے گا مثلاً اقبال، حالی، شبلی، سلیم پانی پتی کے قطعات یا امیر مینائی و مضطر خیر آبادی کی نعتیہ غزلیں۔ (حوالہ: ایضاً)

اور پھر واصفانہ شاعری کی توضیح یوں کی ہے:

"اگر روحانی محرکات عشق سے کمتر درجہ پر جذبات خلوص و عقیدت کے ماتحت نعت و منقبت یا سوز و سلام کے مضامین قید نظم میں آتے ہوں۔ من الجملہ اثر انگیز

بھی ہوں تو اس شاعری کو واصفانہ شاعری کہنا چاہیے مثلاً غلام امام شہید ، بوم اکبر آبادی ، شاہ نیاز بریلوی ، محسن کاکوروی ، رضوان مراد آبادی ، ضیاء بدایونی ، حمید لکھنوی یا انیس و متعلقین انیس مثل تعشق و رشید وغیرہم لیکن اگر اس قسم کا کلام بھی صنعت گری کا مرہون منت اور تاثیر سے محروم ہو یا محض حصول ثواب و نجات کی غرض سے وجود میں آیا ہو مثلاً امیر مینائی ، یا مضطر خیر آبادی کے نعتیہ دیوان یا دبیر کا تمام دفتر منظومات ، اس کو واصفانہ کے بجائے ماہرانہ کہنا ہوگا یا نافعانہ اور یہ دونوں قسمیں آورد کے تحت آتی ہیں۔" (حوالہ مذکورہ : ۱۰۵۔۱۰۶)

حسرت نے آورد کی شاعری کی قسمیں ماہرانہ ، واصفانہ ، نافعانہ قرار دی ہیں اور محسن کاکوروی اور امیر مینائی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"آورد کے ماتحت محسن کی شاعری عموماً واصفانہ کے بجائے ماہرانہ اور امیر کی ہر نعتیہ غزل محض نافعانہ بن کر رہ گئی ہے۔" (حوالہ مذکورہ ص ۱۱۲)

حسرت موہانی نے "مکتوبات امیر مینائی" مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب کے دیباچہ پر تنقیدی مضمون لکھا تھا جو رسالہ اردوئے معلی ، اپریل ۱۹۱۱ء اور مئی ۱۹۱۱ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے متعدد امور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ساتھ ہی امیر و داغ کی شاعری کا موازنہ بھی کیا ہے۔ اس تنقیدی مضمون میں وہ امیر مینائی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں :

"امیر کے اشعار میں مضمون کی بلندی ، خیال کی نزاکت ، بیان کی لطافت اور زبان کی صحت غرض کہ پختگی کلام کے تمام لوازمات موجود ہیں لیکن شاعری کی جان یعنی تاثیر کی عدم موجودگی کے باعث اس کی حیثیت ایک حسین مگر بے روح جسد سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی جس کو اس بارے میں شبہ ہو وہ مراۃ الغیب اور امیر مینائی کا نعتیہ کلام دیکھ لے کہ اس مجموعہ بے لطف و بے رنگ میں دس بیس شعر بھی ایسے نہ نکلیں گے جن سے اہل دل کے قلوب کو سرور اور ارباب نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو سکے۔"

(حسرت موہانی : مضمون "مکتوبات امیر مینائی ، مشمولہ رسالہ اردو معلی ، اپریل ۱۹۱۱ء ، بحوالہ مضامین حسرت موہانی ، ص ۹۱)

احسن اللہ خاں ثاقب ، امیر مینائی کے شاگرد اور عقیدت مند تھے۔ انہوں نے "مکتوبات امیر مینائی کے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے :

"جناب امیر کے کلام میں اگرچہ سوز و گداز کم ہے مگر ان کی جامعیت اور اصناف

سخن پر قدرت ایک امر مسلم ہے اور ان کے کامل الفن ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ ان کی شاعری ہمارے لئے دلیل راہ ہوگی اور ان کی تصانیف سے ہم کو بہت کچھ نفع کی امید ہے۔" (حوالہ مضامین حسرت، ص ۹۳)

ایک شاگرد کی رائے اپنے استاد کی شاعری کے بارے میں چاہے نظر انداز کر دی جائے لیکن حسرت موہانی جیسے کسی کی رائے سے مرعوب نہ ہونے والے اور اپنی انفرادی رائے مطالعہ اور تجزیے کی بناء پر قائم کرنے والے کی رائے کو ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ناقدین نے یہ وتیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ کسی کی خامی کی نشاندہی سوءادب ہے یا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے کے مترادف ہے اس لئے چند بنے تلے الفاظ میں تعریف کئے جاؤ، یہ بات میں ان تمام اہل علم کے حوالہ سے لکھ رہا ہوں جن کی نعت کے موضوع پر کتابیں میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔

جائے اس کے ہر کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے امیر مینائی کے حوالے سے صاحب کتاب کے تبصروں پر روشنی ڈالی جاتی میں نے ڈاکٹر فرمان کی کتاب کے حوالے سے وہ تمام باتیں کہہ دی ہیں جن کا اطلاق تمام کتابوں پر ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد التماس ہے کہ یا تو حسرت موہانی کے صائب الرائے نقاد ہونے سے انکار کر دیا جائے یا ان کے بیانات اور تبصروں کی روشنی میں ازسر نو امیر مینائی کی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا جائے۔

جن معروف نعت گو شعراء کا ذکر ڈاکٹر فرمان نے اپنی کتاب میں کیا ہے ان میں سیر حاصل تبصرے حالی (ص ۷۱ تا ۷۴)، اقبال (ص ۷۵ تا ۸۳)، ظفر علی خاں (ص ۸۳ تا ۸۴)، بیدم وارثی (۸۵ تا ۸۶)، غلام مصطفےٰ عشقی (ص ۸۷ تا ۸۸)، واحد علی وحید ہنسوی (ص ۸۸ تا ۸۹)، امیر بدایونی (ص ۹۱ تا ۹۲)، اکبر وارثی میرٹھی (ص ۹۳ تا ۹۵)، اقبال سہیل (ص ۹۵ تا ۹۷)، بہزاد لکھنوی (ص ۹۷ تا ۹۸)، حفیظ جالندھری (ص ۹۹ تا ۱۰۵) کے کلام پر ہیں جبکہ باقی شعراء کا جائزہ سرسری لیا گیا ہے۔

غرض کہ ڈاکٹر فرمان کی کتاب میں محسن اور امیر کے بعد کا ہر قابل ذکر نعت گو شامل ہے۔ مصنف نے کہیں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے اور کہیں حدِ اختصار پر رہے ہیں۔ اس سے اس تاثر کا پتہ چلتا ہے جو انہوں نے شاعر سے قبول کیا ہے۔ تبصروں کا اظہار روایتی ہے۔ ان میں گہری نظر سے کم کام لیا گیا ہے اور بعض شعراء کے کلام پر تبصرہ موجود نہیں ہیں۔ اسے قدرے بے احتیاطی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غیر مسلم شعراء کے ضمن میں ایک شاعر "اختر" کا حوالہ ملتا ہے (ص ۱۱۵، ۱۱۶) اسے پڑھ کر میرا سر چکرا گیا کہ یہ کون "اختر" ہے ذہن پر زور دینے اور اشعار پڑھنے کے بعد علم ہوا کہ یہ "ہری چند اختر" ہیں۔ پورے نام کی صراحت کے بجائے صرف تخلص کا حوالہ دے کر ڈاکٹر صاحب نے میرے بیان کی تائید کر دی ہے کہ کہیں کہیں بے احتیاطی سے کام لیا ہے۔ علمی و ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کتابوں میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے

کہ ایک نقطہ کم ہو نہ بیش ہو اور ہم ڈاکٹر صاحب سے ایسی ہی بے عیب تحریروں کی توقع رکھتے ہیں۔ اچھا ہوتا طبع ثانی کے موقع پر اس پر نظر ثانی بھی ڈالی جاتی۔

ہری چند اختر کی ایک نعتیہ نظم کو مصنف نے "قابل ذکر" قرار دیا ہے جس کا ٹیپ کا مصرع ہے

محمدؐ حشر کے میداں میں دولھا بن کے نکلیں گے

انداز بیان حد درجہ قابل اعتراض بلکہ گستاخانہ ہے آخر کس فرمانِ خداوندی، حدیث شریف یا قول صحابہ سے یہ مضمون اخذ کیا گیا کہ حضور ﷺ دولھا بن کے نکلیں گے اور ڈاکٹر صاحب اس کی پسندیدگی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا بلکہ لکھا تو یہ کہ :

"یہ نظم ایک زمانہ میں بہت مقبول ہوئی اور قوالوں کے ذریعہ اس کی شہرت دور دور تک پہنچی۔" (ص ۱۱۶)

تو گویا کسی نعت کا قوالوں کے ذریعہ مقبول ہو جانا اس کے "قابل ذکر" ہونے کے لئے کافی ہے۔

شعراء کی ترتیب بلحاظ زمانہ نہیں ہے موجودہ دور کے شاعروں کے ذکر کے بعد سودا اور مومن آگئے ہیں !؟

اس کتاب کی نوعیت کو سرسری تبصرہ کہا جاسکتا ہے یہ نہ تو جامع تبصروں پر مبنی ہے اور نہ تحقیقی ہے۔ معروف شعراء میں قریب قریب سب شامل ہیں۔ غیر معروف یا کم معروف نام بھی دو چار نظر آجاتے ہیں۔ غالباً جن کا کلام آسانی سے دستیاب ہوا انہیں شامل کر لیا گیا۔

بہر حال کتاب بہت سی خوبیوں اور کچھ خامیوں کے ساتھ اس لئے بھی اہم ہے کہ ایک اہم علمی، مذہبی، ادبی موضوع پر اظہار خیال کی راہیں اس کے ذریعہ کھلیں۔ ذہن کے دریچے وا ہوئے۔ فکر و نقد و نظر کے امکانات بڑھے۔ اگر یہ کتاب منظر عام پر نہ آئی ہوتی تو مابعد جو کام ہوا ہے وہ شاید اس تیزی سے نہ ہوتا۔ اس سے روشنی حاصل کرنے کا بعض نے اعتراف کیا ہے بعض نے نہیں کیا لیکن اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اولین نقوش کی جو اہمیت ہوتی ہے اس سے کون انکار کرے گا اور یہ کتاب تو نعت کے موضوع پر شائع ہونے والی پہلی پاکستانی کتاب ہے۔

اردو نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق

نعت کے موضوع پر بھارت میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی ہے۔ پاکستان میں شائع ہونے والی پہلی کتاب ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ہے تو پی ایچ ڈی کا پہلا مقالہ لکھنے کی سعادت سے سید رفیع الدین اشفاق سرفراز ہوئے ہیں۔ ان کا مقالہ ۱۹۷۶ء میں کراچی سے شائع ہوا جبکہ مقالے پر ناگپور یونیورسٹی نے ۱۹۵۵ء میں انہیں ڈگری عطا کی تھی۔ اس مقالہ کے نگراں ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں

صاحب تھے۔

ہم نے ڈاکٹر اشفاق کی شخصیت، علمیت اور سیرت معلوم کرنے کی کوشش کی تو علم ہوا کہ وہ اسلامی اقدار پر مکمل طور پر کاربند ہیں۔ عربی اور فارسی سے بھی واقف ہیں۔ انہوں نے ان دونوں زبانوں میں پی ایچ ڈی کیا ہے ایسے کم اسکالر ملتے ہیں جو بیک وقت ۲، ۳ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق مطالب قرآن سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کا علم عربی ادبیات تک محدود نہیں بلکہ قرآن و حدیث بھی ان کے دائرہ علم میں داخل ہیں۔ اس پر مستزاد کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ان کے رہنما اور نگراں رہیں ہوں۔ موصوف ہمہ صفت، موصوف علوم شرقیہ والسنہ شرقیہ کے ماہر، قرآن اور حدیث سے خاص دلچسپی رکھنے اور اپنے حلقہ میں ہر ایک کو اپنے خزانہ علم سے بہرہ اندوز کرنے والے ہیں۔ قرآن سعدین کی اس یکجائی سے جو نتیجہ بر آمد ہو سکتا ہے وہ "اردو میں نعتیہ شاعری" کی صورت میں سامنے ہے۔

ان کا اصل نام سید رفیع الدین، گھریلو نام اور تخلص اشفاق ہے۔ والد کا اسم مبارک سید عنایت محی الدین اور سلسلہ نسب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

> "___ سید رفیع الدین اشفاق کی پیدائش تلے گاؤں میں ۱۹۱۵ء یا ۱۹۱۶ء کو ہوئی جبکہ ریکارڈ میں ۱۴ جنوری ۱۹۱۸ء درج ہے۔ ابتدائی تعلیم تلے گاؤں میں حاصل کی۔ میٹرک ۱۹۳۲ء میں محمد علی میموریل اسکول عقب جامع مسجد دہلی سے کیا۔ ایف اے، بی اے، ایم اے (عربی) پی ایچ: ڈی (تھیالوجی) کی تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔"
>
> "___ ۱۹۳۹ء میں عملی زندگی کا آغاز ورنگل ہائی اسکول میں تدریس سے کیا۔ ۱۹۴۰ء میں انوار العلوم کالج حیدر آباد میں آگئے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء تک گلبرگہ کے قریب الندہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر رہے۔ ۱۹۴۳ء میں ناگپور یونیورسٹی کے مارس کالج میں لیکچرار عربی مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ اس وقت صدر شعبہ اردو غلام مصطفےٰ خان تھے۔ ۱۹۴۶ء میں ایم اے فارسی کیا۔"
>
> "۱۹۴۶ء میں ہی "اردو میں نعتیہ شاعری" کے عنوان سے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کی غرض سے خاکہ و کتابیات پیش کیں یہ کام ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان کی نگرانی میں کرنے کی درخواست کی۔ تقسیم ملک کے بعد جب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں پاکستان آگئے تو یہ پہلے صدر شعبہ اردو اور صدر شعبہ ہائے فارسی و عربی بھی مقرر ہوئے۔"

"۔۔۔۔۔ تین شعبوں کی صدارت اور فاضل نگران کی جدائی میں مقالہ لکھنے کا دماغ نہ رہا لیکن ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان پاکستان سے مسلسل تقاضہ کرتے رہے جب وہ ایک بار ناگپور آئے تو دوبارہ خاکہ ہوا کر کام کرنے کی ترغیب دی۔ مقالہ کی تیاری میں کئی مشاہیر سے ملے جن میں عبدالعزیز میمن، مولانا فضل اللہ، پروفیسر اسلامیات عثمانیہ یونیورسٹی دکن، ڈاکٹر محی الدین زور قادری اور عبدالقادر سروری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے "نعت گوئی پر ہندوستانی صنمیات کا اثر" والے باب میں خاص رہنمائی کی۔ آصفیہ لائبریری، عثمانیہ یونیورسٹی اور سعیدہ لائبریری حیدرآباد سے استفادہ کے ساتھ ادارہ ادبیات اردو میں موجود مخطوطات بھی دیکھے۔ مقالے کے ممتحن ڈاکٹر مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر اعجاز حسین مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین نے مقالہ کو وقیع و مہتم بالشان کام قرار دیا۔"

(پروفیسر حفیظ تائب، مضمون "اردو نعت کے اولین محقق" مشمولہ رسالہ اوج، نعت نمبر، جلد ۲، ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۳، ۳۲۴)

سوانحی خاکہ اس لئے پیش کیا گیا کہ ڈاکٹر اشفاق کی علم کے لئے لگن کے باعث نامساعد حالات کے باوجود اعلیٰ جامعاتی ڈگریوں پر ڈگریاں لینا ان کے لئے عام سی بات رہی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے تبحر علمی کے آگے ڈگریاں بے وقعت ہو گئی ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایسے عالم کے لئے ڈگری علم کی سند نہیں ہوتی صرف شوق کی تکمیل ہوتی ہے۔

وہ نام و نمود سے ہمیشہ دور رہے۔ انہیں 'کتاب سازی' کا کبھی شوق نہیں رہا۔ اس معاملہ میں ان کی بے اعتنائی کا یہ عالم رہا کہ مقالہ کی تکمیل اور ڈگری کے حصول کے بعد بھی ۱۹ سال تک وہ اس کی اشاعت کی تگ و دو سے غافل رہے۔ حالانکہ یہ ان کے لئے فخر کا مقام تھا کہ "یہ مقالہ نہ صرف اردو ادب میں بلکہ اسلامی ادب میں پہلی اور نادر کوشش ہے۔"

انہوں نے مقالہ کی یہ خصوصیات بیان کی ہیں۔

۱۔ جہاں یہ اردو کے نعت گو شعراء کا تذکرہ ہے وہاں اردو شاعری کے مختلف ادوار میں نعت گوئی کی تاریخ بھی ہے اور ادب میں نعت کی اصل، اس کی اہمیت اور اس کے آغاز اور ارتقاء کا بیان بھی ہے۔ نیز نعت پر عجمی اثرات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ شعراء کی طبقہ داری تقسیم ادوار کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ہر دور کے شعراء کے کلام پر تبصرے سے پہلے اس دور کی عام خصوصیات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے۔

۳۔ مقالہ اردو شاعری کے روز آفرینش سے دور حاضر تک کی نعتیہ شاعری کا جائزہ ہے۔ اس میں صرف ان شعراء کو شامل کیا گیا ہے جو نعت گوئی میں مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور جنہوں نے اس کی طرف خاص توجہ کی اس میں اردو کے مشہور شعراء کے علاوہ کئی ایسے نام بھی ہیں جن کا ذکر ادبی تذکروں اور تواریخ میں نہیں ملتا۔

۴۔ شعراء کے حالات پیش کرنے میں زیادہ تر اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

۵۔ جن شعراء کے کلام پر بحث کی گئی ہے ان کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ کلام پر تبصرے کے ساتھ نمونہ کلام اس قدر پیش کیا گیا ہے کہ کلام کی قدر و قیمت کا اندازہ ان نمونے کے اشعار سے ہو جائے۔

کتاب کا مطالعہ کرنے والے گواہی دیں گے کہ یہ مصنف کے محض دعوے نہیں ہیں ان کی تحریر ان کے ہر دعوے کا ثبوت ہے۔

اس مقالہ کی وسعت اور جامعیت دیکھتے ہوئے قاری اس مقام حیرت سے گزرتا ہے کہ اس نوع کا کام اسلامی ادبیات (عربی، فارسی، اردو) میں کبھی نہیں ہوا۔ مقالہ نگار کے پیش نظر ماقبل کی کوئی تصنیف راہنمائی کے لئے موجود نہیں تھی۔ انہوں نے اور ان کے نگران نے اپنی قابلیت اور وسیع النظری سے ایسے ابواب قائم کئے اور ان کی ایسی ذیلی سرخیاں قائم کیں کہ موضوع کا کوئی پہلو ان کی گرفت سے باہر نہیں رہا۔ ڈاکٹر نجم الاسلام کی صراحت کے مطابق

> "یہ اپنی ضخامت (۶۸۴ صفحات) طویل فہرست، مشمولات اور اس موضوع پر پہلا تحقیقی مقالہ ہونے کے اعتبار سے خصوصی طور پر توجہ طلب ہے۔ اس کی فہرست ماخذات میں چودہ مخطوطات اور ایک سو چھپن مطبوعات درج ہیں جن میں زیادہ تر دواوین وکلیات اور تذکرے ہیں۔ چند تصانیف قرآن وحدیث اور سیرۃ وشمائل کے موضوعات پر بھی ہیں لیکن موضوع سے براہ راست متعلق کوئی ایسی تصنیف شامل نہیں جس میں اردو کی نعتیہ شاعری سے بحث ہو۔ مصنف نے اپنی راہ خود نکالی ہے اس تقدم کی فضیلت پر یقیناً وہ تحسین کے مستحق ہیں۔" (ڈاکٹر نجم الاسلام، اردو نعت کے مطالعے، مشمولہ رسالہ صریر خامہ، نعت نمبر، شعبہ اردو جامعہ سندھ، ص ۱۳۴، ۱۳۵)

مقالہ کے باب اول میں بنیادی نوعیت کے مباحث ہیں جن میں نعت کی تعریف بھی شامل ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق نعت کا لفظ حضور اکرم ﷺ کے وصف کے لئے حضرت علی سے منقول ہے۔ (ص ۳۰) انہوں نے مضامین نعت کے ماخذ میں قرآن اور حدیث کو اہم قرار دیا ہے اور حضور ﷺ کے اوصاف قرآن شریف کے حوالہ سے عبدیت، رسالت، رحمۃ اللعالمین، محبوبیت، نور محمدی، عطائے الٰہی،

فضیلت، بنی نوع انسان سے آپ کی رافت و رحمت بیان کیے ہیں۔ ان سب کے لئے آیات قرآنی سے ترجمہ و تفسیر اس طرح بیان کیے ہیں کہ موضوع میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا۔ دیگر اوصاف کو حدیث سے واضح کیا گیا ہے اور صحابہ کرام کے اقوال سے چند عنوانات قائم کیے ہیں جو نعت کے موضوع بن سکتے ہیں مثلاً حضور ﷺ کا سراپا، اخلاق حسنہ، مہر نبوت کا بیان، بالوں کا بیان اور ان میں کنگھی کرنے کا بیان، بال سفید ہونے کا ذکر، خضاب کا ذکر، زرہ، تلوار، خود کا بیان، عمامہ، تہبند، لباس کا بیان، کھانے کے لوازمات اور اخلاق، میوے کا استعمال، گفتگو کا طریقہ، پانی پینے کے آداب، عطر، نبیذ، مذاق، عبادت کی تفصیل، تواضع، اخلاق، حیا، اسمائے مبارک۔

اسی باب میں نفس شاعری اور موضوعات شاعری پر مشرقی اور مغربی افکار و اقوال کو پیش نظر رکھ کر بحث کی گئی ہے۔ انہوں نے کتاب العمدہ جلد اول کے حوالے سے لکھا ہے کہ

> ”بعض ادیبوں نے اصولاً شعر کی دو قسمیں بتائی ہیں یعنی مدح و ذم اور دیگر اقسام کو انہی سے متعلق کر دیا ہے۔“ (ص ۵۳)

اور پھر نعت کو قسم اول میں شمار کیا ہے۔ مقالہ نگار نے نعت گوئی کو موضوع کے لحاظ سے وسیع اور بیان کے لحاظ سے بوجہ احتیاط محدود قرار دیا ہے جہاں نعت گو معتقدات کے سہارے طبع آزمائی کرتا ہے وہاں اپنے آپ کو نقادوں کی دست درازیوں سے محفوظ سمجھتا ہے لیکن نعت گو کو حد درجہ احتیاط سے کام لینا ضروری ہے کیونکہ

> ”یہ ایک ایسے ممدوح کی مدح ہے جس کی بارگاہ میں مبالغہ قرہت ممدوح کا وسیلہ نہیں بن سکتا اور نہ یہاں اس بیان کو باریابی حاصل ہے جو صادق البیانی کی ترجمانی سے محروم ہے۔ پھر صدق و صفا کی زندگی کو سمجھنے کے لئے صدق و صفا کی حقیقت اور اس کی کیفیت کو قلب و نظر میں بسائے بغیر بھی کام نہیں چلتا۔ غرض کہ حقیقت محمدی کو سمجھ کر ان کے مرتبہ کا بیان، علم، فضل، بصیرت اور شاعرانہ صلاحیت چاہتا ہے اور ان فضائل کا ایک جگہ جمع ہونا آسان نہیں۔“ (ص ۵۶)

مقالہ نگار کا تجزیہ حقیقت پر مبنی ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو چند افراد ہی نعت گوئی کے اہل قرار پاتے ہیں۔ نعت شعر گوئی کی مہارت کا اظہار نہیں ذات میں رسول کی محبت اور عقیدت جذب کرنے اس کے اظہار کی قوت حاصل کرنے کا نام ہے۔ محبت اور عقیدت کو جاں گزیں کرنے کے لئے علم حاصل کرنا ضرور ہے۔ قرآن، حدیث، سنت وہ ذرائع اور ماخذ ہیں جن سے حضور ﷺ کی محبت و عقیدت روح کی گہرائیوں کے ساتھ پیوست کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ہی شعر کی تحریک ہوتی ہے جو نعت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

مقالہ نگار نے نعت کی قسمیں اس طرح بیان کی ہیں

(۱) رسمی نعت (ص ۶۰)

(۲) مقصدی نعت (ص ۶۰ تا ۶۴)

(۳) اصلاحی نعت (ص ۶۴ تا ۶۵)

ہمارے خیال میں اصلاحی نعت کو الگ شمار کرنا مناسب نہیں وہ مقصدی نعت کی ضمنی قسم ہی قرار پا سکتی ہے۔

دوسرے باب کا عنوان "اردو شاعری کے مآخذ" ہے جس سے مقالہ نگار کی مراد عربی، فارسی اور ہندی اثرات کو اردو نعت میں تلاش کرنا ہے۔ یہ ایک مفروضہ ہے کہ اردو شعریات عربی سے براہ راست متاثر رہی ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کی آبادی میں مسلمانوں کا جو طبقہ عربی سے شغف رکھتا تھا ان کی تعداد محدود رہی اور عربی دان افراد میں کم ہی ایسے ہیں جنھوں نے باقاعدہ شاعری کی ہے۔ بہر حال مقالہ نگار نے عربی میں نعت گوئی کا سرسری جائزہ ضرور لیا ہے ان کی تحقیق کے مطابق سب سے قدیم قصیدہ جس میں رسول کریم ﷺ کی مدح کی گئی ہے وہ اعمش کا ہے (ص ۶۸) حالانکہ ڈاکٹر طلحہ رضوی نے میمون کے قصیدہ کو اولین قرار دیا ہے۔ یہ امر بحث طلب ہی نہیں تحقیق طلب بھی ہے دوسرا قصیدہ کعب بن زہیر کا بتلایا ہے۔ ان کے علاوہ حضرت حسان بن ثابتؓ کا ذکر قدرے تفصیل سے ہے وہ اشعار جو حسانؓ نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد کہے اگرچہ قصیدہ میں شمار ہوتے ہیں لیکن مقالہ نگار نے ان کو مرثیہ قرار دیا ہے اور ایسے دو مرثیوں کے اشعار بھی نقل کیے ہیں ان کے خیال میں :

> "یہ قصائد تاریخ مدح رسول میں نہایت اہم ہیں۔ وہ مرثیے جن میں حزن و ملال اور بکا کے مضامین پائے جاتے ہیں حقیقت میں ثنائے رسول ہی میں داخل ہیں اور عام مرثیوں سے اس طور سے مختلف ہیں کہ ان میں غم فراق کے اظہار کے ساتھ ساتھ لقائے رسول فی الخلد کی تمنا بھی پائی جاتی ہے۔" (ص ۷۳)

مقالہ نگار نے اپنی انفرادی فکر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضور ﷺ کے دنیا سے پردہ کرنے کے بعد ان کی محبت میں کیفیات جدائی کا اظہار اور ان کے پردہ کرنے پر آہ و بکا کی کیفیت پیدا کی جائے تو مضمون کے لحاظ سے اشعار مرثیہ بن جاتے ہیں۔

حضرت حسان کے بعد عربی کے نعت گو بزرگوں میں حضرت علیؓ (ص ۷۳، ۷۴)، بوصیری (ص ۷۶ تا ۷۹)، ابو بکر تقی الدین بن علی بن عبداللہ الحموی (ص ۷۹)، جمال الدین محمد بن محمد مصری، کے قصائد نعتیہ کا سرسری جائزہ لیا ہے لیکن ان نعتیہ قصائد سے اردو شعریات کس قدر متاثر ہوئیں ان کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

فارسی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگار نے نعتیہ شاعری کو عہد ساسانی سے منسوب کیا ہے

اس عہد کا اہم ترین شاعر رودکی تھا۔ دوسرا عہد غزنوی کا بتلایا ہے جس میں فردوسی جیسا عظیم شاعر گذرا ہے۔ تیسرا دو عہد سلجوق کا ہے اس دور کے ممتاز صوفی شعراء میں حکیم سنائی نے نعت کی طرف خاص توجہ کی۔ ان کے سرسری حوالہ کے بعد نظامی (ص ۸۳، ۸۴)، خاقانی (ص ۸۴، ۸۵)، رومی (ص ۸۵، ۸۶)، سعدی (ص ۸۶، ۸۷)، امیر خسرو (ص ۸۷، ۸۸)، جامی (ص ۸۹، ۹۱)، عرفی (ص ۹۱، ۹۲)، قدسی (ص ۹، ۹۳) اور برصغیر کے فارسی گو شاعر اقبال (ص ۹۳ تا ۹۶) کا تفصیلی ذکر ہے۔

اس جائزہ کے بعد مقالہ نگار نے اپنے خیال کی وضاحت کی ہے کہ :

"فارسی کے جن نعت گو شعراء کا ذکر کیا گیا ان کا کلام ہندوستان میں فارسی تعلیمی نصاب کا ہمیشہ جزو رہا اور فارسی کا ہندوستان میں جو مقام رہا ہے وہ بھی ظاہر ہے یہی وجہ ہے کہ فارسی ادب کے اثرات اردو ادب پر نہایت گہرے ہیں۔ نعتیہ شاعری اس سے مستثنٰی نہیں ہے اردو نعت کے قصائد، مثنویاں، غزل وغیرہ میں ہم فارسی نعت کا تتبع شدت سے پاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اردو نے اس خصوص میں چند نئی راہیں بھی نکالی ہیں۔" (ص ۹۵)

اس باب کا تیسرا حصہ ہندوستانی صنمیات کے اثرات سے متعلق ہے۔ ان کے خیال میں رسول ﷺ کی مدح سرائی ہندوستان میں آکر اصنام یا دیوتاؤں کی مدح سرائی کی طرز سے متاثر ہوئی (ص ۹۷) ہندوستانی اثرات کے سلسلہ میں مقالہ نگار نے جو نکات پیش کیے ہیں وہ لائق غور ہیں۔

(۱) ہندوستانی صنمیات میں بعض کرداروں مثلاً رام، کرشن وغیرہ کو اوتار یا وشنو (بھگوان) کا جسمانی اور زمینی روپ دیا گیا ہے۔ مسلم شعراء اس سے متاثر ہو کر نعت میں احد اور احمد کے فرق کو تسلیم نہیں کرتے اور دونوں کو ایک قرار دیتے ہیں۔

(۲) ہندوستانی صنمیات مافوق الفطرت سے بھری پڑی ہے اس سے متاثر ہو کر نعت گو شعراء بجائے حضور ﷺ کے حقیقی اوصاف اور اسوہ حسنہ کا ذکر کرنے کے معجزات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں کہ ان میں بھی مافوق الفطرت عنصر کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کی ولادت اور وفات کے حوالہ سے بھی یہی رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔

(۳) ہندی زبان میں نعت گوئی کی گئی ہے اور ہندی شاعری کا اسلوب اور لب و لہجہ استعمال کیا گیا ہے۔

ان اثرات کی ذیل میں متعدد اشعار کے حوالہ بھی دیئے گئے ہیں جو نہایت معتبر شعراء کی نعتوں سے اخذ کیے گئے۔ ان کو یہاں نقل کرنا ہمارے خیال میں بے جا جسارت اور سوءِ ادب کے مترادف ہوگا۔

اس بحث کے دوران مقالہ نگار نے محسن کے قصیدہ لامیہ کے ہندوانہ اور ہندی مزاج کی وکالت کی جس کے بارے میں ہم اپنے خیالات صفحات ماقبل میں بیان کر چکے ہیں۔ یہاں ان کی تکرار کی ضرورت

نہیں ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس قصیدہ لامیہ سے کفر سے اسلام کی طرف رجوع کرنے کا خیال واضح نہیں ہوتا اور اس کی تلمیحات، استعارے اور اشاریت عام فہم نہیں ہیں۔ ان کا مفہوم مسلمانوں کے محدود طبقہ ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ہندی شاعری کی پیروی میں عورت کی جانب سے جذبات عشق کا اظہار اسلامی مزاج کے قطعی بر خلاف ہے اور پھر جو الفاظ اور انداز بیان ہے اس سے گھٹیا پن اور عامیانہ رنگ ظاہر ہوتا ہے جو ذکر رسول ﷺ سے میل نہیں کھاتا اس لئے ان ہندی اور ہندوانی اثرات کی تائید اور حمایت عقل سلیم کے منافی ہی کہی جائے گی۔

مقالہ کے تیسرے باب میں اردو نعت گوئی کا جائزہ تاریخی ادوار کے لحاظ سے لیا گیا ہے۔ قدیم دور میں دکنی ادبیات پیش نظر رہی ہیں جن کا بڑا حصہ ہنوز طباعت و اشاعت سے محروم ہے۔ مقالہ نگار نے دکن کے کتب خانوں میں محفوظ مخطوطات کا غائر نظر سے مطالعہ کر کے ان کے نمونے اور نعت گوئی کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کے خیال میں ابتدائی تصانیف تبلیغی نوعیت کی ہیں اور ان کے مصنف صوفیاء کرام تھے۔ انہوں نے زیادہ تر مذہبی موضوعات پر نظم و نثر میں خیالات کا اظہار کیا اور آغاز میں حمد و نعت کو لازم قرار دیا چنانچہ اس دور کی تمام تصانیف میں یہ خصوصیت ہے۔ مقالہ نگار اس نشاندہی سے قاصر رہے ہیں کہ مذہبی لٹریچر میں نعت کے لازمی عنصر کو اتنی اہمیت کیوں دی جانے لگی کہ بعد میں مسلم اور غیر مسلم شعراء نے جو غیر مذہبی لٹریچر تخلیق کیا حمد و نعت اس کا بھی لازمی حصہ بن گئے۔ مقالہ نگار قدیم ہند کی نعت نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور مذہبی خیالات ایک عرصہ تک شاعری میں غالب رہے لہٰذا اردو شاعری کے آغاز ہی سے شعراء نے نعت کی طرف توجہ کی۔ اس کا بڑا مقصدی پہلو یہ تھا کہ عوام تک رسول کریم ﷺ کی سیرت کا مضمون دلکش اور دلنشین پیرائے میں پیش کیا جائے تاکہ عوام کے لئے جاذب توجہ ہو حقیقت میں یہ ایک تبلیغی مہم کا کارنامہ ہے جو نعتیہ ادب بن کر جلوہ گر ہوا۔" (ص ۱۲۵)

مقالہ نگار نے نعت کے نمونے حضرت سید محمد حسینی، سید محمد اکبر حسینی، نظامی، صدرالدین، عبدالملک بھروچی، سلطان محمد قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، صنعتی، ابن نشاطی، نصرتی، طبعی، سید بلاقی، مختار، قدرتی، فتاحی اور ولی کے کلام اور متعدد ایسی تصانیف سے پیش کئے ہیں جن کے مصنفوں کا نام تک معلوم نہ ہوسکا۔ ان تصانیف میں چکی نامے، مثنویاں، تبلیغی رسائل اور نظمیں، تولد نامے، غزلیں، رباعیاں، طوطی نامے، نور نامے، معراج نامے، منظوم داستانیں، معجزے، وفات نامے، شمائل نامے سبھی شامل ہیں۔ ان سب کا ذکر سرسری نہیں ہے بلکہ مقالہ نگار نے شاعر کے احوال، نمونہ کلام کے ساتھ خصوصیات کلام پر پوری پوری توجہ کی ہے اس طرح تحقیق اور تبصرے دونوں کا حق ادا کیا ہے۔ انداز بیان چلتا ہے کہیں اپنی

قابلیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے اور نہ بات کو طول دینے کا فن اختیار کیا ہے۔ ان کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ ابتداء کے تجزیوں سے گزر کر ولی کے زمانہ میں نعتیہ شاعری ارتقائی منازل سے گزر کر ادبی لحاظ سے بھی بلند ہو گئی ہے۔

باب چہارم کو قدماء کا دور قرار دیا گیا ہے۔ جس میں سراج اورنگ آبادی کے علاوہ سودا (۱۸۱۔۱۸۸)، نوازش علی شیدا (ص ۱۸۹۔۱۹۵)، محمد باقر آگاہ (ص ۱۹۶۔ ۲۱۷) کو شامل کیا گیا ہے۔ صفحات کی تعداد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مقالہ نگار نے ان شاعروں کی تصانیف کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے اور ان کی نعت گوئی کی خصوصیات پر نظر رکھی ہے۔ اس دور کی خصوصیات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

"شعراء کی کاوشوں نے فارسی تراکیبوں اور محاوروں کو اردو کا لباس بخشا۔ اس طرح خیالات کے اظہار کے لئے وسعت کا سامان کیا۔ دراصل یہ زمانہ زبان کی اصلاح اور صفائی کے لئے نہایت ممتاز ہے زبان کے حسن و قبح کو تنقیدی نظر سے پرکھا گیا۔ ان کے ذوق سلیم نے ہندی کے ثقیل الفاظ کے ساتھ فارسی کی نامانوس ترکیبوں کو بھی کلام سے خارج کر دیا۔"

"یہ دور مثنوی اور قصیدے کے فروغ کے لئے مشہور ہے۔ نعتیہ مضامین کے لئے بھی شعراء نے انہی اصناف سخن کو اختیار کیا۔ چنانچہ نعت میں ہم سودا کے یہاں قصیدہ، نوازش کے یہاں قصیدہ و مثنوی اور آگاہ کے یہاں مثنویاں پاتے ہیں۔"

"اس عہد کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ شعراء نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کو بالتفصیل احادیث صحیحہ کی روشنی میں نظم کیا اور اسوہ حسنہ کے وہ پہلو پیش کئے جن سے اصلاح امت کی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔" (ص ۱۷۸)

اس دور پر مجموعی تبصرہ کرنے کے بعد تینوں شعراء کی شعری تخلیقات اور ان میں موجود نعت کے مضامین کا تنقیدی جائزہ مضمون، زبان اور اسلوب ہر طریقہ سے لیا ہے۔ سراج کے بارے میں ان کا تبصرہ ہے:

"نعت میں شروع سے آخر تک سلاست، روانی اور بیان کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ مضمون سادہ اور رسول کریم ﷺ کے عام اوصاف کا بیان ہے جس کی سند حدیث اور قرآن سے ملتی ہے۔ شاعر نے اس میں داخلی جذبات کو نعت کے مضمون پر غالب ہونے نہیں دیا لیکن اشعار کے اندر ایک کیف اور خلوص کا پتہ چلتا ہے۔"

(ص ۱۸۰)

سودا نے نعت کے مضامین قصائد کی صورت میں بیان کئے ہیں وہ اردو قصیدہ کے سب سے

بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔ سوؔدا کے بارے میں تبصرہ کیا ہے:

"سوؔدا قصیدے کے بادشاہ شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کی جودت طبع، زوربیانی اور تخیل کی بلندی کو اپنے کمال کے اظہار کے لئے قصیدے میں وسیع میدان ہاتھ آتا ہے۔ انہوں نے اس فن میں عرفی اور خاقانی کے قصائد کی شان پیدا کی۔ ان کی تشبیب عموماً زمانہ جاہلیت کے پامال مضامین کی بھونڈی تقلید نہیں ہوتی۔ وہ مدح کے مضمون کی مناسبت سے تشبیب کا مضمون پیش کرتے ہیں فنی اعتبار سے ان کے قصائد میں کہیں سقم نظر نہیں آتا۔" (ص ۱۸۲)

سوؔدا کے نعت کے طویل اقتباسات دیتے ہوئے مقالہ نگار نے ان کی شعری خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ سوؔدا کی مثنوی "در عشق پسر شیشہ گر" میں نعتیہ اشعار کو محض رسمی قرار دیا ہے جو مثنوی میں تبرکاً شامل کئے گئے ہیں۔ اس طرح مقالہ نگار نے سوؔدا کی نعت نگاری کے دونوں اوصاف کا منصفانہ جائزہ لیا ہے۔

اس دور کے تیسرے اہم شاعر شیؔدا کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مرثیہ خوانی اور عزاداری کو فروغ دیا۔ وہ خود بھی مرثیہ گو اور نعت گو تھے اس طرح ان کی شاعری کے موضوعات تمام تر مذہبی ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی سیرت پر ان کی مثنوی "اعجاز احمدی" اپنی ضخامت اور مضامین دونوں کے اعتبار سے اہم ہے یہ مثنوی چار جلدوں پر مشتمل ہے چاروں جلدوں میں اشعار کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زائد ہے۔ اس کے علاوہ معجزوں کے بیان میں مثنوی "گلشن ایمان" لکھی تھی۔

اس عہد کے شاعروں میں باقر آگاہ سب سے اہم ہیں۔ ان کی کثیر تعداد میں تصانیف ہیں اور معیار کے اعتبار سے بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ مقالہ نگار نے ان کی ہر تصنیف کی خصوصیات کا ذکر تفصیلاً کر کے اپنے ذوق مطالعہ اور تنقیدی شعور کا سکہ بھی بٹھایا ہے اور مصنف کے صحیح مقام سے قاری کو آگاہ بھی کیا ہے۔ ماہ من دیپک، من موہن، جگ موہن، آرام دل، راحت جان، من درپن۔ من جیون آگاہ کی تصنیف ہشت بہشت کے وہ حصے ہیں جن میں حضور ﷺ کے ظاہری احوال اور فضائل کا جامع اور مستند حال درج ہے۔ باقر آگاہ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے مقالہ نگار نے تجزیاتی مطالعہ کا حاصل ان الفاظ میں پیش کیا ہے

"مولانا باقر آگاہ نے سیرت نبی ﷺ کے مضامین کو نظم کرتے میں صحت روایت کا کماحقہ خیال رکھا ہے۔ ہم ان کے کلام پر مضامین کے نقصان سے شعریت کا غلبہ نہیں پاتے۔ جذبات کا اظہار ہے تو وہ بھی حسب موقع و محل۔ آگاہ نے زبان عام فہم استعمال کی ہے جو مقامی رنگ لئے ہوئے ہے۔" (ص ۲۱۶، ۲۱۷)

باب پنجم انتہائی مختصر ہے جو صرف چار صفحات (۲۱۹-۲۲۲) پر محیط ہے اور اس میں ایک ہی شاعر کا ذکر ہے یہ شاعر ہے نظیر اکبر آبادی ___ یوں تو نظیر اکبر آبادی کا ذکر نعت کے بارے میں لکھی گئی کتابوں میں ہر ایک میں موجود ہے لیکن نظیر ایک ایسا شاعر ہے جسے بہ اعتبار خصوصیات کلام کسی خاص دور سے وابستہ کیا جاسکتا ہے نہ دوسروں کے مثل قرار دے کر ان کے ساتھ منتھی کیا جاسکتا ہے وہ منفرد ہے اور اسے منفرد ہی سمجھنا چاہئے۔ یہ شعور مقالہ نگار نے ظاہر کیا ہے۔ یوں تو نظیر کا نعتیہ خمسہ مشہور ہے لیکن اس کے علاوہ صفت کلمہ کے عنوان کو "بیان کلمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" قرار دے کر اس میں نعت کا مضمون پیدا کیا ہے اور جو منقبت حضرت علیؓ کی شان لکھی ہے اس میں بھی نعت کے اشعار شامل ہیں گویا نظیر کی فکر پر جہاں عوامی زندگی کا غلبہ نظر آتا ہے وہیں ان کے اس لگاؤ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جو انہیں اقدار اسلامی اور ذات رسالت مآب ﷺ سے تھا۔ ان کے نعتیہ خمسہ میں شروع سے آخر تک رسول کریم ﷺ کے اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ کلام کی رنگینی، برجستگی، سلاست، سادگی اور روانی حسب معمول پائی جاتی ہے۔ اس میں عقیدت مندانہ بے اعتدالی نہیں ہے شاعر نے آداب رسالت ﷺ کو ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے۔

باب ہشتم کو مقالہ نگار نے متوسطین کا دور قرار دیا ہے جس میں کرامت علی خاں شہیدی، مومن خان مومن، لطف علی خان لطف، غلام امام شہید شامل ہیں۔ مقالہ نگار کے خیال میں ادبی لحاظ سے نعت گوئی کے فروغ کی ابتداء کا شرف اس دور کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے بھی اسی انداز میں اس دور کو اہم قرار دیا تھا لیکن ان کی نظر شہید اور شہیدی تک محدود رہی جبکہ ڈاکٹر اشفاق نے مومن اور لطف کے ناموں کا اضافہ کیا ہے حالانکہ ان دونوں کی پہچان ان کی نعت گوئی کے سبب سے نہیں ہے۔

ڈاکٹر اشفاق نے مقالہ میں یہ خصوصیت ملحوظ رکھی ہے کہ ہر باب کی ابتداء میں اس دور کی خصوصیات اجمالاً بیان کر دی ہیں۔ اس دور کی خصوصیات کا حوالہ دیتے ہوئے پہلی بات یہ لکھی ہے کہ

"جو اثرانگیزی اس زمانہ میں نعتیہ کلام کو حاصل ہوئی وہ اس سے پہلے کہیں نظر نہیں آئی۔" (ص ۲۲۳)

لیکن اپنے اخذ شدہ نتیجہ کے اسباب پر غور نہیں کیا۔ ہمارے خیال میں ادوار ما قبل میں نعت کے مقاصد تبلیغ، تعلیم اور ذات رسول پاک ﷺ کا جاں گزیں ہونے والا تعارف تھا۔ اس میں حقیقت بیانی زیادہ اور شاعری نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیر بحث دور میں زبان اور بیان کی خوبیوں کے ساتھ شاعرانہ خصوصیات سے زیادہ کام لے کر اثرانگیزی کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جانے لگی، مقالہ نگار نے اس دور کی خصوصیات حسب ذیل بیان کی ہیں۔

زبان صاف، شستہ ہے تشبیہات اور استعارات کی قدرت اور رنگینی ہر دور کی نسبت زیادہ ہے۔

نعتیہ شاعری کے رنگ تغزل میں اضافہ ہوا ہے۔
کلام میں اثر، خلوص اور معنویت زیادہ ہے۔
ایک عرصہ کی معاشرتی بدحالی کے بعد سیاسی اور معاشی تباہ حالی نے مذہبی رجحانات
کو جھنجھوڑا اور مذہبی ادب کو فروغ دیا ہے۔ (ص ۲۲۴)
کرامت علی خاں شہیدی شاگرد مصحفی کے تھے ان کا نام جس طرح غزل گوئی میں مستند ہے اسی طرح نعت گوئی میں معتبر ہے ان کا یہ شعر احوال واقعی کے اعتبار سے مشہور ہے۔

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

کہا جاتا ہے کہ حج کے بعد مدینہ جا رہے تھے کہ چار صفر ۱۲۵۶ھ کو جب اس مقام پر پہنچے جہاں سے پہلی نظر روضہ اقدس پر پڑتی ہے تو مقید طائر روح قفس جسد خاکی توڑ کر پرواز کر گیا۔

شہیدیؔ کا سرمایہ نعت ایک ۱۳۳ اشعار کا قصیدہ اور ایک نعتیہ غزل ہے۔ ان کے خلوص و عقیدت نے اس مختصر سرمایہ کو ان کے لئے وجہ افتخار بنا دیا ہے۔ یہ بات نا قابل فہم ہے کہ مقالہ نگار نے شہیدیؔ کی نعت گوئی کی حد تک اپنے قلم کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان کی عشقیہ شاعری یعنی عام غزل گوئی پر بھی تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

مومن بھی عشقیہ شاعری کے منفرد انداز کے شاعر ہیں ان پر مذہب کا رنگ چڑھا ہوا ضرور تھا لیکن ان کی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل اور تغزل سے مامور ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری میں ایک قصیدہ، ایک تضمین، ایک مثنوی اور چند رباعیاں ملتی ہیں۔ آغاز غزلیات میں حمد کے ساتھ نعت کے چند شعر بھی ملتے ہیں۔ نعتیہ کلام مختصر ہونے کے باوجود لائق توجہ ہے۔

مومن جب بارگاہِ نبوی ﷺ میں جذبہ عشق کو لئے ہوئے پہنچتے ہیں تو جذبات کو روکتے ہوئے طوفان کو سمیٹتے ہوئے، جمال عالم افروز کے جلال سے کانپتے ہوئے باادب باملاحظہ نغمہ سنجی کرتے ہیں۔ شاعر غلام اور آقا کے حدود کو پہنچانتا ہے اور اس کا احساس بھی شدت سے رکھتا ہے۔ وہ فقط ایک نظر کرم کے لئے بے چین ہے اور بس یہی اس عشق کا حاصل ہے۔ (ص ۲۳۳) مومن کی مثنویوں میں بھی حمد اور اس کے بعد نعت ہے مقالہ نگار نے مومن کی مثنوی نگاری پر بھی بحث کی ہے ایک مثنوی میں بطرز ساقی نامہ نعت کے ۱۸۳ اشعار کی نشاندہی کی ہے (ص ۲۳۹) لیکن حیرت ہے کہ مثنوی کا نام یا عنوان نہیں لکھا۔ پی ایچ ڈی کے مقالہ میں ایسی سہو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ مومن کے اشعار میں شمائل نگاری یا سراپا نگاری بھی پائی جاتی ہے۔ وہ بیان کو منطقی رنگ دے کر دلیل سے اسے نہایت قوی اور ذہن نشیں بنا دیتے ہیں جس مضمون کو کہ رسول کریم ﷺ کے قد کا سایہ نہ تھا قوی دلائل کے ساتھ باندھا ہے اور اس ایک مضمون میں کئی مضامین

پیدا کئے ہیں۔(ص ۲۴۰)

لطف علی خاں لطف اس لحاظ سے اہم ہیں کہ

"جن شعرائے نعت کو اپنے کلام میں مستقل حیثیت دی اور اس میں وسعت پیدا کی وہ غلام امام شہید کے ساتھ لطف علی خان لطف ہیں۔ لطف نے نعت گوئی کو شاعری کے لئے مخصوص کر لیا۔" (ص ۲۴۹)

شاعری میں اپنے آپ کو نعت کے لئے مخصوص کر لینا حضور ﷺ سے حد درجہ عقیدت اور محبت کی علامت ہے اور ایسے شاعروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے جن کا کلام نعت کے لئے مخصوص یا شاعری کا غالب عنصر ہو لطف اس لحاظ سے بلاشبہ ممتاز ہیں اور خراج تحسین کے مستحق ہیں لیکن ان کے ذکر سے ماقبل کی تصانیف خالی ہیں یہ ڈاکٹر اشفاق کا وسیع مطالعہ ہے کہ انہوں نے اس جوہر خاص کو تلاش کر لیا ہے۔ لطف کو بھی ناز تھا تو اس بات پر کہ

لطف یہ شہرت ہوئی حاصل بدولت نعت
ہر کوئی کہتا ہے کہ مداح رسول اللہ ہے

(ص ۲۴۹)

ان کے کلام میں حضور ﷺ سے محبت کی وابستگی کا دعویٰ بھی ہے ان کی سراپا نگاری بھی ہے۔ زیادہ تر داخلی جذبات کا اظہار ہے۔ شاعر کے تخیل کی والہانہ سرمستی، جذب، کیف اور اظہار عقیدت، صفات کا کماحقہ بیان موجود ہے۔ شاعرانہ خصوصیات میں رعایت لفظی کی کثرت ہے۔ مقالہ نگار نے متوازن تبصرہ کے ساتھ اپنے خیال کی تائید میں اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

اس دور کے سب سے ممتاز شاعر مولوی غلام امام شہید ہیں۔ رسول اکرم ﷺ سے ان کی شیفتگی اور فدائیت اس درجہ پہنچی ہوئی تھی کہ بجز نعت شریف لکھنے اور پڑھنے کے اور کوئی شغل نہ تھا۔ اسی سبب مداح نبی و عاشق رسول کے مبارک القاب سے مشہور تھے۔ ان کے یہاں قصیدہ، مثنوی، غزل اور ترجیع بند سب میں نعت ملتی ہے۔ مولود شریف ان کی سب سے مقبول تصنیف ہے جو اتنی مرتبہ چھپی ہے کہ اس کا شمار بھی ممکن نہیں۔ ان کے علاوہ غزلیں اور قصائد بھی ہیں۔ شہید کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اصناف نعت میں شاعرانہ رنگ آمیزی سے انہیں حسین تر بنا دیا۔ تشبیہات اور استعارات سے کلام کو سنوارا اور اس کے بیانیہ انداز میں شاعرانہ طرز اختیار کیا۔ ہر موضوع میں شاعر کے اپنے والہانہ داخلی جذبات کا اظہار ہے۔ مقالہ نگار کی رائے ہے کہ

"شہید کو اس لحاظ سے نعتیہ شاعری میں اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے سراپا کے بیان میں شاعرانہ طرز بیان اختیار کیا ہے اور جمال محمدی کو دلربایانہ بنا کر پیش کیا

ہے۔بایں ہمہ ان کے یہاں وہ ناہمواری کہیں نظر نہیں آتی جو بعد کے شعراء نے اس رنگ کے ناکام تتبع کی کوشش میں اپنے کلام میں پیدا کرلی ہے۔" (۲۷۰)

نعت میں شہید کی فوقیت کئی اعتبار سے ہے انہوں نے مختلف النوع قابل تقلید نمونے چھوڑے ہیں۔ مقالہ نگار نے ہر پہلو سے ان کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔

اس دور کے ان اہم شاعروں کے جلو میں نسبتاً کم اہم شاعروں میں راجہ مکھن لال مکھن، نواب اختر محل اختر، منشی شنکر لال ساقی کے نام بھی شامل ہیں۔ عموماً خواتین اور غیر مسلم شعراء کے ذکر الگ کیے جاتے ہیں۔ مقالہ نگار نے اس طرز کے برخلاف عہد اور شاعرانہ خصوصیات کے لحاظ سے انہیں جگہ دی ہے۔

باب ہفتم متاخرین پر مشتمل ہے جس کے دو اہم ترین نام امیر مینائی اور محسن کاکوروی ہیں۔

"یہ دور اس لحاظ سے بھی ممتاز ہے کہ یہاں نعت گو شعراء کا وہ طبقہ فروغ پاتا ہے جس نے حب رسول کے والہانہ اظہار میں مناسب اور نامناسب کے امتیاز کو نظر انداز کر دیا اب داخلی جذبات کے اظہار میں وہ مضامین بھی جگہ پانے لگے جن کی تشریح تصوف کی زبان میں ہو سکتی ہے ان کا جواز شریعت میں کہیں نہیں ملتا۔"

اس دور میں زبان اور مضمون دونوں میں تصنع غالب ہے۔ حضور ﷺ کی ذات سے احترام و عقیدت کم اور جذبات وارفتگی میں مجاز کا رنگ غالب ہے۔

امیر مینائی کثیر التصانیف ہیں ان کی ۱۷ یادگار کتب ہیں جن میں محامد خاتم النبیین (مطبوعہ ۱۸۷۳ء) ان کا نعتیہ دیوان ہے۔ وہ شہیدیؔ اور محسن کاکورویؔ دونوں سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر فرمان نے لکھا ہے کہ محسن کی صحبت کے فیض سے نعت کی طرف مائل ہوئے جبکہ ڈاکٹر اشفاق کا بیان ہے کہ ان کا پہلا قصیدہ شہیدیؔ کے اس مشہور قصیدہ کی تقلید میں ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے۔

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کے مد کا سر دیوان لکھا ہے میں نے مطلع نعت احمد کا (ص ۲۹۱، ۲۹۲)

محسن کاکوروی نے بھی اپنا قصیدہ اسی طرح لکھا تھا۔

مٹایا لوح دل سے نقش ناموس اب وجد کا دبستان محبت میں سبق تھا مجھ کو ابجد کا (ایضا)

امیر مینائی نے محسنؔ کے قصیدے پر ایک تضمین بھی لکھی تھی لیکن شہیدی کے حسن خاتمہ پر رشک کرتے ہوئے کہا تھا۔

در شہ پر اجل اے کاش میسر ہوتی میری تربت بھی شہیدیؔ کے برابر ہوتی

امیر مینائی اور محسن دونوں پر لکھنؤ کے انداز شاعری کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ لفظی رعایتیں اور صنعتیں بکثرت ملتی ہیں۔ ایک ہی مضمون کو سو طرح باندھنا ان کے ذہن رسا کی دلیل ہے۔ لیکن یہ طور بھی تصنع اور لفظی ہنر گری کا مرہون منت ہے۔ امیرؔ کے ہاں حسن تعلیل کی مثالیں زیادہ ہیں۔

امیرؔ نے صرف ۳ نعتیہ قصائد لکھے ہیں جبکہ ان کے یہاں نعتیہ غزلوں کی تعداد زیادہ ہے۔ غالباً ڈاکٹر اشفاق کی نظر سے حسرت موہانی کی وہ تنقید نہیں گزری جس کا ذکر اس سے پہلے کیا گیا، اچھا ہوتا وہ اس اختلافی رائے پر اظہار خیال کرتے۔

محسنؔ کاکوروی کی ۲۳ شعری تصانیف کا ڈاکٹر اشفاق نے حوالہ دیا ہے جن میں اکثریت نعتوں پر مشتمل ہے۔ ان کی نعتوں میں صناعی کے نادر نمونے ہیں جو دبستان لکھنؤ کی شان ہے۔ ان کی نعت گوئی کی ابتداء سولہ سال کی عمر سے ہوئی اور وہ زندگی بھر اس صنف شاعری کے لئے وقف ہو رہے۔ ان کی نعتیں سچے خلوص، عقیدت اور محبت پر مبنی ہیں۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مطالب بیان کرنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ لکھنؤ کی زبان کا نکھار ان کے اشعار کا خاص وصف ہے۔ محسنؔ نے نعتیہ قصائد میں نئے نئے تجربے کئے ہیں ان کا لامیہ قصیدہ جس میں ہندوانہ صنمیات کا ذکر ہے ایک تجربہ ہے جو شاعرانہ نقطہ نظر سے کامیاب لیکن عقیدے کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ہے۔ جہاں قرآنی تلمیحات سے کام لیا ہے وہاں ان کا قرآن کے مضامین اور مطالب پر عبور ظاہر ہوتا ہے وہ مشکل سے مشکل معنوں کو آسان پیرایہ میں بیان کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں باوجود اس کے کہ ڈاکٹر اشفاق نے "مدیح خیر المرسلین" یا لامیہ قصیدہ کی تعریف بھی کی ہے اور اس کے صنمیات والے حصہ کو اردو شاعری میں اضافہ قرار دیا ہے یہ اعتراضات بھی کئے ہیں کہ

(۱) اس قصیدے کی تشبیب مدح سے زیادہ طویل ہے "اس کے ۱۴۲ر اشعار ہیں جن میں تشبیب کے ۷۸ اشعار ہیں۔ اسی طرح گریز کے بعد مدح کے مضمون تک پہنچتے پہنچتے ۶۴ ابیات سے گزر جانا پڑتا ہے۔" (ص ۳۲۷)

(۲) تشبیب مدح کے رنگ کے مطابق نہیں اور مدح کی طرف رہنمائی نہیں کرتی۔

(۳) گریز میں کوئی جدت نہیں ہے اور وہ ذہن کو تشبیب کے مضامین سے منحرف ہو کر مدح قبول کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہے۔

جہاں تک قوت بیان کا تعلق ہے محسنؔ کا مزاج قصیدہ گوئی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان قصائد میں شان بھی ہے اور عقیدت بھی! ڈاکٹر اشفاق کا تجزیاتی مطالعہ غیر جانبدارانہ اور متوازن ہے۔ ان کی رائے میں یہ خصوصیت نہیں کہ دوسرں کی کھینچی ہوئی لکیر کو پیٹتے رہیں۔

محسنؔ کی کئی چھوٹی چھوٹی مثنویاں بھی ہیں یہ بھی قصیدہ کی شان رکھتی ہیں۔ مثنوی کی تمام خصوصیات پر مقالہ نگار کی نظر رہی ہے اور انہوں نے ان خصوصیات کو تفصیل سے بیان بھی کیا ہے۔ (ص ۳۳۳)

> "جہاں تک محسنؔ کی کردار نگاری کا تعلق ہے تو وہ حدیث اور قرآن کی بنیاد پر نہایت مستحکم ہے شاعر کے تخیل کی رنگ آمیزی نے اس میں ناہمواریاں کہیں

پیدا نہیں کیں۔" (ص ۳۳۳)

محسن کی سراپا نگاری تشبیہوں اور استعاروں میں کھو جاتی ہے۔ لفظی مناظر میں شاعر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے لیکن جمال محمدی علیہ کی ایک جھلک دکھانے میں بھی کامیاب نہیں ہوتا۔ (ص ۳۳۵)

محسن کاکوروی کی نعت گوئی کے بارے میں حسن و قبح کی نشاندہی اس قدر واضح انداز میں عام طور پر نہیں کی جاتی۔ ڈاکٹر اشفاق نے ہر پہلو پر نظر کی ہے اور مناسب رائے دہی سے گریز نہیں کیا ہے۔

اس عہد کے ایک متنازعہ شاعر میر اعظم علی خان شائق بھی ہیں جو مزاجاً غزل کے شاعر ہیں اور داخلی جذبات کو پیش کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام بھی حقائق کے اعتبار سے خالی اور جذبات سے مملو ہے۔ اگرچہ ان کے کلام میں محاسن کی کمی نہیں لیکن کلام ناہمواری سے مبرا بھی نہیں ہے۔ (۳۳۹) الفاظ کے استعمال میں قطعی احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ ڈاکٹر اشفاق نے جذبات نگاری کی تعریف تو کی ہے لیکن لفظی بے احتیاطی کی جس طرح نکتہ چینی کرنا چاہئے تھی نہیں کی۔ حضور علیہ کی شان میں نعتیہ غزل کہتے ہوئے "مرے بانکے" "یار طرح دار" "رنگیلے بانکے میاں" جیسے الفاظ کا استعمال کر جاتے ہیں تو ہر قاری کے طبع نفاست پسند پر یہ تازیانہ کا کام کرتے ہیں۔ انہوں نے نعت کی ہیئت میں ٹھمری کا اضافہ بھی کیا ہے ان کی ٹھمریوں میں وہی رنگینی اور شوخی اور بے تکلفی ہے جو ہندی شاعری کا وصف خاص ہے ان میں سے ایک ٹھمری میں حضور "ساجن" ہیں اور ہر مصرعہ میں اس کی تکرار ہے۔ جدت طرازی اور مقامی رنگ کی وکالت پر اس طرز شاعری کی حمایت ممکن ہے شاعری کے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہو لیکن پاس ادب کے لحاظ سے لائق ملامت ہے۔ ہر لفظ کا ایک بھرم ہوتا ہے اس کے استعمال کی ایک سطح ہوتی ہے بلند سطح کے حضرات کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ کمترین سطح کے افراد کے لئے جوڑ نہیں کھاتے تو کمتر افراد کے لئے مستعمل الفاظ و القاب کو اعلیٰ ترین کے لئے استعمال کرنا بھی زیب نہیں دیتا۔ اس کو کیا کہا جائے کہ سو ادب کو ترقی پسندی مان لیا گیا ہے۔

اس عہد کے ایک کم معروف شاعر ابوالعلائی صحو بھی ہیں جو مستقل نعت کے شاعر نہیں ہیں لیکن متصوفیانہ شاعری ان کا وصف خاص ہے کہا جاتا ہے کہ بالارادہ کبھی شعر نہیں کہا ایک جذب و کیف اور سرمستی کے عالم میں جو نکل جاتا محفوظ کر لیا جاتا (ص ۳۴۸) ان کا جو نمونہ کلام ڈاکٹر اشفاق نے نقل کیا ہے اس میں کوئی غیر معمولی خصوصیت نہیں ہے البتہ "ان کے کلام میں جہاں بے پایاں خلوص اور عشق رسول پایا جاتا ہے وہاں وہ اظہار خلوص و محبت کی حدود سے بھی خوف واقف ہیں اور ہمیشہ بارگاہ نبوی کے آداب کو ملحوظ رکھ کر مناسب طرز خطاب اختیار کرتے ہیں۔ کلام میں کہیں بے اعتدالی نہیں۔" (ص ۳۵۱)

اس دور کے اہم شعراء نے نعت گوئی کے ایسے کامیاب نمونے پیش کئے اور ان کے اتنے چرچے ہوئے کہ اس صنف کی ادبی حیثیت مسلم ہو گئی اور نعت گوئی مذہبی ہی نہیں ادبی تحریک بن کر

بھری۔ ڈاکٹر اشفاق نے مقالہ کے اسی نکتہ پر زور دیا ہے اور اسے شواہد سے ثابت کیا ہے۔

آٹھواں باب ۵۰ صفحات (۳۵۳ تا ۴۲۰) سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے اس میں دور جدید کے شعراء پر گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ اس دور کے نعتیہ شاعری کے معماروں میں حالیؔ، شبلی اور نظم طباطبائی کو شامل کیا گیا ہے۔ حالیؔ کی طرز جدید کی شاعری، نظم گوئی اور قومی معاملات میں طبع آزمائی سے اردو دان طبقہ خوب واقف ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ "وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا" مسدس مسلمان بچوں کو ازبر کروایا جاتا تھا۔ حالیؔ کی شاعری اور مذکورہ مسدس کے احوال سے کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن ان کی نعت گوئی پر تفصیلاً تنقید و تبصرہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اشفاق نے اس کمی کو دور کیا ہے اور ان کے تمام نعتیہ کلام کو پیش نظر رکھ کر تجزیاتی مطالعہ (ص ۳۵۵ تا ۳۶۹) کیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق کی تحقیق کے مطابق حالیؔ کی پہلی کوشش قدسی کی مشہور نعتیہ غزل کی تضمین ہے جو ۱۸۵۶ء میں لکھی گئی جبکہ ان کی عمر صرف سولہ سال تھی اور وہ خستہ تخلص کرتے تھے۔ ان کے دیوان میں جو پہلا قصیدہ شامل ہے وہ ۱۸۶۴ء ۔ ۱۸۶۵ء کا لکھا ہوا ہے اس کا مطلع ہے۔

سخن زباں کے لئے اور زباں دہاں کے لئے بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لئے

یہ ۳۳ شعروں پر مشتمل نعتیہ قصیدہ عام روش پر لکھا گیا ہے اس میں حضور انور ﷺ کے شمائل، قرآن، جبرئیل، معراج، خلق عظیم، ذات کریم وغیرہ صفتی اوصاف اور متعلقات کا بیان ہے۔ (ص ۳۵۷) دوسرا قصیدہ ۸۸۔۱۲۸۷ھ میں لکھا گیا۔ دراصل اس کے ابتدائی اشعار جذبہ تفاخر کی تسکین کے لئے لکھے گئے تھے مگر جب اس غلطی کا احساس ہوا تو بات بنانے کے لئے نعتیہ اشعار کا اضافہ کر دیا اور دعویٰ کیا کہ نعت ہی اصل وجہ فخر ہے۔ اس قصیدے میں پر کیف جذبات اور قلبی واردات نہیں ہے سادگی، صفائی اور روانی ضرور ہے اور یہی اس قصیدے کا اصل جوہر ہے۔ (ص ۳۵۹) حالیؔ کی شاعری میں اسوہ حسنہ کا ذکر ضرور ہے لیکن یہ محض روایت کی پابندی نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے راہ کی روشنی کے طور پر لکھا گیا ہے ان کی نعت مدح تک محدود نہیں بلکہ وہ مقصدی بھی بن گئی اس نقطہ نظر سے حالی کے اشعار کو پیش کر کے ڈاکٹر اشفاق نے مدلل تبصرہ کا حق ادا کیا ہے۔ حالی کی مسدس میں نعتیہ حصہ قوت اظہار کا غماز ہے جو نتیجہ ہے اس خلوص و محبت کا جو ایک طرف حضور اقدس ﷺ سے تھی تو دوسری طرف اُمت مسلمہ سے تھی۔

"اس میں اسلوب بیان کی ندرت اور مضامین کی صداقت اپنے حسن انداز میں ہر جگہ جلوہ گر ہے اور وہ نعتیہ ادب میں اس حسن و خوبی سے کم ملتی ہے ساتھ ہی مسدس کے نعتیہ بند اپنی سادگی اور پرکاری کی وجہ سے امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں۔ مسدس کی ایک اور خصوصیت زبان کی سلاست، روانی اور بے ساختگی ہے۔" (ص ۳۶۵)

نعتیہ شاعری کے اس دور میں حالی کے ساتھ شبلی کا رنگ بھی اصلاحی ہے۔ ان کے ہاں تغزل نام
؛ نہیں ملتا جو نظمیں نعتیہ شاعری کے ضمن میں آتی ہیں ان کے عنوانات سے ہی ان کے انداز کا پتہ چلتا ہے
مثلاً ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، تعمیر مسجد نبوی ﷺ، خاتون کی آزادانہ گستاخی اور رسول ﷺ کا حلم و
عفو، اہل بیت رسول کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین مثال اور مساوات اسلام ــــــ شبلی کی نعت گوئی کا مقصد
حضور ﷺ کے مکارم اخلاق کی تعلیمات کو عام کرنا ہے۔ شبلی کا نعتیہ کلام کم ہے لیکن مقصدی ہے اور
سوز و گداز سے لبریز ہے۔ مقالہ نگار شبلی کی نعتیہ شاعری کی روح تک پہنچنے کی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔

اس دور کے جید عالم احمد رضا خاں بریلوی گزرے ہیں جو اپنے تبحر علمی کی وجہ سے زیادہ معروف
ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے کم مشہور ہیں۔ ان کے سوانح نگاروں نے دعویٰ کیا ہے کہ وہ ایک در جن سے زائد
علوم دینی اور علوم دنیوی پر کامل دسترس رکھتے تھے ان کے علاوہ عربی اور فارسی کو بھی اردو کی طرح بے
ساختگی اور برجستگی سے استعمال کرتے تھے ان کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی
ہے کہ ان کا کلام عام ذہنی سطح اور علمی استعداد سے بہت بلند ہے۔ نعتیہ کلام میں ان کا دیوان حدائق
بخشش ہے جس میں قصیدے، مثنویاں، خمسے، مسدس، قطعات اور رباعیات وغیرہ مختلف اصناف سخن
ہیں۔ عربی اور فارسی کلام بھی ہے لیکن کم۔ البتہ قطعات تاریخ ان زبانوں میں زیادہ ہیں اور مسلسل کئی کئی شعر
تاریخی ہیں جن کا انہیں بے حد شوق تھا۔ اکثر اشعار سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔ محاورات کی بھی کثرت ہے۔
ان میں سے بعض زیادہ مستعمل بھی نہیں ہیں۔ ان کے تبحر علمی کا یہ حال ہے کہ بعض قصیدے بغیر تشریح
کے سمجھ میں نہیں آتے۔ ڈاکٹر اشفاق نے ان تمام خصوصیات کی کلام میں موجودگی کا اعتراف کیا ہے اور وہ
بھی پاس ادب کے ساتھ!

سید علی حیدر نظم طباطبائی اردو کے فراموش کردہ شاعروں میں سے ایک ہیں انکے تبحر علمی اور
فن شاعری پر عبور کے علاوہ اظہار کی قوت میں ان کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا اندازہ حسرت موہانی کے ان
الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے:

> "اردو شاعری میں مرحوم (نظم طباطبائی) کا پایہ سخن بہت بلند تھا۔ راقم حروف کی
> رائے میں امیر، داغ، جلال، تسلیم اور حالی کے بعد ان کے طبقہ شعراء میں مائل
> دہلوی، نظم لکھنوی اور شاد عظیم آبادی بے شک استاد کہلانے کے مستحق تھے۔
> ۱۹۰۳ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک سیکڑوں بلکہ ہزاروں نوخیز شاعروں نے راقم
> سے اصلاح کلام کی درخواست کی لیکن راقم نے ہمیشہ اپنے کو ازراہِ انکسار نہیں بلکہ
> واقعی اس خدمت کے ناقابل پایا اور ہر طالب اصلاح کو یہی جواب لکھ بھیجا کہ استاد
> کامل کی تلاش ہے تو سید علی حیدر نظم طباطبائی کے شاگرد ہو اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو

پھر جلیل کو اپنا کلام دکھاؤ۔"

(حسرت موہانی۔ مضمون، نظم طباطبائی، مشمولہ رسالہ اردوئے معلّیٰ، مئی جون ۱۹۳۳ء بحوالہ تذکرۃ الشعراء از حسرت موہانی مرتبہ شفقت رضوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۶)

حسرت موہانی اور ڈاکٹر اشفاق جیسے حق شناس ہی حقیقی عالموں کے قدر شناس ہیں۔ طباطبائی کی عظمت کا دارومدار ان کی نظموں پر ہے اور جدید اردو شاعری میں ان کا ممتاز مقام بھی اسی بناء پر ہے۔ انہوں نے مناظر قدرت اور دیگر موضوعات پر کثرت سے نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے کلام سے علم و فضل کی گہرائی، دقت نظری اور اعلیٰ مذاق سخن کا ثبوت ملتا ہے۔ قصیدہ نگاری جتنا مشکل فن ہے انہوں نے اسے اتنا ہی آسان طریقے سے برتا ہے۔ وہ اشعار کا ڈھیر لگاتے جاتے ہیں اور بہتر سے بہتر الفاظ سے مضامین کو سنوارتے جاتے ہیں بایں ہمہ پڑھنے والے کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کے الفاظ اور محاورات کے خزانے میں ذرا بھی کمی واقع ہوئی ہے۔ (ص ۳۹۴) ان کے مجموعہ کلام "صوت تغزل" میں نعتیہ کلام برائے نام ہے "مجموعہ نظم" میں نعتیہ قصیدوں کی تعداد سات ہے۔ جن کے عنوانات یہ ہیں (۱) ذکر بعثت و فتح مکہ (۲) قصیدہ معراج (۳) ہجرت و غزوہ بدر (۴) عہد جاہلیہ کا کفر اور پیغمبر مجاہد (۵) قصیدہ حزاب (۶) قصیدہ خیبر (۷) قصیدہ حنین۔

"نظم کا شمار ان نعت گو شعراء میں ہے جنہوں نے حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے لیکن اس میں بھی نظم کو اس لحاظ سے ممتاز حیثیت حاصل ہے کہ انہوں نے اس بیان کے لئے سب سے زیادہ مشکل صنف سخن کو اختیار کیا جو قصیدہ ہے حالانکہ اس قسم کے مضامین کے لئے مثنوی کو زیادہ موزوں سمجھا جاتا ہے۔" (۳۹۵)

طباطبائی کے قصائد میں نہ تو تشبیب کے حسن میں اور نہ مدح سے اس کی مناسبت میں کلام ہو سکتا ہے نہ گریز کی صورت میں قباحت دکھائی دیتی ہے اور نہ مدح کے مضمون پر حرف گیری کی جاسکتی ہے کلام میں گہرائی، گیرائی، علمیت اور شعری صلاحیت نظم کی اعلیٰ قابلیت کے گواہ ہیں۔

مقالہ نگار نے نظم کے ساتوں قصائد کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے ان کے اجزا کو بطور دلیل بنا کر تبصرہ کیا ہے اور ہر لحاظ سے ان خصوصیات کو اجاگر کیا ہے جو نظم کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح نظم طباطبائی کے مقام کے تعین کا حق ادا کیا ہے۔ تبصرہ کا وہ حصہ دلچسپ اور فکر انگیز ہے جس میں نظم کے نعتیہ قصائد کا موازنہ محسن کے قصائد سے کیا گیا ہے۔ دلائل کے ذریعہ نظم کی برتری ثابت کی ہے۔ (ص ۴۰۳ تا ۴۰۵)

اس دور کے شاعروں میں مقالہ نگار نے محمد شمس الدین امیر حمزہ کو بھی شامل کیا ہے جن کا مجموعہ کلام "چمنستان حمزہ" ۱۳۳۷ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں نعتیہ غزلیں، قصیدے، مرثیے، ٹھمریاں وغیرہ ہیں۔ نعتیہ کلام میں کوئی انفرادی خصوصیت نہیں ہے۔ ان کی ٹھمریاں کم ذہنی سطح کے لوگوں میں مشہور ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا موسیقی اور رقص نعت کے لئے موزوں ہیں بھی یا نہیں۔ جدت پسندی کے نام پر اس طرح کے تجربے ہوتے رہے ہیں خواص نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ ڈاکٹر اشفاق نے انہیں اور اس قسم کے شاعروں کو صرف مقالہ کی تکمیل کی خاطر در خور اعتنا سمجھا ہے ان کی احتیاط پسندی کا یہ حال ہے کہ جن باتوں کی مذمت ہونا چاہئے ان کے اظہار سے گریز کرتے ہیں اور اگر توصیف کا پہلو نکالتے ہیں تو بات نہیں بنتی۔ ممکن ہے جامعاتی مقالے احتیاط پسندی کا تقاضہ کرتے ہوں یہ علم و ادب کے لحاظ سے قابل قدر ہرگز نہیں۔ امیر حمزہ کی ٹھمریاں ہندی میں ہیں ان کی زبان، لہجہ اور دیگر خصوصیات ہندی سے میل کھاتے ہیں اس نوع کے کلام کو اردو میں شائع کرنا ویسے بھی زیادتی ہے۔ ڈاکٹر اشفاق نے ان کی ٹھمریوں کے بارے میں لکھا ہے:

"حمزہ کا ایک رنگ یہ بھی ہے کہ وہ الفاظ سے حرکت، رقص اور کیفیت انگیز صوتیات کا سماں باندھتے ہیں نعت کا یہ انداز شاعر کی اس صلاحیت کا پتہ دیتا ہے کہ جس کا ثبوت ان کے ڈراموں میں ملتا ہے۔" (ص ۴۰۹)

اگر کسی کو ڈرامہ بازی کرنا ہے تو ضرور ڈرامہ بازی کرے یہ کیا ضروری ہے کہ نعت جیسے پاکیزہ اور مقدس صنف کو بھی ڈرامہ بازی کے لئے استعمال کیا جائے۔

اس دور کے ایک اور شاعر محمد مظفر الدین معلی ہیں جن کا مجموعہ کلام "ریاض معلی" ہے جو ۱۳۴۰ھ میں طبع ہوا اس کے پہلے حصے میں نعتیہ کلام ہے دوسرے اور تیسرے حصے میں دیگر اصناف ہیں کہا جاتا ہے کہ موجودہ کلام کے علاوہ ان کے دو نعتیہ دیوان تھے جو موسیٰ ندی کی طغیانی میں تلف ہو گئے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پر گو شاعر تھے۔ ڈاکٹر اشفاق نے ان کے کلام کے مطالعہ کے بعد نتیجہ اخذ کیا ہے کہ:

"معلی کے یہاں محبت کی فراوانی، جذبات کی روانی، خیال کی بلندی، اور نعت کے مضامین پر احاطہ کما حقہ پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی زندگی کا تقویٰ بارگاہِ رسالت میں پہنچنے کے لئے مزاج میں طہارت کا سامان کر رہا ہے۔ (ص ۴۱۷)

اس قسم کے توصیفی جملے پاسداری میں لکھے جاتے ہیں غالب گمان یہی ہے کہ معلی کے بیان میں بھی اسی کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

نواں اور آخری باب دور حاضر کی نعت گوئی کے حوالہ سے ہے یہ کتاب کا طویل ترین باب ہے جو ص ۴۲۱ سے ص ۶۶۸ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں معروف اور غیر معروف، اہم اور غیر اہم شعراء کی تعداد

دودر جن کے قریب ہے۔ ڈاکٹر اشفاق کے خیال میں:

"دورِ حاضر نعتیہ شاعری کے لئے انتہائی عروج کا زمانہ ہے جس نے اقبال، عزیز لکھنوی، ظفر علی خاں، امجد حیدر آبادی، حفیظ جالندھری اور ماہر القادری وغیرہ جیسے نامور شعراء پیدا کئے۔ ان اصحاب نے حضور ﷺ کی سیرت کو مصلحانہ، حکیمانہ، اور استادانہ رنگ میں پیش کیا اور نعتیہ ادب کو شعری دلآویزیوں سے مالا مال کر دیا۔" (ص ۶۷۴)

مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی نے ان تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی عظمت کا دارومدار ان کے قصائد پر ہے۔ انہوں نے نظمیں بھی اچھی لکھی ہیں۔ غزل گوئی میں ان کا شمار اردو کے ان نامور شعراء میں ہے جنہوں نے دورِ جدید میں غزل کی اصلاح میں سعی بلیغ کی ہے ان کی غزلوں کا مجموعہ "گل کدہ" اور قصائد و سلام کا مجموعہ "صحیفہ ولا" چھپ چکے ہیں۔

صحیفہ ولا میں نو نعتیہ قصائد، چار نعتیہ نظمیں اور چند قطعات و رباعیات ہیں۔ کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے ان کا کلام نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ مقالہ نگار نے عزیز کے قصائد پر رائے دینے سے قبل قصیدہ کی فنی ضروریات، اس کی روایتی خصوصیات اور اردو کے اہم قصیدہ گو شاعروں کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان تمام باتوں کے تناظر میں عزیز کے قصیدے کا مطالعہ اسے جاندار بنا دیتا ہے۔ ان کے قصائد کی تشبیبیں عموماً یا تو بہاریہ ہوتی ہیں یا تغزل کے رنگ میں۔ عزیز کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ بیان کو مکالمے کا رنگ بھی دیتے ہیں اس طرح تشبیب میں زورِ بیان سے اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں (ص ۴۲۶) قصیدہ "حسن و عشق" اور قصیدہ "بہار ربیع" بہاریہ ہے دیگر قصائد کی تشبیب کا رنگ غزلیہ ہے۔ مضامین نہایت شگفتہ اور شباب کی تمناؤں کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کی گہرائی شاعر کی عمیق نظری کا پتہ دیتی ہے۔ بیان کی قدرت اور ندرت اپنی دلآویزی سے تاب کی کیفیت میں گرمی پیدا کر دیتی ہے (ص ۴۲۸) حقیقت میں قصیدہ گو کی صلاحیت کی کسوٹی گریز ہے۔ گریز کی بدیع صورتوں کے ذریعے تشبیب اور مدح کے مضمون کو جس قدر ہم آہنگ دکھایا جائے گا اسی قدر شاعر کے کمال کا اعتراف کیا جائے گا۔ عزیز کے یہاں گریز کے اچھے نمونے ملتے ہیں (ص ۴۲۹) ان کے یہاں مدح میں نہ تو مبالغہ کا گزر ہے اور نہ تصنع کو دخل بس حقیقت حال کا بیان ہے اور خلوص کی زبان ہے۔ زبان نہایت صاف، سلیس اور لفظی صنائیوں سے پاک ہے (ص ۶۳۱) مقالہ نگار نے بہت دل لگا کر عزیز کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور جاندار انداز میں اس کا تعارف پیش کیا ہے۔ انہوں نے شاعری پر نگاہ نہیں رکھی بلکہ اصناف سخن کی خصوصیات کو بھی ملحوظ رکھ کر عزیز کے کلام میں انہیں تلاش کرنے اور بیان کرنے کی سعی کی ہے جس میں وہ کامیاب رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے ممتاز شاعروں میں اقبال بھی ہیں لیکن اردو میں ان کا نعتیہ کلام بہت کم ہے یہی وجہ

ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت سے انکار نہیں تو دوسری طرف اردو اشعار کے حوالہ سے اس مرتبہ کو ثابت کرنا آسان نہیں۔ اقبال پرستی کو شعار بنانے والے یا تو ان کی فارسی شاعری میں ڈوب جاتے ہیں یا غیر متعلق مضامین شاعری کا ذکر لے بیٹھتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں حضور علیہ السلام کے نام کے حوالہ اور صفات کے حوالے زیادہ ہیں اذکار کم ہیں۔ وہ امت مسلمہ کو ان کا پیروکار باور کرتے ہوئے ان کی ذات کو غیرت دلانے کے مقصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جس کا نعت میں شمار ممکن نہیں۔ مقالہ نگار نے اقبال کی اس کیفیت کی طرف اشارہ ضرور کیا ہے لیکن یہ واضح الفاظ میں نہیں ہے البتہ یہ بات درست لکھی ہے کہ "اقبال کے نعتیہ کلام میں حکمت آفرینی کی مثالیں جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ وہ ہر مضمون میں اسی فکر و نظر کی ترجمانی کرتے ہیں جو ان کے فلسفہ حیات سے متعلق ہے۔" (ص ۴۴۸)

ظفر علی خاں کی شاعری ان کے ذاتی تاثرات کی عکاس ہے۔ ان میں تمام دنیاوی تاثرات پر غالب مذہبی تاثرات ہیں۔ وہ اسلام اور اس سے متعلقہ ہر چیز سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ اسی صورت میں حب رسول کا گہرا نقش بھی ان کی ذات میں موجود تھا۔ انہوں نے جابجا حضور علیہ السلام کی مدح کی ہے ان کے مجموعہ ہائے کلام بہارستان اور چمنستان میں بے شمار نظمیں حضور علیہ السلام کی مدح خوانی میں موجود ہیں۔ ان کے کلام میں حضور علیہ السلام کے حقیقی اوصاف، آپ سے متعلق درست واقعات اور جابجا قرآن و حدیث کی تلمیحات ملتی ہیں۔ حالی کی طرح انہوں نے بھی نعتیہ مضامین تو عام فہم سادہ اور صاف بنا کر پیش کیا ہے۔ حالی کے یہاں کہیں کہیں جوش بیان ہے تو ظفر علی خاں کے یہاں بیان کا جوش ہی جوش ہے۔ مقالہ نگار نے خصوصیات کلام بیان کرتے ہوئے اشعار کے حسن انتخاب کا بھی ثبوت دیا ہے۔

سید احمد حسین امجد حیدر آبادی اپنے دور کے ہی سب سے بڑی رباعی گو شاعر نہیں ہیں بلکہ ہر دور کو ملحوظ رکھا جائے تب بھی وہ اس فن میں ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا تمامتر کلام معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ تاثیر کے بغیر شاعری کو بے معنی خیال کرتے ہیں۔ امجد نے ہر صنف میں نعتیہ اشعار لکھے ہیں ان کا کوئی مجموعہ نعتیہ اشعار سے خالی نہیں ہے اور انہیں اگر ناز رہا تو اسی بات پر کہ وہ ثناء خوان رسول عربی ہیں۔ وہ حب نبی کے مضامین کو نئے نئے رنگ اور نئے نئے انداز میں بیان کرتے ہیں لیکن کہیں بھٹکتے نہیں۔ ان کی سلاست ہی ان کی صالح فکر کی غماز ہے۔ مقالہ نگار نے کلام کے طویل اقتباسات دیتے ہوئے ایک ایک خصوصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس دور کے غیر مسلم شعراء میں کشن پرشاد شاد، دلورام کوثری بھی شامل ہیں۔ فن کے لحاظ سے شاد کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہے۔ حضور علیہ السلام کی ذات سے ان کی والہانہ محبت بھی ایک معلوم عام حقیقت ہے انہوں نے کثرت سے نعتیہ غزلیں کہی ہیں۔ ہدیہ شاد اور خمکدہ رحمت ان کے نعتیہ کلام کے مجموعے ہیں۔ مقالہ نگار نے ہدیہ شاد سے استفادہ کیا ہے تمام اشعار اسی سے نقل کئے ہیں۔ مقالہ نگار نے شاد کے کلام

ما یہ خصوصیات پائی ہیں۔

رسول کریم سے محبت کا اظہار ___ اس جذب و شوق میں توحید کی طرب انگیزی (ص ۴۹۲)

وہ رسول کریم کے حلقہ بجوشوں میں شامل ہونے کے بعد بھی اپنے کفر کی بناء پر نفسیاتی طور پر شہنشاہ لولاک سے شدید دوری کا احساس رکھتے ہیں۔ (ص ۴۹۳)

کلام میں زیادہ تر داخلی بات کی ترجمانی ہے۔ (ص ۴۹۴)

شعرا نے معبود اور عبد کے امتیاز کو ختم کر کے نعت گوئی کی ہے اس کی بے شمار مثالیں شاؔد کے کلام میں ہیں۔ (ص ۴۹۴)

مشکل زمینوں میں بھی اچھے شعر کہے ہیں۔ (ص ۴۹۵)

شمائل یا سراپا نگاری میں بھی کمال دکھایا ہے۔ (۴۹۵)

عبدالقدیر حسرت حیدر آبادی نے عربی، فارسی، اردو اور ہندی میں نعت گوئی کی ہے۔ مقالہ نگار نے ان سب کا ذکر کیا ہے لیکن خصوصیات صرف اردو اور ہندی کلام کی بیان کی ہیں۔ حسرت کی اردو نعت میں سنجیدگی، خلوص اور حلاوت ہے جبکہ ہندی نعت اس صنف کے تقدس سے میل نہیں کھاتی۔ عشقِ مجاز کے انداز میں عشق رسول کا اظہار حقیقت میں بے ادبی ہے۔ مقالہ نگار نے جس طرح حسرت کی علمیت اور تصوف سے ان کے لگاؤ کی اردو نعت کے ضمن میں تعریف کی ہے اس طرح ہندی شاعری کے اسلوب کی مذمت نہیں کی ہے۔ حضور ﷺ کے لئے بالما، معراجی سیاں، او مکے والے، عائشہ بی بی کے بالم پیارے، کالی کملی والے کھیا جیسے القاب اور پھر ان کو مخاطب کر کے "آجارے" "پھر نہ جارے" جیسے تقاضوں کی جسارت نے تقدیس کو یکسر پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے نقادین بشمول ڈاکٹر اشفاق خود فریبانہ ترقی پسندی کے زعم میں ایسی شاعری کو ہندوستانی اثرات کی قبولیت سے نعت گوئی کے اسلوب میں اضافہ قرار دے کر داد تحسین سے نوازتے ہیں اور نفس مضمون جس طرح آلودہ ہوتا ہے اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔ یہ تنقید نہیں ذہنی تحفظ ہے اسکی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔

جلیل مانکپوری اسی دور کے نمائندہ نعت گو ہیں جو امیر مینائی کے شاگرد ہیں۔ اپنی خاندانی روایات، شخصی مزاج اور استاد کی پیروی میں ان میں بھی مذہب سے لگاؤ اور نعت سے دلچسپی بڑھی تھی۔ "معراج سخن" مطبوعہ ۱۳۴۷ھ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے اس میں ۳۱ نعتیہ غزلیں، ایک ترجیع بند، ۸ رباعیاں (شب معراج سے متعلق) اور ۵ نعتیہ رباعیاں ہیں۔ شاعر حب رسول ﷺ کو زندگی کا حاصل اور مقصد گردانتا ہے چنانچہ رسول کریم سے محبت کے مضمون کو جگہ جگہ باندھا ہے اور اسے اصل ایمان قرار دیا ہے۔ (ص ۵۱۶) جہاں تک اوصاف شاعری کا تعلق ہے مقالہ نگار کا کہنا ہے کہ "زبان کی سلاست، روانی،

سادگی اور خلوص کی آمیزش سے شاعر ایک عجیب دلکش سماں باندھ دیتا ہے۔ بیان میں شگفتگی کیفیت مضامین کے بہاؤ میں کہیں رکاوٹ پیدا ہونے نہیں دیتی۔ (ص ۵۱۹)

حفیظ جالندھری نے جذبات سپاس نبیﷺ اور اسوہ حسنہ اور ان کے ذریعہ تعلیم و تبلیغ پر زیادہ زور دیا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام اور شاہنامہ اسلام زندہ جاوید اقدار کے حامل ہیں۔ بقول مقالہ نگار "حضرت حفیظ کے نعتیہ کلام کی لطیف تشبیہوں، استعاروں اور دیگر محاسن کے ساتھ ان کی جذبات نگاری اور واقعہ نگاری کے جو نمونے ہم ان کے شاہ نامہ اسلام میں پاتے ہیں وہ اس قدر ہیں کہ ان کے تفصیلی بیان کے لئے ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ (ص ۵۹۳)

اس دور کے دیگر اہم شاعروں میں اکبر وارثی میرٹھی، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری بھی شامل ہیں۔ مقالہ نگار نے ان کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ اور ان کی خصوصیات کے ساتھ بھی انصاف اور توازن سے کام لیا ہے۔ دلو رام کوثری اور مہند لال عرش ملسیانی جیسے غیر مسلم شاعروں کے نام اور رسول جہاں بیگم بیدل، تہنیت النساء جیسی نعت گو خواتین کے نام شامل کر کے ان طبقوں کی نمائندگی کا فرض پورا کیا ہے۔ تحقیق کے اعتبار سے یہ طبقے مزید چھان بین کے متقاضی تھے۔

اور آخر میں دور جدید کے باب کے بارے میں تبصرہ ڈاکٹر نجم الاسلام کے الفاظ میں :

"دور جدید کے نعت گویوں میں عزیز لکھنوی، اقبال، ظفر علی خان، امجد، جلیل، اکبر میرٹھی، ہادی، حفیظ، بہزاد، ماہر، عرش ملسیانی، حمید لکھنوی ہیں اور چند صف دوم بلکہ صف سوم کے شعراء بھی شامل ہیں جن سے اردو نعت گوئی کے عصری میلانات کے تعین میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ بہر کیف بعض اہم شعرا کے نعتیہ کلام پر تبصرے کے ضمن میں نعتیہ شاعری کے میلانات و رجحانات سے متعلق خاصے مفید نکات پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ دور جدید کے نعتیہ کلام میں حکیمانہ بصیرت، مصلحانہ تقدس، مجتہدانہ انداز اور شاعرانہ دلآویزیوں نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ایزاد و ایزاد کی گنجائشوں کے باوجود یہ ایک اہم تحقیقی مقالہ ہے جو مفید معلومات اور مباحث سے پر ہے اور اس موضوع پر تقدم بھی رکھتا ہے۔"

(صریر خامہ، حوالہ مذکورہ: ص ۱۳۷)

اردو نعت، تاریخ وارتقاء

از

سید افضال حسین نقوی فضل فتح پوری

اس کتاب کی وجہ تخلیق کے بارے میں مصنف نے اظہار کیا ہے کہ:

"حسن اتفاق انہی دنوں عزیزی فرمان فتح پوری کی نعت پر تصنیف "اردو کی نعتیہ شاعری" میری نگاہ سے گزری اور موصوف کی صنف سخن کے اظہار کے ذیل میں ایک نیک خواہش کہ "اے کاش کوئی فی الواقع اس طرف توجہ دے اور اس صنف سخن پر تحقیق و تدقیق کر کے کوئی صحیح سمت متعین کر سکے اور اس پر کبھی کام کر سکے۔" اس بات نے یک گونہ اور میری طبیعت کو اس طرف مائل کیا کہ مملکت اسلامیہ پاکستان میں اس کی قومی زبان اردو میں صنف نعت کے خدوخال کے تعین، اس کے سنوار اور سدھار، اس کی تخلیق اور اس کی صحیح ارتقا پر کچھ "ٹھوس بنیادوں" پر "ثقہ" اور کار آمد کام کیا جا سکے۔" (ص ۲۱-۲۲)

چونکہ محقق و مصنف فضل فتح پوری نے "کلیتہً" اپنے آپ کو وقت پسند رکھا اور ان کی جاں کاہ کاوش کا نتیجہ دو سو صفحہ کی یہ کتاب ہے۔ نام کے اعتبار سے اردو نعت کی تاریخ اور ارتقاء سے بحث کر رہی ہے۔ کتاب لکھنے کی ترغیب مصنف کو ڈاکٹر فرمان کی کتاب سے ہوئی۔ اس طرح ڈاکٹر فرمان کے نقش اول کی اضافی شکل نقش ثانی ہی ہونا چاہئے تھی لیکن ابتدائی صفحات میں چند مباحث کے علاوہ اس میں ایسا کوئی اضافہ نظر نہیں آیا کہ اسے ڈاکٹر فرمان کی کتاب کی اضافی شکل کہا جا سکے پھر بھی ڈاکٹر فرمان نے کہا ہے کہ "اردو میں نعت گوئی کی ایک جامع تاریخ مرتب ہو گئی ہے۔" (ص ۱۸)

فضل فتح پوری نے ڈاکٹر فرمان کو اپنی کتاب کا محرک قرار دیا تو ڈاکٹر فرمان نے اس کتاب کو "جامع تاریخ" بتلا کر جواب آں غزل کا قرض ادا کر دیا ہے چلئے حساب برابر ہوا اگر یہی معیار تحسین باہمی جاری رہا تو اردو زبان کی ترقی کا خدا ہی حافظ ___ اور اگر اردو میں نعت گوئی کی تاریخ اتنی ہی ہے کہ تین ابتدائیہ مضامین کے ساتھ اس کا صرف دو سو صفحہ میں احاطہ کر کے جامعیت کا ثبوت دیا جا سکتا ہے تو ایسی صنف شاعری پر تحقیق اور تنقید دونوں بیکار ہیں۔ وہ جو ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید نے سیکڑوں صفحات اس موضوع کے حوالے سے لکھے ہیں وہ سب خواہ مخواہ کی تحریریں ہیں۔ اردو نعت کی تاریخ، مبصرانہ جائزے اور اس کے حسن و قبح کو سمجھنے کے لئے بس ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور فضل فتح پوری کی

کتابیں کافی ہیں۔

کتاب کے "ادارتی تعارف" (از سید محمد رضا) پیش لفظ (از ڈاکٹر فرمان فتح پوری) اور حرف آغاز (از احقر العباد سید افضال الدین نقوی، فضل فتح پوری) میں بیان کردہ "حقائق" پر بحث کرنا طویل کلام کا موجب ہو گا۔ ان کے بارے میں اظہار خیال سے معذرت کے ساتھ کتاب کے اصل موضوعات اور مباحث کا اجمالاً جائزہ ضروری ہے۔ کتاب کیا ہے؟ مضمون کم اور الفاظ کی بہتات ہے! بیان میں ربط وضبط کی کمی ہے۔ غیر متعلق اور غیر ضروری مباحث کی بہتات ہے۔ مضمون نگار نے ذاتی پسند کو شاعری کے اصول قرار دیا ہے اور مسلمہ ومروجہ اصولوں کی دلائل کے ساتھ نفی کرنے کی کہیں بھی کوشش نہیں کی ہے۔ اردو فارسی کے شاعروں نے نعت کے مضامین کو وسعت دی یہاں تک کہ مبصرین کو کہنا پڑا کہ "ہر مصرع یا ہر فقرہ جس میں رسول پاک ﷺ کا ذکر ہو نعت ہے۔" لیکن فضل فتح پوری وسعتوں کو سمیٹ کر نعت میں ایک بات کے خواہش مند ہیں جذب وانجذاب، عشق رسول ﷺ، جس کا اظہار دل کی گہرائیوں سے ہو، ان کا کہنا ہے:

> "آنحضرت کی زندگی کے واقعات، ان کی سیرت کی تاریخی منظومات صرف اس لئے نعت کہے جا سکتے ہیں کہ ان میں آنحضرت کی سیرت طیبہ کا تذکرہ ہے لیکن جذب وانجذاب کی کمی طالب ومطلوب کے رشتے کی غیر موجودگی، حسن عقیدت کی چھاپ کی نایابی انہیں صحیح معنوں میں نعت کہے جانے کی سزاوار نہیں ٹھہراتی۔" (ص ۳۲)

حضور ﷺ سے اظہار عقیدت ومحبت جو جذبہ دروں کے ساتھ ہو وہی مصنف کی نظر میں نعت ہے دیگر نوعیت کا کلام "خالص نعت" نہیں ہے (ص ۳۲) "وہ منقبت ومدحت خیر البشر تو ہیں نعت نہیں ہیں۔" (ص ۳۲) فارسی اور اردو کے سیکڑوں نہیں ہزاروں شعراء نے جس کلام کو نعت جان کر تخلیق کیا اور باکمال، صاحب علم وہنر مورخین ونقادانِ فن نے جسے نعت قبول کیا ایسے ایک شخص کے خود ساختہ اصول کے تحت صنف شاعری سے خارج کر دیا جائے سوائے خود پسندی، ذہنی تحفظ، تنگیٔ دل کے اور کس وصف کی پابند ہو سکتی ہے، ان خود ساختہ اصولوں پر اصرار اور خود پسندی کے اظہار نے مسلمانوں کو عالمی طور پر ذلیل وخوار کر دیا ہے اسی نے ان کو وحدت بین الاقوام بنانے کے بجائے چھوٹے چھوٹے کوزوں میں مقید کر دیا ہے اور تباہی، شکست وریخت، تذلیل کا ہر طرح سے نمونے بننے کے بعد بھی وہ اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں تو ایک شخص قلم ہاتھ میں لے کر ذہنی تحفظ یا ذہنی تعصب کی بناء پر کچھ بھی لکھ جائے تو تعجب کی نہیں افسوس کی بات ہے۔ ایک محتاط مبصر یہ تو کہہ سکتا ہے "مجھے غزل کے مزاج کی نعت پسند ہے" لیکن اسے یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ "غزل کے مزاج سے ہٹ کر جو نعت کہی جائے وہ نعت نہیں۔" آخر اس قسم کے فیصلے کرنے اور

رائے دینے کا اختیار اس کو دیا کس نے ہے؟

فضل فتح پوری نے اپنے ذہن کو "جذب وانجذاب" کے خود تعمیر کردہ حصار میں مقید کرلیا ہے کہ وہ مدحت خیر البشر کے قصیدوں کی تعریف تو کرتے ہیں لیکن مدحت گستری کو نعت تسلیم نہیں کرتے۔ (ص ۳۸) اسی لئے وہ شہیدیؔ، شہید اور مومنؔ کو نعتیہ شاعر نہیں مانتے محسنؔ کاکوروی کے قصیدے کی بے جا تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں لیکن انہیں نعتیہ کلام ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

ان کے خیال میں امیر مینائی نے صحیح معنوں میں جذب وانجذاب اور شاعری سے مُد نعت گوئی کی ہے غالباً انہوں نے شہیدیؔ کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا اور اگر کیا ہے تو اس تعصب کے ساتھ کہ اس کی فوقیت کو قبول نہیں کریں گے ورنہ انجذاب اور جذبہ دروں کی جو کیفیت شہیدیؔ نے پیش کی ہے وہ بعد کے شاعروں میں شائد ہی کسی کے حصے میں آئی ہے اور مجھے یقین ہے کہ امیر مینائی کے بارے میں حسرت موہانی نے جو رائے دی ہے وہ مصنف کی نظر سے گزری ہی نہیں ہے۔

ہماری نظر میں یہ کتاب اردو نعت کی تاریخ ہے اور نہ ارتقاء کا حال ادوار کی خصوصیات کے اعتبار سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئی ہے اسے زیادہ سے زیادہ تذکرہ نعت گو شعراء کہا جاسکتا ہے جس میں چند سطریں شاعر کے احوال اور اس کی خصوصیات کلام کے لئے وقف ہیں اور زیادہ صفحات میں نمونہ کلام دیا گیا ہے اگر صفحہ بہ صفحہ جائزہ لیا جائے تو ۲۰۰ صفحات کی اس کتاب کا ۱/۳ حصہ احوال و تبصرے اور ۲/۳ حصہ نمونہ کلام پر مشتمل ہے ایسی "جامع تاریخ" ہم نے کہیں اور نہیں دیکھی۔

مصنف رنگ تغزل کے بغیر نعت کو نعت تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن محسنؔ کاکوروی کے قصیدے مدیح خیر المرسلین کی تعریف (ص ۴۳ تا ۴۶) اکبر وارثی کی نظم (ص ۶۵) حالیؔ کی نعتیہ نظموں (ص ۶۵، ۶۶) وغیرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

مصنف کو نمونہ کلام پیش کرنے کا اس قدر شوق ہے کہ جن اشعار کو درج کیا ہے وہ خود ان کے متعینہ معیار پر بھی پورے نہیں اترتے۔

دیگر اصناف سخن کے بارے میں ان کا فیصلہ کن لہجہ بھی ناقابل قبول ہے لکھتے ہیں:

"قصیدہ کی مدحت وثناء و تعریف و توصیف نبی اکرم ﷺ کا اور انداز ہے اس کے لفظوں کی گھن گرج اور زور و آہنگ میں درباری مدحت کا سا انداز ہوتا ہے۔" ص (۲۳) گویا عربی میں قصیدہ نگاری سے جس نعت گوئی کی ابتداء ہوئی اور اس کی تتبع میں فارسی اور اردو میں جو قصائد کہے گئے انہیں ادبیات سے خارج کر دیا جائے کیونکہ ایک فاضل اسے نعت تسلیم کرنے سے انکاری ہے۔

"مثنوی میں آنحضرت ﷺ کی مدحت ایک افسانوی اور داستانی طرز مدحت کی حامل ہو سکتی

ہے۔"(ص ۲۳)

یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے۔

"مرثیہ میں رسول اکرم ﷺ کی مدحت مسدس کے توسط سے بیانیہ انداز لئے ہو سکتی ہے جس میں رزم وبزم کے حوالہ سے تعریف تو ہو سکتی ہے لیکن وہ خاص بات جو نعت کے لئے مخصوص ہونی چاہئے اس صنف شاعری کے لوازمات میں ادا نہیں ہو سکتی۔ یہ لفظوں کی طمطراق (؟) اور حزن وملال کی گھنگھور گھٹاؤں میں گھر کر کچھ اور انداز اختیار کر لیتی ہے۔ یہی عالم رباعی اور قطعہ کا ہے۔"(ص ۲۴)

مصنف صرف غزل کو نعت کے لئے موزوں تسلیم کرتے ہیں انہوں نے جو جذب وانجذاب اور جذبہ دروں کی تخصیص کی ہے ضروری نہیں کہ وہ غزل ہی میں آئیں یہ تو شاعر کا ہنر ہے کہ وہ کس مضمون کو کس پیرائے میں بیان کرے۔ رباعی میں بھی جذب وانجذاب ہوتا ہے وہاں بات پھیلا کر نہیں غزل کی طرح اختصار اور ایجاز کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ مثنوی میں کسی نہ کسی حصہ میں یہی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب میں دلیل کا عجیب وغریب انداز یہ بھی ملتا ہے کہ ایک شاعر (امیر مینائی) کی تعریف میں لفظوں کے دریا بہا دیئے ہیں اور ان کی تائید میں ان سے ماقبل کے شاعر (میر انیس) کو پیش کیا گیا ہے۔

امیر مینائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "امیر احمد مینائی ۱۲۴۴ھ تا ۱۳۱۸ھ نے پہلے نعتیہ قصائد کہے لیکن پھر طبع موزوں کو نعت کے اس صحیح رخ کی طرف موڑ دیا جو کہ آگے چل کر اردو نعت گوئی کا صحیح رخ اور صحیح چہرہ بننے والا تھا اور وہ یہ کہ نعت خیر المرسلین کی زمین تو غزل کی ہو لیکن اس میں جذب وانجذاب کی میٹھی میٹھی آنچ ہو۔"(ص ۳۰)

اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس تصور کو مزید تقویت میر انیس (المتوفی ۱۲۹۱ھ م ۱۸۷۴ء) کی وہ تخلیقی صلاحیت دے چکی تھی جس میں موصوف نے غزل کو نتھار کر اور سنوار کر حب رسول الثقلین ﷺ کی مدحت میں سلام کا درجہ دے دیا تھا۔"(ص ۳۰)

یعنی امیر مینائی کے وصف خاص کی ایجاد سے قبل میر انیس اس کو "مزید تقویت" دے چکے تھے۔ کتاب میں تبصرے "واہ واہ" "سبحان اللہ" سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ اشعار کی خوبیوں یا خامیوں کی نشاندہی کرنا مصنف کے اختیار سے باہر معلوم ہوتا ہے اور جہاں کہیں جسارت کی ہے وہاں تبصرہ خلاف حقیقت ہی نظر آتا ہے مثلاً مولانا شاہ احمد رضا خاں کے بارے میں لکھا ہے:

> "انداز بیان سادہ مگر شگفتہ اور برجستہ ہے۔ اس میں شیفتگی اور وارفتگی کی چاشنی ہے سادہ اور سہل الممتنع ہونے کی وجہ سے مقبول خاص وعام ہوا۔"(ص ۶۰)

بلاشبہ چند قصائد پر اس توصیف کا اطلاق ہو سکتا ہے لیکن مصنف کے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ مولانا اپنے وقت کے جید عالم تھے۔ درجنوں علوم پر حاوی تھے اور جہاں کہیں انہوں نے اپنے علم اور عربی زبان سے کام لیا ہے وہاں ان کی تشبیہات، استعارے اور اصطلاحات بعید از فہم ہو گئے ہیں۔ گذشتہ صفحات میں بھی ہم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ علم کی بلندی سے جو حضرات شعر کہتے ہیں کیا وہ عوام کے لئے ہوتے ہیں ہمارے خیال میں وہ شاعری یا تو اپنے لئے کرتے ہیں یا ایک مخصوص طبقہ کے لئے!

مصنف کی نظر میں امیر مینائی نعت کے واحد شاعر ہیں جن کی پیروی کو وہ لازم قرار دیتے ہیں چنانچہ جس کی تعریف فرمانا چاہی اس کے لئے حکم لگا دیا کہ وہ امیر مینائی کا پیرو ہے مثلاً مولانا شاہ احمد رضا خاں کی توصیف کرتے ہوئے اضافہ کرتے ہیں کہ ان کا "وہی ڈگر ہے جس کے بانی امیر مینائی تھے۔" (ص ۶۰)

☆ حمید صدیقی لکھنوی

"تاہم آپ کی نعتیں غزل ہی کی زمین و آہنگ کی مرہون منت ہیں جن کی داغ بیل امیر مینائی ڈال چکے تھے۔" (ص ۸۴)

☆ مظفر وارثی

"مظفر وارثی نعت کے اس ٹکسالی اسلوب کے سختی سے پابند ہیں جس کی بنا حضرت امیر مینائی نے ڈالی تھی۔ (ص ۱۲۶)

☆ اعظم چشتی

"اسلوب نعت، نعت گوئی کی مخصوص اور صحیح سمت سے عبارت ہے جس کے بانی حضرت امیر مینائی تھے۔" (ص ۱۳۱)

☆ حنیف اسعدی

"آپ کا بھی نعت گوئی کا اسلوب امیر مینائی کی طرز نعت گوئی کا خوشہ چیں ہے۔" (ص ۱۳۳)

☆ مظہر عرفانی

"اتنا پھر اعادہ کر دوں کہ اسلوب نعت گوئی اسی مرشد کامل حضرت امیر مینائی سے مستعار ہے۔" (ص ۱۳۶)

☆ کشن پرشاد شاد

"آپ کا جذب و شوق شعروں کی انجذابی کیفیت کسی حد تک امیر مینائی سے مستعار معلوم ہوتی ہے۔" (ص ۱۳۶)

☆ دور حاضر

"اردو نعت گوئی کی ذیل میں عصر حاضر کے مزاج کا خود ہی اندازہ فرمالیں کہ وہ

کاروانِ نعت جو امیر مینائی کے ہاتھوں آگے بڑھا تھا اپنے جذب و قبول کے ساتھ دورِ حاضر میں کس مقام پر ہے۔" (ص ۱۵۳)

جن شاعروں کے کلام میں امیر مینائی نظر نہ آئے ان کے کلام پر تبصرہ کو ضروری خیال نہیں کیا گیا صرف ان کی نعتیں درج کر دی ہیں گویا یہ بھی "جامع تاریخ" لکھنے کا ایک انداز ہے۔ بلا تبصرہ جن کا کلام درج ہے ان میں احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، انجم رومانی، قتیل شفائی، محشر بدایونی، منور بدایونی، صبا اکبر آبادی، حافظ لدھیانوی، اعجاز رحمانی، کلیم عثمانی، شفیق کوٹی، عارف انیس اکبر آبادی، فضل فتح پوری، کوثر الٰہ آبادی، نثار اکبر آبادی، نادم ایرانی، محبوب نرالے عالم، کمال حسین کمال، رفیق عزیزی، علیاذ ہن شاہ تاجی، وقار صدیقی اجمیری، عادل اعظمی، مقبول حسین عابدی، خالد نقشبندی، سعید الکبیر شامل ہیں۔ ان میں معروف شعراء بھی ہیں اور غیر معروف بھی۔ مصنف نے اس امر کا بھی اظہار نہیں کیا کہ ان میں نعت گوئی کی کونسی خصوصیات شاعری شامل ہیں اور کس کس نے رسمی طور پر دو ایک نعتیں کہی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جتنی نعتیں جمع کرنے سے ان کے ذوق کی تسکین ہوئی ان سب کو جگہ دے دی۔ وہ اردو کی مروجہ اصناف میں ذکرِ رسول ﷺ کو نعت تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں لیکن نعت کی ذیل میں "نظم معریٰ" کو جگہ دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

اس تذکرہ میں قدما کا حال موجود نہیں، متوسطین اور متاخرین کے ادوار میں بھی مصنف کے پسندیدہ شاعروں نے جگہ پائی ہے البتہ ۱۹۴۷ء کے بعد کی نعتیہ فضا کی ترجمانی کے لئے آخری حصہ میں وسیع پیمانے پر نعتیں درج کر دی ہیں جو آئندہ وقیع کام کرنے والوں کے لئے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہماری نظر میں کتاب "انتخاب نعت" ہے جس میں بعض شاعروں کے بارے میں تعارفی نوٹ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جبکہ زیادہ شاعروں کا تعارف بھی نہیں ہے صرف کلام ہے۔

"اردو میں نعت گوئی" از ڈاکٹر ریاض مجید

"اردو میں نعت گوئی" ڈاکٹر ریاض مجید کا پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھا گیا تحقیقی مقالہ ہے اس مقالہ کی تیاری ۱۹۷۶ء سے شروع ہوئی اور تکمیل جون ۱۹۸۳ء میں ہوئی جبکہ یہ کتابی صورت میں ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ اس مقالہ کے آغاز سے قبل ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی کتابیں بالترتیب جنوری ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۴ء میں شائع ہو چکی تھیں۔ مقالہ کی تکمیل کے دوران ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کا مقالہ جو ۱۹۵۵ء میں مکمل ہو چکا تھا اور ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر ریاض مجید کے علم میں یہ تینوں کتابیں تھیں اور انہوں نے ان کتابوں سے استفادہ کیا بالخصوص ڈاکٹر اشفاق کی کتاب مواد کی فراہمی میں ان کی بڑی حد تک ممد رہی۔ ڈاکٹر ریاض مجید کو مقالہ کے خدوخال سنوارنے اور مباحث میں جان ڈالنے کے

لئے سابقہ مطبوعات سے رہنمائی حاصل رہی۔اس سے کسی حد تک ان پر فکری بوجھ کم پڑا۔

یہ جاننے کے لئے کہ ریاض مجید نے صرف ڈگری کے حصول کے شوق میں موضوع کا انتخاب کیا ہے یا واقعی موضوع ان کی فکر اور طرز زندگی سے میل کھاتا ہے ضروری ہے کہ ان کی شخصیت کا مطالعہ پہلے کیا جائے اس بارے میں ڈاکٹر محمد اختر چیمہ سے رہنمائی حاصل ہوئی انہوں نے اپنے ایک مختصر تعارفی مضمون میں ریاض مجید کے بارے میں لکھا ہے کہ :

"مشہور شاعر، ادیب اور اردو نعت کے دوسرے محقق ڈاکٹر ریاض مجید محض ایک فرد کا نام نہیں بلکہ وہ بلاشبہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو گڑھا ویزاہ گاؤں (موجودہ جالندھر چھاؤنی) میں میاں عبدالمجید کے گھر پیدا ہوئے۔ تقسیم برصغیر کے بعد اپنے بزرگوں کے ہمراہ فیصل آباد چلے آئے۔ بی اے تک تعلیم فیصل آباد میں حاصل کی۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے حاصل کیں۔"

"____ پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید نے اس موضوع پر ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اپنی بیشتر علمی صلاحیتیں نعت گوئی، نعت نگاری، نعت نویسی، نعت پر تحقیق، نعت کے ابلاغ، نعتیہ کلام کی اشاعت، نعتیہ مجالس، محافل سماع، نعتیہ مشاعروں اور نعتیہ کانفرنسوں کے انعقاد کے لئے وقف کر دی ہیں۔ وہ آئے دن اندرون ملک اور بیرون ملک سفر پر روانہ رہتے ہیں اور وہ اس معاملہ میں سفر و حضر کی صعوبتوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے بلکہ ایسی مجلسوں میں شرکت کو اپنے لئے باعث اعزاز سمجھتے ہیں۔"

"____ ڈاکٹر صاحب کا اس مقدس موضوع سے قلبی لگاؤ ان کی حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اطہر سے والہانہ عقیدت وارادت اور دلبستگی و شیفتگی کا مظہر ہے۔ آنحضرت ﷺ کے اوصاف جمیلہ اور اخلاق حمیدہ کا ذکر خیر آپ کا سرمایہ حیات ہے۔" (پروفیسر ڈاکٹر محمد اختر چیمہ : مضمون "اردو میں نعت گوئی اور ڈاکٹر ریاض مجید : مشمولہ رسالہ اوج، نعت نمبر جلد ۲ : ۱۹۹۳ء ص ۳۲۶ ـ ۳۲۷)

غرض معلوم ہوا کہ ڈگری کا حصول ان کی ضرورت نہیں بلکہ طبعی ذوق اور شوق ہے جس نے ڈاکٹر ریاض مجید کو اس تحقیقی کام پر لگایا اور اسی نے تکمیل کی صورت پیدا کی۔ مقالہ ۵۴۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ سات ضمیمے بعنوان (۱) احادیث نبوی میں لفظ نعت کا استعمال (۲) اسمائے رسول مقبول (۳) شرح حمد ہ (۴) میلاد نامے (۵) غیر مسلم شعراء کا نعتیہ کلام (۶) خواتین کی نعت گوئی (۷) نعتیہ ریکارڈ اور فلمی

طرزوں پر لکھی گئی نعتوں کا جائزہ، اصل مقالہ کے علاوہ ہیں۔ (ص ۵۲۱ تا ۵۸۶) کتابیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے مقالہ کی تیاری میں وسیع مطالعہ کیا ہے ان کے پیش نظر قرآن و حدیث، کتب سیر، لغات، حوالہ جاتی کتب، دواوین، مثنویاں، نعتیہ کلام کے مجموعے، جرائد کے خاص نمبر، رسائل کی عمومی اشاعتیں اور کتب خانوں کی فہارس رہی ہیں جن کی مجموعی تعداد سیکڑوں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ مقالہ کے مطالعہ سے تصدیق ہوتی ہے کہ کتابیات قاری کو مرعوب کرنے کے لئے نہیں تیار کی گئی ہے بلکہ ان سب سے خاطر خواہ استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے مسرت اور طمانیت ہوتی ہے کہ اس دور میں جبکہ پی ایچ۔ ڈی کے معیاری ہونے پر سے اعتبار اٹھتا جارہا ہے چند مقالے ایسے پڑھنے کو ملے کہ جنہوں نے مجھے اپنی بے علمی و بے بضاعتی کا احساس دلایا۔ اگر ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کا نقش اول متاثر کیا ہے تو ڈاکٹر ریاض مجید نے ثابت کر دیا ہے کہ نقش ثانی ہمیشہ اول سے ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے موصوف ہر داد کے مستحق ہیں۔

مقالہ صرف چھ ابواب پر مشتمل ہے اس کے باوجود مقالہ نگار نے نعت کے فن، اسلوب کے تجربے، نعت گوئی کے ادوار، ہر دور اور اس دور کے شاعروں کی خصوصیات، غرض ہر موضوع اور ہر موضوع کے ہر پہلو کا جائزہ لیا ہے اور کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا۔

ایک خاص بات جو ڈاکٹر اشفاق کی کتاب میں بھی نظر آئی اور اس میں بھی موجود ہے یہ ہے کہ فہرستوں میں ابواب، ہر باب کا عنوان اور عنوان کے تحت آنے والے موضوعات کی تفصیل تو ہے مگر دونوں کتابوں میں ابواب کے صفحہ نمبر غائب ہیں جس کی وجہ سے موضوع یا ذیلی موضوع کو تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس میں مقالہ نگار کی کوئی کوتاہی نہیں یہ اشاعتی اداروں کا غیر سنجیدہ رویہ ہے جو نہ تو مصنف کی محنت کا پاس کرتے ہیں اور نہ قاری کی ضرورتوں کا احساس رکھتے ہیں۔

لوگ تو کسی موضوع پر بھی چند صفحات لکھ کر "جامع" ہونے "وقیع" ہونے اور "حرف آخر" ہونے کے دعوے کرتے ہیں اسے ڈاکٹر ریاض مجید کی انکساری نہیں بلکہ حقیقت شناسی اور اعلیٰ ظرفی سمجھنا چاہئے کہ محنت شاقہ سے ایک بسیط مقالہ لکھ کر بھی وہ اصرار کرتے ہیں کہ :

> "ایک آخری اور ضروری بات کہ اردو نعت کے موضوع پر یہ مقالہ کسی بھی طور نعت کے فکر و فن اور اردو نعت گو شعراء کی مساعی جمیلہ کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتا ابھی اس کے بہت سے پہلو تشنہ ہیں۔ اس باب میں میری کوشش بھی ایک حرف اول کی سی ہے۔" (ص س)

مقالہ میں ۱۹۸۰ء تک کے اردو نعتیہ ادب کا جائزہ شامل ہے گذشتہ دس سال میں نعت گوئی کے رجحان میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے اس صدی کے اختتام پر ضرورت ہے کہ کوئی ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر

ریاض مجید کے مقالوں کے تکمیلی ابواب لکھ کر اس تحقیقی کام کو آگے بڑھائے۔

باب اول میں تمہیدی نوعیت کے مباحث ہیں۔ سب سے پہلے لفظ "نعت" کے مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے چونکہ لفظ عربی کا ہے اس لئے عربی زبان کے ماہرین، شعراء اور دانشوروں کے حوالے فراوانی سے استعمال ہوئے ہیں۔ عربی قواعد اور رواج شاعرانہ دونوں اعتبار سے نعت کا مفہوم متعین کیا گیا ہے اور نعت اور وصف کے فرق کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق ابتداء میں نعت کا لفظ اصطلاحی مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ ابن اثیر، ابن منظور الزبیدی، شیخ محمد طاہر نے نعت کو اصطلاحی مفہوم میں یعنی رسول کریم ﷺ کے وصف کے بیان میں استعمال کیا ہے لیکن زمانہ کے ساتھ

"عربی لغات سے لفظ نعت کا مفہوم (وصف رسول) غائب ہوتا چلا گیا اور اپنی تمام تر اعلیٰ، مثبت، اور موزوں خصوصیات کا حامل یہ لفظ جو اپنی دلالت وصفی اور دیگر معنوی خوبیوں کے سبب وصف رسول کے بیان کے لئے اپنے دوسرے مترادفات مدح، مدیح وغیرہ سے بلیغ اور وقیع تھا مطلق وصف ہی کے معنوں میں کیوں ترویج پاتا رہا اور عربی میں اسے وہ تخصیص اور اصطلاحی درجہ کیوں عطا نہ ہوا جو اسے بہت بعد میں فارسی اور اردو میں ہوا۔" (ص ۵)۔

اردو میں نعت کا لفظ مطلق وصف کے لئے شاذ ہی استعمال ہوا ہے۔ مقالہ نگار نے اس کی مثال "قصہ زیتون و محمد حنیف" سے دی ہے جو علی خان کی تصنیف کردہ مثنوی ہے اس کی ابتداء میں حمد و نعت کے بعد عنوان ہے "نعت اصحاب کبار" اس میں نعت مطلق وصف کے معنی میں ہے (ص ۸) اس ایک مثال کے علاوہ ہر جگہ نعت مخصوص اصطلاح کے طور پر نظر آتی ہے جو شاعری کے لئے مخصوص نہیں نثر میں بھی حضور اکرم ﷺ کے اوصاف کے بیان کو بھی نعت ہی کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق نے بتلایا تھا کہ نعت کا لفظ سب سے پہلے حضرت علیؓ نے استعمال کیا تھا۔ ڈاکٹر ریاض مجید اپنے تحقیقی مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ

"ان روایات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ نعت کا لفظ حضرت علیؓ کی زیر بحث روایت سے پہلے بھی حضور اکرم ﷺ، صحابہ کرام اور نہ صرف یہ کہ اس زمانہ کے یہودی عالموں کی زبان سے بلکہ آپ سے پہلے یہود کی دعاؤں میں بھی آپ کی مدح و توصیف اور اوصاف و خصائص کے حوالہ سے استعمال ہوتا رہا ہے۔" (ص ۱۲)

نعت کے موضوعات انتہائی وسیع ہیں زمانے کے بدلنے، فکر کے بڑھنے، حالات میں تبدیلی واقع ہونے اور شعری تجربوں میں اضافوں کی وجہ سے نعت کے موضوع میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ اس کی وسعت پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے۔ جو کئی صفحات پر محیط ہے جبکہ

"خلاصہ کلام یہ ہے کہ نعت متنوع موضوعات اور رنگا رنگ مضامین کی حامل

صنف ہے۔ اس میں اگرچہ حضور اکرم ﷺ کی مدح اور تذکار کو ایک مرکزی دھارے کی حیثیت حاصل ہے مگر نعت گو شاعروں کو درپیش مسائل ان کے عہد اور زمانہ اور مزاج و ماحول کے مطابق اس مرکزی دھارے میں دوسرے موضوعات کی لہریں بھی ملتی ہیں۔ نعت کا موضوع مسلسل ارتقا پذیر ہے اور ہر دور کے تقاضوں، تمدن و معاشرت اور علوم کے مطابق اس موضوع کے نت نئے امکانات ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ (ص ۱۸)

مقالہ نگار نے اپنے بیان کو اصطلاحات اور سابقہ روایات تک محدود نہیں رکھا ہے ایک بیدار مغز کے وسیع مطالعہ سے حاصل ہونے والے نتائج بیان کر کے انہوں نے قاری کے ذہن کے لئے نئے دریچے کھولے ہیں۔ ان کے بیانات "لکیر کے فقیر" کے اطلاق سے مبرا ہیں۔

نعت کے بارے میں یہ فقرہ عام ہے کہ نعت کہنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی! مقالہ نگار نے متعدد اہل علم کے اس سے ملتے جلتے اظہار خیال کو نقل بھی کیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ نعت گوئی بے حد مشکل ہے پہلے تو اس کے لوازمات پر عبور ہونا چاہئے پھر اس مرتبہ کو سمجھنا جو حضور ﷺ کا ہے اور اس میں فرق نہ آنے دینا۔ حفظ مراتب کے لئے مضمون، الفاظ اور اسلوب میں احتیاط برتنا بڑے مشکل مرحلے ہیں جن سے نعت گو کو گزرنا پڑتا ہے۔ مقالہ نگار نے نعت کے لوازم میں عشق رسول ﷺ (ص ۲۰، ۲۱)، حفظ مراتب (ص ۲۱، ۲۲)، ادب و احترام (ص ۲۳ تا ۲۵)، مضامین (۲۵ تا ۲۶)، طرز اظہار (ص ۲۷)، انتخاب الفاظ (ص ۲۵، ۲۹)، تشبیہ و استعارے (ص ۲۹)، انداز خطاب (ص ۳۰، ۳۱)، اور حقیقت نگاری (ص ۳۱، ۳۴) گنائے ہیں۔

مقالہ نگار نے تمام اصناف شاعری کو جن میں ذکر اوصاف حضور اکرم ﷺ ہے نعت میں شمار کیا ہے۔ وہ ہیئت کے بجائے موضوع کو مد نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح قصیدہ، مثنوی، غزل، نظم، آزاد نظم، معریٰ نظم، نثری نظم، سانیٹ، طویل نظم سب کو بلالحاظ ہیئت نعت تسلیم کرتے ہیں انہوں نے طویل نظموں کی مثال میں محشر رسول نگری کی "فخر کونین" مہدی نظمی کی "رحل نظر" اور احسان دانش کی "دارین" کا ذکر کیا ہے ان میں "فخر کونین" سب سے زیادہ طویل ہے یہ نظم تین ضخیم حصوں پر مشتمل ہے۔ (ص ۴۰)

وہ نعت کی قسموں میں رسمی اور حقیقی کو شامل کرتے ہیں۔ اسی باب میں نعت کے انداز اور اسالیب سے بھی بحث کی ہے اور توصیفی انداز نعت (ص ۴۵)، عشقیہ انداز نعت (ص ۴۵، ۴۶)، غزلیہ انداز نعت (ص ۴۶، ۴۷)، مقصدی انداز نعت (ص ۴۷)، تاریخی انداز نعت (ص ۴۹، ۵۰)، نعت میں استمداد و استغاثہ کا انداز (ص ۵۰ تا ۵۳)، نعت میں صلوٰۃ و سلام کا انداز (ص ۵۳، ۵۴) مقصدی نعت کی ان کی نظر میں ذیلی قسمیں بھی ہیں۔ ذاتی مقاصد، معاشرتی مقاصد، ملی مقاصد، آفاقی مقاصد۔

ڈاکٹر اشفاق نے اپنے مقالہ میں نعت پر ہندی زبان اور ہندو صنمیات کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق کے تجزیات سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ اس موضوع پر دونوں کے درمیان اتفاق رائے ہے۔ ڈاکٹر اشفاق نے جن اثرات کی نشاندہی کی تھی ان میں تین نکات شامل ہیں (۱) بھگوان اور اوتار کے درمیان فرق ملحوظ نہیں رکھا جاتا اس کے زیر اثر نعت میں خدا اور رسول کے درمیان فرق کا لحاظ نہیں رکھا گیا اور احد اور احمد کو یکساں قرار دیا جاتا رہا۔ یہ مضمون اصولوں کے بالکل بر خلاف اور شرک کے مترادف ہے۔ (۲) ہندو صنمیات کے واقعات میں فوق العادات عناصر کی بھر مار ہے نا قابل یقین واقعات بیان کئے گئے ہیں اس کے زیر اثر نعت میں مصدقہ اور غیر مصدقہ معجزات اور اسی نوعیت کے مضامین کا اضافہ کیا ہے۔ (۳) ہندی شاعری کے زیر اثر عورت کی جانب سے اظہار عشق ہوتا ہے۔ مسلمان شعراء نے نعت کے لئے ہندی اصناف سخن کا سہارا لیا تو گیت، ٹھمری، وادرا اور موسیقی کے تمام راگوں کو استعمال کیا ہندی الفاظ کی بھر مار کر دی۔ عورت کی جانب سے حضور ﷺ کے لئے جذبات عشق کا اظہار نہایت عامیانہ انداز میں کیا۔ حضور ﷺ کو مخاطب کرنے کے لئے نازیبا القاب استعمال کئے۔ ڈاکٹر اشفاق نے اظہار حقیقت تک اپنے بیان کو محدود رکھا تھا جبکہ ڈاکٹر ریاض مجید نے کھل کر ان نکات کی مذمت کی اور حوالہ کے طور پر کئی شعراء کے نعتیہ کلام میں سے اشعار پیش کئے ہیں جن کا اردو نعت میں بڑا مرتبہ ہے اس موضوع پر ڈاکٹر اشفاق کے مقالہ پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اپنے خیالات پیش کر چکے ہیں۔

مقالہ کے دوسرے باب میں نعت کے محرکات اور ماخذات سے بحث کی گئی ہے۔ مقالہ نگار نے بنیادی محرکات میں عقیدت (ص ۷۱، ۷۲)، حب رسول (ص ۷۲، ۷۴)، اطاعت رسول کا جذبہ (ص ۷۴ تا ۷۶)، حصول ثواب و طلب شفاعت (ص ۷۶ تا ۷۸)، برکت طلبی اور خیر جوئی (ص ۷۹) شامل کئے ہیں۔ ان تمام محرکات کے بارے میں مقالہ نگار نے اپنے وسیع مطالعہ سے کام لیتے ہوئے قرآن و حدیث اور اقوال صحابہ سے کام لیا ہے اور حد اعتدال میں رہتے ہوئے ان محرکات کے زیر اثر تخلیقی نعت کی ستائش کی ہے۔

نعت کی مقبولیت کے اسباب کی تلاش بھی مقالہ نگار کا مطمح نظر رہا ہے۔ انہوں نے صوفیائے کرام کی خصوصی توجہ اور شغف کو نعت کی مقبولیت کا اہم سبب قرار دیا ہے (ص ۸۰ تا ۸۴) اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے عرب، ایران اور ہند کے ان بزرگوں کے مستند حوالے دیئے ہیں جو صوفی بھی تھے اور شاعر بھی۔ ان میں بعض کے یہاں نعت کے نمونے کم ملتے ہیں بعض کے یہاں بکثرت۔ چند نے تو خصوصیت سے نعتیہ کلام کے دیوان مرتب کئے ہیں۔ مختلف زبانوں میں جو صوفی شعراء گزرے ہیں ان میں مقالہ نگار نے ابن العربی، مولانا روم، جامی، عطار، سنائی، عراقی، خسرو، شاہ عبد العزیز، مولانا قاسم نانوتوی،

مہاجر مکی، غلام سرور لاہوری، بچل سرمست، شہباز قلندر، احمد رضا خاں بریلوی، حسن بریلوی، پیر مہر علی شاہ، شاہ نیاز بریلوی، سید موارثی اور مفتی محمد دیدار علی شاہ کے ناموں کو قابل ذکر قرار دیا ہے۔ (ص ۸۳)

نعت کی مقبولیت میں مجلسی محرکات بھی شامل ہیں جیسے میلاد کی محفلیں، سیرت النبی کے جلسے، سماع کی محفلیں (ص ۸۴) نعتیہ مشاعرے (ص ۹۰) ان میں سے ہر ایک کی ابتدا اور خصوصیات کے بارے میں مقالہ نگار نے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ دور جدید میں ابلاغ کے نئے نئے ذرائع ایجاد اور مقبول عام ہوئے ہیں انہوں نے بھی نعت کی مقبولیت میں اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے ان میں ذرائع ابلاغ (رسائل و اخبارات) فلمیں اور گراموفون ریکارڈ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہیں۔ مقالہ کا یہ حصہ اس اعتبار سے چونکا دینے والا ہے کہ اس جانب کسی اہل علم نے توجہ نہیں کی تھی فلمی اور غیر فلمی نعتیہ ریکارڈ اور فلمی طرزوں پر لکھی گئی نعتوں کا جائزہ وضمیمہ نمبر ۷ (ص ۵۸۱ تا ۵۸۷) پر تفصیل سے لیا گیا ہے۔ یہ غیر معمولی کاوش ہے۔

باب دوم کے دوسرے حصے میں نعت کے ماخذات سے بحث کی گئی ہے۔ سب سے اہم ماخذ تو قرآن شریف ہے (ص ۹۵ تا ۱۰۳) اس میں قرآن کے حوالے، ان کے تراجم اور اسی موضوع پر شعراء کے کلام کو بھی پیش کیا ہے۔ دوسرا اہم ماخذ حدیث شریف ہے (ص ۱۰۴ تا ۱۰۸) "نعت گو شعراء کی تحریک و تخلیق کا بڑا ماخذ ایسی ہی احادیث ہیں جن کے مطالعہ سے رسول کریم ﷺ کے مقام و مرتبہ کا ادراک، ان کی فضیلت و شرف کا احساس، ان کی اطاعت و پیروی کا شوق پیدا ہوتا ہے نیز رسول اکرم ﷺ کی ذات ستودہ صفات سے عشق و محبت کے جذبات میں شدت سے اضافہ ہوتا ہے۔ احادیث نبوی آپ کی سیرت و سوانح کا اتنا وقیع اور اہم اثاثہ ہے کہ آپ کی سیرت اور نعت نگار کے لئے اس کی طرف رجوع لازم ہے (ص ۱۰۶)۔ تیسرا اہم ماخذ کتب سیر و مغازی ہیں۔ بقول شبلی آنحضرت ﷺ کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے ہیں۔ مقالہ نگار نے ان کتب اور مصنفین کے نام دیئے ہیں جن کو مغازی میں شمار کیا جاتا ہے (ص ۱۰۸) مقالہ نگار کے وسیع مطالعہ اور وسیع النظری میں قرآن و حدیث اور اسلام سے متعلق کتب ہی نہیں رہی ہیں بلکہ انہوں نے تورات، زبور، اناجیل کا مطالعہ بھی کیا اور ان میں شامل وہ حصے درج کیے ہیں جن میں آپ ﷺ کا ذکر اور فضائل بیان کیے گئے ہیں (ص ۱۱۰ تا ۱۱۹) یہ بھی ایک اہم اور نیا موضوع ہے جس پر عام طور پر معلومات کا فقدان ہے۔

اسی باب میں اسمائے رسول مقبول ﷺ بھی بیان کیے ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق "قرآن کریم وہ پہلا مستند ماخذ ہے جس میں آنحضرت ﷺ کے ان گنت صفاتی ناموں کا ذکر ملتا ہے مثلاً شاہد، مبشر، داعی الی اللہ، سراجاً منیر، نذیر، بشیر، رحیم، یزکی، امی، ہادی، شارح مدہاں، رؤف، رحیم وغیرہ۔" (ص ۱۹۹)

مقالہ نگار نے علمائے سابق کے حوالہ سے یہ بھی بتلایا ہے کہ خدا نے اپنے صفاتی ناموں میں سے کئی ایک

حضور علیہ السلام کے لئے استعمال کئے ہیں۔ اگر قرآن اور دیگر آسمانی کتابوں میں تلاش کیا جائے تو حضور کے ناموں کی تعداد تین سو سے چار سو تک ملتی ہے۔ مقالہ نگار نے دیدار علی شاہ کے گیارہ شعر نقل کئے ہیں جن میں حضور علیہ السلام کے ۴۶ نام گنائے گئے ہیں۔ (ص ۱۲۱، ۱۲۲)

اس باب کا ایک حصہ نعت کے عربی، فارسی پس منظر پر مشتمل ہے اس میں مقالہ نگار نے ان نعتیہ اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے جو بعثت سے قبل حضور علیہ السلام کی شان میں کہے گئے تھے۔ (ص ۱۲۴) اور پھر ماہ و سال کی ترتیب میں کہی گئی عربی نعتوں کا احوال ہے جسے وحی اولیٰ سے ہجرت مدینہ تک کے زمانہ کے نعتیہ اشعار (۱۲۴ تا ۱۲۷) نعت گوئی کا باقاعدہ آغاز (ص ۱۲۷، ۱۲۸) صحابہ کرام کی نعت گوئی (ص ۱۲۸ تا ۱۳۱) عہد مابعد صحابہ کی نعت گوئی (ص ۱۳۱ تا ۱۳۵) برصغیر پاک و ہند میں عربی نعت کے نمونے (ص ۱۳۵ تا ۱۳۶) یہ مقالہ کا ضمنی حصہ ہے حالانکہ حقیقت بینی اسے ایک مستقل باب ہی نہیں ایک مستقل مقالہ باور کرنے کے حق میں ہے یوں عربی نعت کا ذکر اکثر کتابوں میں ملتا ہے جو محض سرسری ہوتا ہے۔ اس سے لکھنے والوں کے مبلغ علم کی دھاک نہیں بیٹھتی۔ مقالہ نگار نے اس موضوع پر روشنی ڈال کر عربی دانی کا ثبوت بھی دیا ہے اور عربی ادبیات کے گلہائے عقیدت کی خوشہ چینی سے تبحر علم کی سند پیش کرتے ہوئے قاری کی معلومات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ ابھی ذہن مقالہ نگاہی کی ژرف نگاری کا اعتراف پوری طرح نہیں کر پاتا کہ اسی طرح کی معلومات کا ذخیرہ فارسی نعت کے حوالے سے سامنے آجاتا ہے۔

عربوں کی فتح ایران کے بعد جب اسلام کی شعاعیں اس سرزمین پر پھیلیں تو فارسی شعر و ادب پر بھی اسلامی اثرات مرتب ہونے لگے۔ عجمی لہجے میں جب حجازی لے شامل ہوئی تو نعت کا ایک نیا اور بالکل اچھوتا اسلوب سامنے آیا۔ مقالہ نگار نے ایران کے ادوار سامانیہ، غزنویہ اور سلجوقیہ کے شعری سرمایہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ قائم کیا ہے کہ ان ادوار میں "جہاں تک نعت کی تخلیق کا تعلق ہے حکیم سنائی کے علاوہ دوسرے شاعروں کی ہاں اس طرف بہت کم توجہ ملتی ہے بلکہ اکثر کے ہاں نہ ہونے کے برابر ہے۔" (ص ۱۳۷)

ابوالقاسم فردوسی کی مشہور زمانہ تصنیف "شاہنامہ" کے ساٹھ ہزار اشعار کے بارے میں مقالہ نگار کا تبصرہ ہے کہ اس میں "صرف چند اشعار نعت کے ملتے ہیں ان میں منقبت صحابہ بھی شامل ہے۔ (ص ۱۳۷)

دور سلجوقیہ کے رباعی گو شعراء بابا طاہر، ابو سعید ابوالخیر اور عبداللہ انصاری کے یہاں کہیں کہیں نعتیہ عناصر کا پتہ ملتا ہے البتہ ناصر خسرو اور فخر گورگانی کی شاعری میں مذہبی رجحانات ملتے ہیں۔

مقالہ نگار نے حکیم سنائی (م ۵۴۵ھ) کو فارسی کا پہلا نعت گو شاعر قرار دیا ہے اور ان کے اوصاف شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

"سنائی کی مثنویوں کے نعتیہ حصے شعری محاسن، ان کے حکیمانہ انداز، صوفیانہ گہرائی اور الہامی برجستگی کے سبب دل آویز اور اثر آفریں ہیں۔ ان میں خلوص کی فراوانی اور حضور اکرم ﷺ کی ذات اور مقام سے محبت و شیفتگی کا احساس و اظہار بدرجہ اتم موجود ہے۔" (ص ۱۳۸)

سنائی کے ساتھ فارسی نعت کے ارتقا میں ایک نام جمال الدین اصفہانی (م ۵۸۸ھ) کا ملتا ہے ان کے اشعار میں صنائع و بدائع کی کثرت ہے مگر ان میں کوئی ابہام نہیں ہے۔ (ص ۱۳۸)

سید حسن ملقب بہ اشرف غزنوی کے دیوان میں ۵۳ اشعار کا ایک ولولہ انگیز نعتیہ ترجیع بند ہے جس میں روضہ رسول پر حاضر ہونے کی کیفیات کی خوش بختیہ کا ذکر بڑے موثر پیرائے میں کیا گیا ہے۔

خاقانی کا نام نعت گوئی میں نمایاں ہے نظامی گنجوی، خواجہ فریدالدین عطار، فخرالدین عراقی، شیخ سعدی، اوحدی مراغیؒ، سلیماں ساوَجی، عبدالرحمٰن جامی، امام بوصیری، ہلال چغتائی، وحشی بافقی، محتشم کاشی، صائب تبریزی، مشتاق اصفہانی، فتح علی خان، صفی علی شاہ، وصال شیرازی، رجائی، اور یغمائی جندقی نے مقدور بھر فارسی نعت گوئی کی روایت کو آگے بڑھایا ہے مگر ان میں جامی کے پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہے ان کے علاوہ قاآنی، عاشق اصفہانی، سروش اصفہانی، ادیب الملک فراہانی، کے ہاں بھی نعت کے نمونے ملتے ہیں مقالہ نگار نے فارسی نعتیہ شاعری کا نچوڑ باب کے اس حصہ میں سمودیا ہے یہ عمل دریا کو کوزے میں سمودینے کے مترادف ہے۔

فارسی شاعری کی ذیل میں ان فارسی نعت گو شاعروں کا ذکر بھی ہے جن کا تعلق برصغیر سے رہا ہے ان میں امیر خسرو (ص ۱۴۹ تا ۱۵۰)، ابوالفضل فیضی (ص ۱۵۰، ۱۵۱) جمال الدین عرفی (ص ۱۵۱، ۱۵۲)، نظیری نیشاپوری (ص ۱۵۲) قدسی دہلوی (ص ۱۵۳)، غالب (ص ۱۵۴ تا ۱۰۷)، اقبال (ص ۱۵۷ تا ۱۶۱) شامل ہیں۔

بلاشبہ عربی اور فارسی نعت گوئی کے حوالے سے مقالہ نگار نے گرانقدر معلومات فراہم کی ہیں جو ان کے تبحر علمی کے مظہر ہیں۔ اسی زمانہ میں ان زبانوں پر عبور رکھنے والوں کی کمی نہیں لیکن وہ نگاہ حقیقت شناس کہاں جو تجزیئے کے ذریعے شعراء کے مقام کا تعین کرسکے۔ مقالہ نگار اس مرحلہ سے بھی سرخرو ہو کر گزرے ہیں لیکن ہمارا اعتراض اپنی جگہ قائم ہے جو ہم نے گذشتہ ابواب میں کیا ہے کہ موضوع اردو نعت گوئی ہے اس میں عربی اور فارسی کا اس قدر ذکر کیوں؟ بہتر ہوتا کہ عنوان کو وسعت دے کر عربی اور فارسی کو بھی شامل کرلیا جاتا کہ ان معلومات آفرین ابواب کی مقالہ میں شمولیت کا جواز پیدا ہو جاتا۔

تمہیدی نوعیت کے مباحث اور عربی و فارسی نعت گوئی پر تعارفی و تبصراتی اظہار خیال کے بعد ڈاکٹر ریاض مجید نے اردو نعت کا جائزہ تاریخی اعتبار سے لیا ہے اور حسب معمول دکنی ادبیات سے آغاز کیا

ہے۔ ہم اس امر کا بار بار اپنے مضامین میں اظہار کر چکے ہیں کہ دکنی قدیم اردو نہیں ہے وہ پنجابی کی طرح اردو سے جداگانہ ایک زبان ہے اس کی ابتداء اور اس کی نشوونما جدید زبانوں کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے۔ جن خصوصیات کو دکنی اور اردو میں مشترک گردانا جاتا ہے اس سے زیادہ صرفی، نحوی اور ذخیرہ الفاظ کے لحاظ سے دکنی اور پنجابی میں مماثلت ہے۔ دکنی ایک قدیم زبان نہیں جو اردو کی شکل اختیار کرنے کے بعد فنا ہو چکی ہو بلکہ وہ اب بھی زندہ ہے اور دکن کے دیہی علاقوں کے علاوہ شہری گھرانوں میں خواتین کی زبان پر ہے۔

بہر حال یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے تیسرے باب میں دکن میں نعت گوئی کا جائزہ لیا ہے اس سلسلہ میں دکنی زبان کی نشوونما کے سلسلہ میں سیاسی، تہذیبی اور لسانی پس منظر کو بھی فراموش نہیں کیا ہے یہ موضوع قیاسات پر بنی ہے اور آغاز اردو کی جب بھی بات کی جاتی ہے اس پس منظر کو پیش کیا جاتا ہے اس میں کوئی جدت، ندرت ہے نہ تحقیق کا کمال ہے جہاں تک دکن میں نعت گوئی کا تعلق ہے انہوں نے عہد قدیم کے مخطوطات کی بازیافت اور ان کی اشاعت پذیر ہونے والے کلام سے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے اور دکنی میں ایک نعت کا نمونہ درج کر کے اسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا تخلیقی کارنامہ قرار دیا ہے گویا یہی اولیں نعت ہے (ص ۱۶۸) دکنی ادبیات کے بارے میں تحقیقی کام مولوی عبدالحق، ڈاکٹر زور، نصیر الدین ہاشمی اور عبدالقادر سروری نے انجام دیا تھا اور بے شمار مخطوطات دریافت کیے تھے لیکن ان کے بارے میں جو نتائج کا استخراج کیا ہے ان میں سے بعض غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لئے کسی مخطوطہ کو کسی سے منسوب کرتے ہوئے پوری احتیاط برتنی چاہئے۔ "معراج العاشقین" کا مصنف کون ہے یہ سوال ڈاکٹر حفیظ قتیل نے سب سے پہلے اٹھایا تھا اور ایک مقالہ شائع کیا تھا بعد میں ڈاکٹر حسینی شاہد نے انتہائی محنت اور جان کاہی سے پی ایچ ڈی کا مقالہ "امین الدین اعلیٰ" پر لکھا اس میں متعدد دلائل سے اس نظریئے کو باطل قرار دے دیا کہ معراج العاشقین خواجہ بندہ نواز کی تخلیق ہے۔ مقالہ نگار نے خواجہ بندہ نواز کے بارے میں پیش کردہ معلومات کے ماخذ مولوی عبدالحق کی تحریریں ہیں جن پر مزید غور و خوص کی ضرورت ہے۔ مقالہ نگار نے وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ

> "سید رفیع الدین اشفاق کا مقالہ "اردو میں نعتیہ شاعری اگرچہ ۱۹۵۵ء میں مکمل ہوا مگر اس کی اشاعت ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ ان کتابوں کی موجودگی نے مواد کی فراہمی کے ساتھ ساتھ فکر و خیال کے نئے نئے گوشے سمجھائے خصوصاً قدیم دکنی مخطوطات و تصانیف کے بیشتر حوالے اشفاق صاحب کے مقالہ سے ماخوذ ہیں۔" (ص "ن")

بہر حال شائع شدہ دکنی شعریات کے علاوہ ڈاکٹر اشفاق کے پیش کردہ مخطوطات کی مدد سے اس بات کی تکمیل کی گئی ہے اس کا پہلا حصہ ابتدا سے عہد ما قبل ولی کی نعتیہ شاعری کے بارے میں ہے جس میں

معراج ناموں، میلاد ناموں، وفات ناموں، شمائل ناموں اور معجزات ناموں کی کثرت ہے۔ ان کے علاوہ نعتوں کا بڑا ذخیرہ مثنویوں میں ہے۔ باب کے دوسرے حصے میں ولی دکنی اور ان کے بعد کے شاعروں کے کلام میں نعتیہ عناصر کا سراغ لگایا گیا ہے اور ان کے کلام کی ادبی اور فنی حیثیت کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ باب کے آخر میں اس دور کے مولود ناموں اور معراج ناموں وغیرہ کی فہرست دی گئی ہے نیز جنوبی ہند کی نعت گوئی کا حیثیت مجموعی جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے اسالیب، زبان، مخصوصات اور اصناف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے طویل مباحث کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ اہم ہیں ان کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

(۱) اردو نعت کا آغاز اردو زبان ہی کے ساتھ ہوا۔ عربی اور فارسی کی طرح یہ صنف بعد میں متعارف نہیں ہوئی۔ اردو نعت کے ماخذ کا ادبی ورثہ وہی ہے جو اردو زبان کا ہے۔

(۲) اولین نعت گو صوفیائے کرام تھے جنہوں نے تبلیغ کے سلسلہ میں ایسی تصانیف لکھیں۔ اس طرح اردو نعت کا اولین سرمایہ فنی نہیں تبلیغی، اصلاحی اور مقصدی ہے۔

(۳) دکنی نعت کے موضوعات اور ان کا اسلوب عوام پسند ہے کیونکہ اسی سے مقاصد کا حصول ممکن تھا۔

(۴) اسلوب بیان میں مقامی معاشرت میں پھیلے ہوئے ذوق موسیقی اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ہندی گیتوں کے انداز اور زبان میں جکریاں، دوہرے اور گیت لکھے گئے ہیں۔ اکثر کلام ہندی راگوں کی طرز پر ہے۔

(۵) اردو قدیم کی غالب تصانیف مجلسی نوعیت کی ہیں جو پڑھنے کے لئے نہیں سنانے کے لئے لکھی گئی تھیں۔

(۶) ہیئت میں مثنوی کو ترجیح دی گئی ہے۔

(۷) ابتدائی سرمایہ نعت میں ہندی زبان کا غلبہ ہے جو آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ عربی کا کم اور فارسی زبان کا اثر غالب آتا گیا۔

چوتھا باب شمالی ہند میں نعت کے فروغ سے متعلق ہے۔ مقالہ نگار کے خیال میں شمالی ہند میں بھی اردو زبان وادب کے ابتدائی نمونے بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی تصانیف اور ملفوظات میں ملتے ہیں۔ شمالی ہند میں اردو نعت کے اولین عناصر کا ماخذ اردو کا وہ دور ہے جسے حافظ محمود شیرانی نے "خانقاہی اردو" سے یاد کیا ہے مقالہ نگار نے شمالی ہند میں نعت گوئی کو دو ادوار میں تقسیم کر کے بحث کی ہے پہلا دور میرؔ و سوداؔ سے قبل کا ہے۔ دوسرا دور میرؔ، سوداؔ اور مصحفیؔ سے شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور کے شعراء میں غلام قادر خان (ص ۲۶۸)، شیخ محمد حاجی (ص ۲۷۱)، امام حشن قادری (ص ۲۷۱)، شیخ ابوالفرج، قاضل الدین بٹالوی (ص ۲۷۱) قاضی فضل حق (۲۷۲)، شیخ عثمان (۲۷۳)، جانی (۲۷۴)، محبوب عالم عرف شیخ جیون (۲۷۵)، اسماعیل امروہوی (ص ۲۷۷ تا ۲۸۰) شامل ہیں۔ ان کے بارے میں زیادہ تر معلومات

حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" سے لی گئی ہیں۔ ہر شاعر کے نعت کے اشعار بھی درج کیے گئے ہیں۔

اس دور کی خصوصیات کے بارے میں مقالہ نگار کا خیال ہے کہ دکن کی طرح شمالی ہند میں بھی نعت کا آغاز صوفیائے کرام نے انہیں مقاصد کے تحت کیا جو دکن میں پیش نظر تھے۔ دوسری خصوصیت جو انہیں دکنی نعت سے ممتاز کرتیں ہے مناجاتی انداز ہے یہاں بھی ادبیت اور شاعری مقصد بالذات نہیں بلکہ ان کی حیثیت ثانوی رہی۔ اس کے باوجود نعت پاروں میں احساس کی صداقت اور خلوص کا اظہار ملتا ہے۔ نعت کے نمونے اسلوبی لحاظ سے متنوع ہیں۔

شمالی ہند میں نعت گوئی کے درخشاں دور کا آغاز سوداؔ اور میرؔ سے ہوتا ہے۔ سودا فن شاعری پر عبور کامل رکھتے تھے جس صنف اور موضوع پر قلم اٹھایا ناقابل فراموش نقش چھوڑے۔ قصیدے کے تو وہ مسلمہ استاد ہیں۔ ان کے زور بیان، فنی پختگی اور قادر الکلامی کے نمونے دیکھنے ہوں تو قصیدے میں دیکھیں۔ سوداؔ کا ایک نعتیہ قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے۔

> ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
> نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیح سلیمانی

اسی کے بارے میں مقالہ نگار نے ڈاکٹر طلحہ رضوی برق کی رائے سے اتفاق کیا ہے کہ "اس قصیدے کو شمالی ہند میں اردو کی باضابطہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جاسکتا ہے۔" (ص ۲۸۱)

قصیدہ کی تشبیب اخلاقی مضامین سے عبارت ہے۔ شاعر عشق مجازی سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دل کو دین محمدی میں داخل ہونے کی تلقین کرتا ہے اس کے بعد دین محمدی کی تعریف اور نعت رسول اکرم ﷺ کا بیان شروع ہوتا ہے۔ اس قصیدہ کی منفرد خصوصیت اس کا اسلوب ہے جس نے اسے فارسی کے بہترین قصائد کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ سوداؔ سے قبل جنوبی ہند میں قصیدہ مسلسل غزل کے انداز میں تھا سوداؔ نے اس میں زورِ بیان، شوکت الفاظ، علوئے تخیل، معنی آفرینی، نزاکت مضمون اور جدت ادا سے آشنا کیا۔ قصیدہ کی طرح سوداؔ نے مثنوی میں بھی اس صنف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے دل پذیر نعت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ "مثنوی حکایات شیخ و دعا پادشاہ" میں نعت کے اشعار بڑے کمال کے لکھے ہیں یہی حال سوداؔ کی اس مثنوی کا ہے جو ایک درویش اور عرس کے حوالہ سے ہے۔

میرؔ کا نعتیہ کلام زیادہ نہیں۔ ان کا ایک مسدس "دربار رسالت مآب میں ایک عاصی اور گناہگار کا ندامت نامہ" اہم ہے جو بارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ "یہ ایک مسدس ہی اپنی فکری اور فنی خوبیوں کے باعث اس قابل ہے کہ شمالی ہند کے اولین نعت گو شعراء میں میرؔ کا ذکر بھی کیا جائے۔" (ص ۲۸۹)

اردو شاعری کے اس عظیم الشان دور میں سوداؔ اور میرؔ کے جلو میں غلام ہمدانی مصحفی بھی ہیں جو

اپنے معاصر دونوں شاعروں سے کم نہیں ہیں۔ یوں تو ان کی غزلیات میں نعتیہ اشعار ہیں لیکن ان کا ایک نعتیہ قصیدہ خاص طور سے مطالعہ کے قابل ہے۔ اس قصیدے میں بعض معاصر شعراء پر سخت تنقید کی ہے کہ وہ لسانی اور عروضی رویوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور زبان و محاورہ کی صحت کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ اساتذہ سخن پر تنقید اور طنز کے بعد گریز اور مدح پر آگئے۔ ان کے کلام میں دیوان قصائد جلد اول میں دو قصیدے اور دیوان قصائد جلد دوم میں تین قصیدے نعتیہ ہیں جو متانت، پاکیزگی اور خلوص سے عبارت ہیں۔

مقالہ نگار نے اسی باب میں مومنؔ کو بھی شامل کیا ہے۔ اگرچہ وہ غزل کے مایہ ناز شاعر ہیں لیکن ان کا مذہبی پس منظر بھی ہے مومنؔ کے کلام میں نعت کا ایک زوردار قصیدہ ہے۔ ایک مثنوی میں نعت کے ۸۳ شعر ہیں۔ قدسی کی فارسی غزل پر تضمین کی ہے اور چند نعتیہ رباعیاں لکھی ہیں ان کے علاوہ غزلوں میں حمد و منقبت میں بھی نعت کے اشعار لکھے ہیں۔ مومنؔ کا نعتیہ قصیدہ "زمزمہ سنجیٔ طبع یا مضمون باد خوانی نسیم گلشن نبوت و شمال چمن رسالت" ہے یہ علمی انداز کا قصیدہ ہے۔ اس میں الفاظ و تراکیب کا شکوہ بھی ہے اور زور بیان بھی، کہیں کہیں نامانوس الفاظ اور ایسی علمی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں کہ عام قابلیت کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ بقول مقالہ نگار:

> "شروع سے آخر تک اس قصیدے کا انداز مومنؔ کی علمی وجاہت اور نکتہ آفرینی کا گواہ ہے۔ اس کے قوافی مومنؔ کی مشکل پسندی اور فن اور زبان پر عبور کے غماز ہیں۔" (ص ۲۹۵)

کلیات مومنؔ میں ایک نعتیہ مثنوی بھی ملتی ہے جو قصیدے کے برخلاف اور مثنوی کی صنف کی رعایت سے سلاست و روانی کی عمدہ مثال ہے گویا مومنؔ کے یہاں متنوع اسالیب کی جلوہ فرمائی ہے۔ مقالہ نگار نے مومنؔ کی نعت گوئی پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی وہ جو (ص ۲۹۲ سے ۳۰۰) تک محیط ہے۔ ڈاکٹر اشفاق کی نسبت ڈاکٹر ریاض مجید نے مومنؔ کے نعتیہ کلام کا زیادہ دلچسپی اور وضاحت سے تذکرہ کیا ہے۔ اسی باب میں مختصراً میر مہدی مجروحؔ اور میر حسن کا بھی ذکر ہے۔

باب چہارم کا دوسرا حصہ جو سوداؔ، میرؔ اور مومنؔ کے بعد شروع ہوتا ہے اسے مقالہ نگار نے اردو نعت کا دورِ تشکیل قرار دیا ہے جو کرامت علی خاں شہیدیؔ، کفایت علی کافیؔ، غلام امام شہیدؔ، لطف علی خاں لطف بریلوی، تمنا مراد آبادی کے نعتیہ کلام سے منور ہے۔ مقالہ نگار کا مطالعہ بتلاتا ہے کہ اس تشکیلی دور پر عصری، معاشرتی اور مذہبی تحریک۔ شاہ اسماعیل شہیدؔ کی تحریک اور اس کے رد کی تحریک ایسے محرکات تھے کہ ان میں کسی نہ کسی سے مسلمان شاعروں کے ذہن متاثر ہوتے رہے۔ شاہ اسماعیل کی "تقویت الایمان" کا زبردست رد عمل نعت گو شعراء پر ہوا انہوں نے حضور ﷺ کی فضیلت، مدح اور عشق رسول ﷺ کے

اظہار کے ساتھ عصری مذہبی مسائل کو بھی نعت میں موضوع بنایا۔ اس دور کے رجحانات کو مقالہ نگار نے اس طرح بیان کیا ہے۔

(۱) مجالس میلاد کے انعقاد کی اہمیت و فضیلت پر زور اور منکران میلاد کے خلاف شدید رد عمل
(۲) میلادیہ نعتوں کی کثرت
(۳) درود شریف کے موضوع پر نعتیں اور سلام
(۴) حیات النبی اور آنحضرت ﷺ کے علم غیب کے اذکار
(۵) حضور اکرم ﷺ کی بشریت کے مقابلے میں آپ کی رسالت و نبوت کے خصوصی تذکرے
(۶) یا رسول اللہ، یا نبی، یا مصطفےٰ کے انداز سے خطاب نیز آپ سے استمداد اور توسل فی الدعا کے مضامین
(۷) امکانِ نظیر کا رد اور امتناع نظیر کا بیان (ص ۳۰۲، ۳۰۳)

دورِ تشکیل کے شاعر شہیدیؔ نے اپنی نعت گوئی سے انمٹ شاعرانہ نقوش چھوڑے ہیں ان کا قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

رقم پیدا کیا کیا طرفہ بسم اللہ کی مد کا
سر دیواں لکھا ہے میں نے مطلع نعت احمد کا

اس دور کا معرکتہ الآراء قصیدہ ہے اس میں ۳۳ شعر ہیں اور یہ رنگ قدیم کی شاعری کے انداز و اسلوب کا حامل ہے۔ اس میں تشبیہات و استعارات، تراکیب اور حسن تعلیل کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ شہیدیؔ نے تشبیب کو گریز کے التزام کے بغیر مطلع سے مقطع تک سارا زور بیان مدح پر صرف کیا ہے اس لئے اسے قصیدہ کے بجائے مسلسل غزل کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بلند معیار اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ محسن کاکوروی اور امیر مینائی نے اس کی پیروی میں نعتیہ قصیدے کہے۔ ذوقؔ کے شاگرد مذاقؔ نے اس کی تضمین میں ایک بھرپور اور وقیع خمسہ لکھا۔

شہیدیؔ نے اس قصیدے کے علاوہ غزل کی ہیئت میں دو قابل ذکر نعتیں لکھی ہیں ان میں دو نعتیہ غزل بھی شامل ہے جس کا مطلع ہے

ہے سورہ والشمس اگر روئے محمد والليل کی تفسیر ہوئی موئے محمد

"اس نعتیہ غزل میں جمال محمدی کے ظاہری پہلو خصوصاً آپ کے خد و خال اور ابرو و گیسو کی تعریف کی ہے۔ یہاں موضوع اور اظہار کے انتخاب اور پیشکش میں لکھنوی شاعری کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ نکتہ آفرینی اور صنعت گری کے نمونے کم و بیش سبھی شعروں میں ملتے ہیں۔ جس کے سبب خارجیت نمایاں ہے اور واقعی احساسات و واردات کا فقدان ہے۔" (ص ۳۰۶، ۳۰۷)

شہیدیؔ کے کلام میں ایک نعتیہ رباعی، جرأت اور عطا حسین عطا اور شاہ نصیر کی غزلوں پر

تضمین، جامی کی ایک غزل پر خمسہ اور ایک غزل بھی شامل ہیں۔ مقالہ نگار نے شہیدی کے کلام کے نمونے ہر شہ پارے سے پیش کر کے انہیں دور تشکیل کا اہم شاعر قرار دیا ہے۔

دور تشکیل کے دوسرے اہم شاعر جنہوں نے نعت گوئی میں دائمی نقوش چھوڑے غلام امام شہید ہیں۔ انہوں نے اردو نعت کو ایک انفرادی رنگ دیا۔ سوز و گداز میں ڈوب کر نعتیں لکھیں جس سے نعت کی لے بدلی اور وہ رسمی دائرے سے نکل کر حقیقی اور تخلیقی انداز سے روشناس ہوئی۔ فضل فتح پوری نے جن خصوصیات کو امیر مینائی کی نعت گوئی سے منسوب کر کے انہیں جس طرز خاص کا موجد قرار دیا ہے اس کی ابتداء شہیدی اور شہید سے ہو چکی تھی دونوں کے کلام میں دروں بینی ہے اور دونوں کی نعتیں تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

شہید نے غزل، مثنوی، ترجیع بند اور دیگر ہیئتوں میں نعت کہی۔ مختلف بحور کو استعمال کیا جس سے ان کے فن پر عبور کی شہادت ملتی ہے۔ بحر طویل میں ان کی ایک نعت مشہور ہے۔ ان کی نعتیہ غزلیں زیادہ پُر تاثیر اور شگفتہ ہیں۔ ان کا ایک میلاد شریف بھی مقبول خاص و عام رہا ہے۔ اس میں ۲۶ اشعار ہیں۔ "حضور ﷺ کی ولادت سے قبل کون و مکان میں آپ کے استقبال کی تیاریوں پر مشتمل اس نعت میں شاعر نے آپ کی صفات اور اسمائے مبارکہ کے ساتھ زمین و عرش کی اس رونق اور ہماہمی کا نقشہ بڑے دلکش پیرائے میں کھینچا ہے۔" (ص ۳۱۷) اس میں ایک طویل سلام بھی ہے۔ سلام کے ۱۵ شعر کے بعد کلام التجا اور مناجات کے انداز میں بدل گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس میں تنوع ہے جدت ہے اور تمام شاعرانہ خوبیاں یکجا ہیں۔

شہید کے کلام میں تین منظوم قصے بھی ہیں ان میں عشق رسول ﷺ کی کیفیات اور واردات قلب کا بیان ہے۔

ڈاکٹر اشفاق نے بھی شہیدی اور شہید کی نعت گوئی کا جائزہ لیا ہے جو یقیناً طویل اور ہمہ جہت ہے لیکن ڈاکٹر ریاض مجید نے اس میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے مقالہ میں ایسی تفصیلات بھی ہیں جو ڈاکٹر اشفاق کے یہاں نہیں ملتیں۔ کلام کے نمونے بھی زیادہ ہیں اور کلام کی خصوصیات بیان کرنے میں بھی انہوں نے زیادہ وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض کے تعارف اور تبصروں میں جامعیت ہے اس سے ڈاکٹر اشفاق کی تحریر کو کمتر ثابت کرنا ہرگز مطلوب نہیں ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں تو یہ ان سے کاندھا ملانے کی ہمت کے ساتھ سامنے آئے ہیں۔

ڈاکٹر اشفاق نے بھی لطف علی خاں لطف کی نعت گوئی کو سراہا ہے۔ ڈاکٹر ریاض نے بھی اس معاملہ میں کوتاہی نہیں کی ہے ان کا تبصرہ نہایت واضح اور جاندار ہے لکھتے ہیں:

"لطف بریلوی سے پہلے نعت ایک موضوع تھا جسے مختلف شعراء نے فنی طور پر

برتا اور مختلف اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی میں نعتیں لکھیں مگر لطف بریلوی کے ہاں یہ موضوع ایک جداگانہ صنف کے طور پر ابھرتا محسوس ہوتا ہے۔ لطف بریلوی کی نعت گوئی مقدار اور کیفیت دونوں اعتبار سے نعت کے موضوع کو اردو میں پہلی مرتبہ ایک علیحدہ صنفی درجہ عطا کرتی ہے۔"
(ص ۳۳۲)

نعتیہ غزلوں کے علاوہ لطف کا میلادیہ کلام بھی اس صنف کی سابقہ کاوشوں کے مقابلے میں متنوع اور جاندار ہے۔

تشکیلی دور کے متذکرہ معروف شاعروں کے زمرے میں ڈاکٹر ریاض مجید نے مولوی کفایت علی کافی مراد آبادی (ص ۳۰۸ تا ۳۱۵) شاہ نیاز احمد بریلوی (ص ۳۳۰، ۳۳۱)، مولوی محمد حسین تمنا مراد آبادی (ص ۳۴۰ تا ۳۴۷) کا ذکر بھی کیا ہے۔ ان میں شاہ نیاز احمد بریلوی کے علاوہ ہر ایک کی نعت گوئی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر اشفاق کے مقالہ میں ان میں سے کسی کا نام شامل نہیں ہے گویا ڈاکٹر ریاض مجید نے اس اضافہ سے اپنے وسیع مطالعہ کا ثبوت دیا ہے۔

ان اذکار کے آخر میں مقالہ نگار نے اس دور کی اہم خصوصیات کی نشاندہی کی ہے۔ جو یہ ہیں

(۱) چند ایسے شاعر ملتے ہیں جنہوں نے کلی طور پر اپنے فکر و فن کو نعت کی تخلیق کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے نعت گوئی کو جزوی اور تقلیدی روش سے نکال کر تشکیلی دور میں داخل کیا۔

(۲) زیادہ تر غزل کی ہیئت میں نعت کہی گئی۔

(۳) نعتیہ دیوان مرتب کرنے کا رواج ہوا۔

(۴) اس دور میں بھی نعت کا قابل لحاظ حصہ میلاد سے متعلق ہے۔ جو دراصل تقویت الایمان کا ردِ عمل ہے۔

(۵) نعت میں معاصر ادبی و فنی رویوں کی جھلکیاں ملتی ہیں جن میں غزل دوستی، خارجیت، سراپا نگاری، رعایت لفظی، صنائع و بدائع وغیرہ کی وہ خصوصیات بھی ہیں جو لکھنوی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ (ص ۳۴۷)

یہ باب امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعت گوئی تک پھیلا ہوا ہے۔ امیر مینائی غزل کے شاعر تھے۔ مذہبی پس منظر کے سبب ان کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں نعت کے اشعار آگئے ہیں لیکن باقاعدہ نعت کا آغاز اس وقت کیا جب وہ کاکوروی میں آئے اور محسن کی صحبت میسر آئی۔ ان سے متعدد تصانیف یادگار ہیں۔ محامد خاتم النبین، مثنوی نور وتجلی وابر کرم، نعتیہ مسدس صبح ازل شام ابد، لیلۃ القدر اور شاہ انبیاء۔ ان کے علاوہ امیر نے تین نعتیہ قصیدے لکھے "خیابان آفرینش" ان کا لکھا ہوا مولود نامہ ہے جو نثر میں ہے اس کے آخر میں اشعار ہیں تاکہ نثری مولود پڑھنے والے جہاں چاہیں ان اشعار کو پڑھ لیں۔

امیر مینائی نے نعت کو شغف یا رسم کے طور پر اختیار نہیں کیا بلکہ اسے ایک اہم شعری صنف کا

درجہ اور معیار دینے کی مخلصانہ کوشش کی۔ مقالہ نگار نے دقت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے امیر کے نعتیہ کلام کو دو حصوں میں منقسم کر کے مطالعہ کیا ہے پہلے حصے میں اس کلام کو زیر بحث لایا گیا ہے جس کو مجلسی ضرورتوں کے مد نظر لکھا گیا۔ اس میں میلاد کی مجلسوں کے انعقاد، خیر و برکت اور حضور ﷺ کی سیرت کے پہلو نمایاں کئے ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے عقیدت کے اظہار و محبت میں درود شریف اور صلوٰۃ و سلام ان نعتوں کا خاص وصف ہوتا۔ امیر مینائی نے میلاد کے تمام مروج اور مقبول عام موضوعات پر نعتیں لکھی ہیں۔ اس قسم کی میلادی نظموں میں ایک اہم موضوع حضور ﷺ کی ولادت مبارک کا بیان بھی ہے۔ محامد خاتم النبیین کی پہلی نعت میں اس موضوع پر مسلسل غزل ہے اس کی ردیف "پیدا کیا" ہے۔

"محامد خاتم النبیین" میں دوسری قسم کی نعتیں معراج کے موضوع پر ہیں۔ یہ نعتیں تعداد اور کیفیت کے لحاظ سے وقیع ہیں۔ معراج ناموں کا تجزیہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے

> "معراج ناموں کی اکثریت چونکہ مثنوی کی ہیت میں ہے لہٰذا وہاں مثنوی کی صنفی خصوصیات کے باعث ربط و تسلسل سے فضابندی کی جاسکتی ہے مگر غزل کی ہیت میں لکھی جانے والی نعتوں میں کسی مربوط فضابندی اور ماحول نگاری کی گنجائش بہت کم ہے۔ یہاں غزل کی ریزہ کاری اور دوسری صنفی پابندیوں کے سبب کوئی مربوط اور واضح تاثر برقرار رکھنا بہت مشکل ہے مگر امیر مینائی نے اپنی فنی مہارت سے اس موضوع پر لکھی گئی نعتیہ غزلوں میں بھی فضاسازی اور ماحول نگاری کے موثر نمونے پیش کئے ہیں۔" (ص ۳۵۲)

معراج کے ایک ترجیع بند کی بھی مقالہ نگار نے نشاندہی کی ہے اور اس کے اشعار بھی درج کئے ہیں (ص ۳۵۳، ۳۵۴)۔ انہوں نے شیخ سعدی کے مشہور نعتیہ قطعہ پر تضمین بھی لکھی ہے جس کے مطالعہ سے مقالہ نگار نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ امیر مینائی ترکیب سازی میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ان کی تراکیب میں ندرت اور جدت ہے مثلاً گہر محیط، عطائے رب، قمر سمائے سخاء رب، شجر ریاض رضائے رب، ثمر نہال ولائے رب گل باغ نشو و نمائے رب، نگہ آشنائے ادائے رب، بجمال شوق رضائے رب، ہمائے اوج ہوائے رب وغیرہ

دبستان لکھنو کا ہر رنگ امیر کے کلام پر چھایا ہوا ہے۔ ان ہی رنگوں میں سراپا نگاری بھی کی ہے اگرچہ امیر کے ہاں مربوط اور مسلسل سراپا نگاری نہیں ہے لیکن وہ جمال ظاہری اور اعضائے مبارک کے اوصاف کا ذکر گاہے گاہے کرتے رہتے ہیں۔

امیر مینائی کے نعتیہ کلام کا غالب حصہ غزل کی ہیت میں ہے "وہ اردو شاعری کی تاریخ کے پہلے بڑے صاحب طرز غزل گو ہیں جنہوں نے کیف نعت کو رنگ تغزل سے ہم کنار کیا"

"___ شاعری سے خداداد مناسبت کے سبب اگرچہ ان کے سارے کلام میں تازگی مضمون، پاکیزگی زبان اور متانت انداز کی وجہ سے ایک خاص انفرادیت کا احساس ہوتا ہے مگر ان کی غزل گوئی کا ایک خاص انداز ہے۔ تخیل کی رنگینی اور خلاقی کے ساتھ لکھنوی کی فصیح و سلیس اور آراستہ زبان ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیات ہیں جب ان کی غزل گوئی میں نعت کے مضامین در آئے تو رنگ تغزل اور کیف نعت کے امتزاج نے ایک حسین اور موثر کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہی دل نشینی ان کی نعتیہ غزلوں کا جوہر ہے۔" (ص ۳۵٦)

یوں تو امیر مینائی کی نعتیہ غزلوں کی تعریف میں اور مبصرین نے لفظوں کے طوطے مینا اُڑائے ہیں لیکن علمی انداز میں تجزیاتی مطالعہ اور نتائج کا استخراج جس طرح ڈاکٹر ریاض مجید نے کیا ہے دوسروں کی فکر اور نظر وہاں تک پہنچنے بھی نہیں پائی۔

امیر مینائی سے کاندھا ملائے کھڑے ہوئے شاعر محسن کاکوروی ہیں کہنے والے نے سچ کہا ہے

"نعت گوئی تو سب کے لئے ہے مگر محسن کاکوروی نعت کے لئے ہیں۔"

وہ جس کو شعر گوئی کا مذاق اور اس پر قدرت فطرت کا عطیہ تھے انہیں محسن نے تمام مروجہ تخیلی مضامین کی "شعر بندی" میں صرف نہیں کیا اسے آنحضرت ﷺ کے حضور نذرانہ عقیدت و احترام و محبت کے لئے صرف کیا ہے۔ مال کمالینا بڑا کام نہیں مال کو صحیح طور پر خرچ کرنا کمال ہے۔ محسن کے علم اور فن ان کے متاع عزیز تھے انھوں نے نچھاور کئے تو حضور ﷺ کے قدموں پر! اردو شاعری اور نعت گوئی کا کون نقاد ہے جو ان کا سپاس گذار نہیں۔ محسن نے مثنوی، قصیدہ اور رباعی کی ہیئتوں میں نعت گوئی کی ہر صنف سخن کے تقاضے مختلف ہونے کے باوجود ان میں ان کے چھوڑے ہوئے نقوش انمٹ بھی ہیں اور قابل تقلید بھی۔

ان کی مثنویوں میں صبح تجلی حضور ﷺ کی ولادت کے موضوع پر ہے لیکن سلسلہ کلام میں واقعہ معراج پر بھی شعر کہے ہیں۔ مثنوی مناجات پر ختم ہوئی ہے۔ دوسری مثنوی "چراغ کعبہ" کا موضوع صرف معراج ہے۔ مقالہ نگار نے محسن کی مثنویوں کے بارے میں مناسب رائے دی ہے کہ

"انھوں نے لکھنوی شاعری کی عام روش کے مطابق صنعت گری اور رعایت لفظی کو نہ تو مقصد شعر سمجھا ہے اور نہ ہی اسے مبالغہ و اغراق کے لئے استعمال کیا ہے۔" (ص ۳٦۸)

محسن نے مثنوی ہی میں کمال فن اور جوش عقیدت کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ قصیدہ میں بھی ایک نیا رنگ جما کر قصیدہ نگاروں کو چونکا دیا ہے۔ عربی روایت کے مطابق قصیدے کی تشبیب میں مضمون کی قید نہیں ہوتی اسی کو ملحوظ رکھتے ہوئے محسن نے ہندوستانی معاشرت، روایات اور ہندوؤں کی صنمیات کو تلمیح، استعارے اور

اشاریت کے طور پر استعمال کر کے جدت پیدا کی ہے جہاں تک تشبیب کے حسن اور شاعری حسن کاری کا تعلق ہے دو آراء نہیں ہو سکتیں لیکن موضوع کا تعلق اسلام سے مخالف اور متصادم ہے اور اردو دنیا کے ہر حلقہ اور ہر جانب کے لئے آشنا نہیں اس لئے اس پر اعتراضات بھی ہوئے۔ صفحات ماقبل میں ہم اس کا اظہار کر چکے ہیں یہاں اعادہ غیر ضروری ہے اپنے خیالات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہم فاضل مقالہ نگار کی رائے درج کرتے ہیں۔

> "بہ حیثیت مجموعی اس قصیدے کو نہ صرف محسن کے نعتیہ قصائد بلکہ اردو قصائد نعت کی تاریخ میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس قصیدے کی اس سے بڑی خوبی کیا ہو گی کہ اگر اردو کے نعتیہ قصائد میں مقبولیت و شہرت اور فنی محاسن کے اعتبار سے صرف ایک قصیدہ منتخب کیا جائے تو بلا خوف تردید محسن کے اس لامیہ قصیدہ کا نام ذہن میں آتا ہے اس قصیدے کی شہرت کا محسن کے نعتیہ کلام پر ایک اثر یہ بھی پڑا کہ اس کے مقابلے میں ان کے دوسرے قصیدے، گلدستہ رحمت، ابیات نعت، نظم دل افروز اور انیس آخرت ان ہی فنی خوبیوں کے باوصف مشہور نہ ہو سکے۔"
>
> (ص ۳۷۷)

شمالی ہند میں نعت گوئی کا جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگار نے چند اہم نتائج اخذ کئے ہیں۔

(۱) شمالی ہند کے قدما میں ذوق نعت گوئی کم پایا جاتا ہے۔ سودا اور ان کے بعد مومنؔ دو شاعر ہی ایسے ہیں جو دبستان دہلی کی نعت گوئی کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔

(۲) دہلی کے نعت گویوں بالخصوص میر حسن کی مثنوی میں نعت درباری لہجے میں ہے کہ یہ وہاں کی معاشرت کا حصہ تھا۔ لکھنو کی نعت میں منقبت اہل بیت کے مضامین بھی آجاتے ہیں۔

(۳) اردو نعت کا اظہار غزل کی ہیئت میں ہونے لگا اور یہی روایت بن گئی۔

مقالہ نگار نے پانچواں باب "عصر جدید کی نعت" کے لئے مختص رکھا ہے۔ عصر جدید مشہور شاعروں حالیؔ اور شبلیؔ سے شروع ہو کر مضطرؔ اور جلیلؔ مانک پوری تک بتلایا گیا۔ صحیح معنوں میں دیکھا جائے تو عصر جدید کا آغاز ۱۸۵۷ء کے جذبہ آزادی سے ہوتا ہے یہ نہایت افسوس ناک صورتحال ہے کہ ۱۸۵۷ء اور اس سے قریبی زمانہ کے حالات تحقیق اور حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے تاحال نہیں لکھے گئے۔ "غدار شعراء" پر تو کتابیں ہیں مجاہد شعراء پر کوئی تذکرہ نہیں۔ مقالہ نگار نے اس عہد کے سیاسی حالات، انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ اور ان کے استبداد سے آزادی کے لئے جہاد کی تبلیغ کو موضوع بنا کر ایک چونکا دینے والے باب کا اضافہ کیا ہے۔ نعت گوئی کے حوالہ سے پانچویں باب کا یہ حصہ ایک اضافہ ہے۔ مقالہ نگار نے مولانا لیاقت علی الہ آبادی، مولانا رضی الدین بدایونی شہید، منیر شکوہ آبادی، امیر دہلوی، امیر مینائی،

مفتی سید احمد خان، مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا کفایت علی کافی کا ذکر کیا ہے اور ان سب کو ان شعراء میں شامل کیا ہے جنہوں نے جنگ آزادی میں حصہ لیا اور نعت کریم میں شعر کہے ان کے عزم و حوصلہ پیدا کرنے والے کلام میں نعت کا عنصر غالب ہے اور حضور ﷺ کی تعلیمات کی روشنی ہی میں وہ جہاد کی تعلیم دیتے تھے۔ مقالہ نگار نے مولانا لیاقت علی الہ آبادی کی "نظم جہادیہ" کو اس دور کی اہم یادگار قرار دیا ہے۔ مولانا انگریزوں کے خلاف جہاد کے پر زور مبلغ تھے۔ ان کی نظم کوچہ وبازار میں ہر جگہ سنائی جاتی۔ اسے چھاپ کر دیواروں پر چسپاں کیا جاتا۔ اس نظم سے لوگوں کے دلوں میں جوش و خروش پیدا ہوتا اور وہ دین پر نثار ہونے کے لئے تیار ہو جاتے۔ ان کے ذکر کے ساتھ نظم کے وہ اشعار بھی درج ہیں جو نعتیہ انداز میں ہیں اور حضور کے حکم کو عام کرتے ہیں کہ فردوس تلوار کے سائے میں ہے۔ مولانا لیاقت علی نے جہاد میں حصہ لیا، گرفتار ہوئے اور جزیرہ انڈمان میں شہید ہوئے۔ مولانا کفایت علی کافی بھی جہاد میں عملاً شریک رہے اور جب مراد آباد میں انہیں پھانسی دی گئی تو اس وقت ان کے ہونٹوں پر نعت کے اشعار جاری تھے۔ مولانا فضل حق نے نعتیہ اشعار لکھے لیکن عربی میں۔ انہوں نے بھی جزیرہ انڈمان کی قید میں شہادت پائی۔ امیر دہلوی ان مجاہدوں کے ساتھ تھے انہیں بھی اس وقت گرفتار کیا گیا جب ان کی زبان سے نعتیہ اشعار جاری تھے۔ اس دور کے تمام شعراء اور ان کے جذبہ جہاد کے ساتھ حب رسول ﷺ پر مبنی کلام کا حوالہ دے کر مقالہ نگار نے غیر معمولی معلومات کا اضافہ کیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل میں ایمان تازہ کرنے، رسول اللہ ﷺ کی ذات سے محبت کو جگانے اور زندگی کو اسلامی اقدار کی خاطر جان دینے کے لئے تیار کرنے کے لئے تاریخ کے ان گم شدہ ابواب کا بار بار اعادہ کیا جائے۔

۱۸۵۷ء اور مابعد کے عہد کی جہادیہ نعتیہ شاعری کا سرسری جائزہ لینے کے بعد مقالہ نگار نے نشاندہی کی ہے کہ شاعروں نے عالمگیر جنگ عظیم کے زمانہ میں ارض مقدس پر نصاریٰ کے حملے، مسلمانوں سے جھوٹے وعدے اور ان وعدوں کی خلاف ورزی کے پیش نظر بھی سامراجی قوتوں کے خلاف نظمیں لکھیں ان میں بھی نعتیہ عنصر موجود ہے اس دور کے شاعروں میں قاضی منیر الحسن (اعظم گڑھ)، قاری محمد حسین، مولانا ظفر علی خان، وحید الدین، قمر الدین، قاضی ظہور الحق، مولوی احمد علی احمد امیر، حافظ محمد مختار، مولوی عبد الوحید مومن ان شعراء میں ہیں جنہوں نے تحریک خلافت اور تحریک ناموس خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مقبول عام نظمیں کہیں جو حب رسول ﷺ سے مامور ہیں۔ ان سب کو مقصدی شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان شعراء کا کلام صرف نعت گوئی کے مقصد سے تخلیق نہیں ہوا بلکہ ان کے کلام کی اصل بنیادی وجہ اسلام سے محبت اور اس کا نام اونچا کرنے، اسے قائم و باقی رکھنے اور اسلام دشمنوں کو للکارنا تھا۔ ساتھ ہی اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کہ اسلام سے محبت حب رسول ﷺ کے بغیر مکمل نہیں اور حب رسول اسلام کی خدمت کے بغیر مکمل نہیں۔ اس باب کا یہ حصہ

مختصر ہونے کے باوجود دعوت فکر دیتا ہے اسے طویل بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ مقالہ کا جزوی موضوع ہے۔

ان تمہیدی اور فکر انگیز خیالات کے بعد مقالہ نگار نے حالی سے نعت گو شعراء کا تعارف اور ان کے کلام پر تبصرہ کا آغاز کیا ہے (ص ۳۹۹ تا ۴۰۷) حالؔی کو عصر جدید کا پہلا اہم شاعر قرار دیا گیا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام مقدار میں کم مگر معیار کے اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ڈاکٹر اشفاق بھی اس حقیقت کا اظہار کر چکے ہیں اور مقالہ نگار نے بھی اس کا اعادہ کیا ہے کہ حالی کی نعت گوئی کی ابتداء سولہ برس کی عمر میں ہوئی جبکہ انہوں نے قدسی کی مشہور فارسی نعت کی تضمین کی تھی۔ ساتھ ہی مقالہ نگار نے انکشاف کیا ہے کہ یہ جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) سے ایک سال قبل کی ہے اس کے دس سال بعد انہوں نے ۱۲۳ اشعار پر مشتمل مشہور قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے۔

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لئے سخن زباں کے لئے اور زباں دہاں کے لئے

یہ اسی زمین میں ہے جس میں غالب نے کہا تھا "بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے"

حالی کے یہ دونوں شاعرانہ تجربے تھے۔ ان میں وہ والہانہ پن نہیں ہے جو بعد کے کلام میں ہے۔ حالؔی کا ایک قصیدہ چھوٹی بحر میں ہے جس میں ذاتی تفاخر کے بعد اظہار پشیمانی اور پھر اس امر کا اظہار کہ لائق فخر تو ذات پاک رسول کی ہے۔ یہ حالی کی ابتدائی کاوشوں اور مابعد کی کامیاب کوششوں کے درمیاں کی کڑی ہے۔

مقالہ نگار نے مسدس حالی کو اردو کی پہلی طویل نظم قرار دیا ہے جو اپنا ایک مخصوص قومی اور ملی پس منظر رکھتی ہے۔ اس میں حالؔی نے مسلمانوں کی مذہبی، تہذیبی اور علمی زندگی کا ارتقاد کھایا ہے۔ اسلام سے قبل کی معاشرت، آغاز اسلام اور آنحضرت ﷺ کے اعلان نبوت، اصلاح معاشرت کے سلسلہ میں آپ کی مساعی جمیلہ اور اسی حوالہ سے آپ کی صفات و محاسن کا تذکرہ کیا ہے۔ مسدس کا یہ حصہ اردو نعت کے عصر جدید کا آغاز ہے (ص ۴۰۲) ممکن ہے موضوعاتی شاعری کی مخالفت کرنے والوں کی نظر میں مسدس کی ادبی اہمیت نہ ہو لیکن وہ حصہ جو ذات رسول پاک کی صفات سے متعلق ہے سادگی زبان و بیان کے باوجود موثر ہے اور اثر پذیری ہی شاعری کی جان ہوتی ہے۔ مقالہ نگار نے حالؔی کی دو معروف مناجاتوں کا بھی جائزہ لیا ہے اور اس بارے میں لکھا ہے:

> "ملکی آشوب اور ملی مصائب پر دربار رسالت مآب میں نبی اکرم ﷺ کے حضور عرضداشت و گذارش، التجاو فریاد اور استغاثہ واستمداد کا انداز فارسی نعت میں شیخ سعدی اور مولانا جامی کے ہاں ملتا ہے مگر اردو میں اس کا موثر اور بھرپور اظہار حالی کی اسی طویل نظم سے ہوتا ہے۔ حالؔی سے پہلے کی نعت میں انفرادی مسائل و مصائب کا اظہار تو عام ہے مگر کسی اجتماعی مصیبت یا آشوب کی جھلک کم ہی نظر آتی ہے۔ جذبات و تاثیر میں ڈوبی ہوئی مناجات حالؔی کے خلوص جذبات اور ملت

اسلامیہ کے بارے میں ان کی دل سوزی و دردمندی کا مرقع ہے۔

(ص ۴۰۵، ۴۰۶)

حالی کے معاصر شبلیؔ ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام پر ان کی سیرت نگاری کے اثرات غالب ہیں۔ انہوں نے نعت کا جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ رنگ تغزل کی بجائے سادگی اور حقیقت بیانی سے عبارت ہے۔ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں سے بعض واقعات کو سیدھے سادے انداز میں نظم کر دیا ہے اور یہی چند نظمیں ان کے نعتیہ کلام کے ماخذ ہیں۔ مقالہ نگار نے جن نظموں کا حوالہ دیا ہے ان میں ہجرت نبوی، تعمیر مسجد نبوی، ایک خاتون کی آزادانہ گستاخی، رسول اللہ کا حلم و عفو، اہل بیعت رسول ﷺ کی زندگی، ایثار کی اعلیٰ ترین مثالیں اور مساوات اسلام ہیں، واضح رہے کہ ڈاکٹر اشفاق نے بھی انہی نظموں کے حوالے سے وہی تبصرہ کیا ہے جو ڈاکٹر ریاض نے کیا ہے۔

مولانا احمد رضا خاں کے نعتیہ کلام کو ڈاکٹر ریاض مجید نے زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور یہ غلط بھی نہیں ہے کیونکہ مولانا کے بارے میں ان کے کلام کا مطالعہ کرنے والا جو تاثر قائم کرتا ہے وہ یہی ہے کہ مولانا بہت بڑے جید عالم ہیں ان کی علمی و ذہنی سطح بہت بلند ہے اور بقول ڈاکٹر ریاض:

"مولانا اُردو نعت کی تاریخ میں واحد شخصیت ہیں جنہوں نے اپنے وسیع مطالعے کو پوری طرح اپنی نعت میں برتا ہے۔ انہوں نے نعتیہ مضامین کے بیان میں قرآن وحدیث سے لے کر منطق و ریاضی، ہیئت و نجوم، ہندسہ و مابعد الطبیعات وغیرہ علوم و فنون کی مختلف اصطلاحات کو نہایت سلیقہ سے برتا ہے۔"

(ص ۴۰۹)

ایک عالم کے لئے ایک صاحب علم کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے اسی کے ساتھ ایک خامی کی شکایت ہے کہ مولانا کے چند قصائد علمی اصطلاحات اور اشاریت سے اتنے گراں ہو گئے ہیں کہ عام استعداد کے قاری کا ذہن اس بوجھ کو مشکل ہی سے برداشت کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر ریاض نے مولانا کی نعتوں کی دوسری خصوصیت زورِ بیان ہے اس سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے لیکن اس خیال سے اختلاف کی گنجائش ہے کہ:

"عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شاعری میں اصطلاحات اور علمی حوالوں کا بکثرت استعمال اظہار میں ابہام پیدا کر کے فن پارے کے فطری بہاؤ کو مدہم کر دیتا ہے مگر مولانا کی نعت گوئی میں اظہار ایسی کسی دقت یا مشکل سے دوچار نظر نہیں آتا۔" (ص ۴۰۹)

اور اگر اس کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ابلاغ کا مسئلہ بہر حال باقی رہتا ہے۔

مولانا کا سلامیہ قصیدہ نسبتاً آسان ہے اور نہایت مقبول ہے۔ مقالہ نگار نے طویل بحث کے بعد

مولانا کے نعتیہ کلام کی یہ خصوصیت بتلائی ہے۔

(۱) اکثر نعتیں طویل اور زور بیان کے نمونہ ہیں۔

(۲) کئی نعتیں سنگلاخ زمینوں میں ہیں۔

(۳) صنائع وبدائع کا استعمال بکثرت ہے۔

(۴) محاوروں کی کثرت ہے۔

(۵) شکوہ الفاظ وتراکیب اور صوتی ہم آہنگی ہے۔

(۶) عشق رسول اکرم ﷺ کی وارفتگی وشیفتگی بہت نمایاں ہے۔

(۷) آداب شریعت کو ملحوظ رکھا ہے۔ (ص ۴۱۵ تا ۴۱۷)

متذکرہ ابتدائی چار صفات وہی ہیں جن سے گرانباری کا احساس ہوتا ہے۔

حسن رضا خاں اپنے بھائی مولانا احمد رضا خاں کی صحبت وتربیت میں رہے اور انہیں کے انداز میں نعت گوئی کی ہے لیکن بھائی کے شاعرانہ کمال کے برخلاف کم مشکل پسندی سے کام لیا ہے۔

نظم طباطبائی کی نعت گوئی کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید نے ان کے ساتوں قصائد کا ذکر کیا ہے اور انہیں کے حوالہ سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ان قصائد کے عنوانات اور موضوعات گنوادیے ہیں۔ڈاکٹر اشفاق نے نظم کے بارے میں اپنے مطالعہ پر انحصار کرتے ہوئے خوبیاں گنوائی ہیں اور ان کے کلام کو بھی ایک عالم کا کلام قرار دیا ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے انداز میں ان قصائد کا جائزہ لیا ہے اور نہ صرف ان خصوصیات کو بیان کیا ہے جو ڈاکٹر اشفاق بیان کر چکے تھے بلکہ ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر محمود الہی کے تاثرات سے تائید حاصل کی ہے۔

ڈاکٹر ریاض نے اقبال کی نعتیہ شاعری پر تبصرہ کیا ہے اور کہا ہے کہ :

> "وہ رسمی معنوں میں نعت گو شاعر نہ تھے انہوں نے براہ راست بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر نعت لکھی مگر متفرق منظومات کے حوالوں سے اتنے نعتیہ شعر ضرور کہے ہیں کہ اردو نعت کی تاریخ میں ان کا ذکر ناگزیر اور اہم ہو گیا ہے۔ نعتیہ کلام میں مقدار کی کمی کے باوجود ان کے ہاں فکری اور فنی ہر دو اعتبار سے اعلیٰ ومعیاری نعت کے نمونے ملتے ہیں۔" (ص ۴۲۶)

اقبال کے اردو کلام میں نعت بالواسطہ طور پر آئی ہے اور بقول ممتاز حسن یہ صفت اقبال کو دیگر نعت گویوں سے ممتاز کرتی ہے (ص ۴۲۸) مقالہ نگار نے کلام اقبال کا طویل اور تفصیلی جائزہ لیا ہے (ص ۴۲۶ تا ۴۳۵) اور ہر پہلو کو نظر میں رکھا ہے جبکہ اپنی بحث کو اردو کلام تک محدود رکھا ہے غیر ضروری طور پر فارسی کو در آنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

مولانا ظفر علی خاں بھی حالی اور اقبال کی طرح ملی اور قومی لہر کے شاعر ہیں لیکن ان کا انداز منفرد ہے۔ ان کے ہاں ہندی مسلمانوں کی کسمپرسی، عالم اسلام کی زبوں حالی، طرابلس پر اٹلی کا حملہ، تحریک خلافت، تحریک عدم تعاون، تحریک ہجرت، شدھی اور سنگٹھن تحریک، مسلم کش فسادات جیسے موضوعات کے حوالے سے آنحضرت ﷺ کی یاد نظر آتی ہے۔ حالی اور اقبال نے عمومی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ ظفر علی خان خاص واقعات اور خاص حالات کے حوالہ سے شعر کہتے ہیں ان کے کلام کا قابل لحاظ حصہ التجا اور التماس پر منحصر ہے۔ مقالہ نگار نے ان ہی نکات کی وضاحتیں کی ہیں۔ (ص ۴۳۵ تا ۴۴۲)

اس باب کے ایک اہم شاعر حفیظ جالندھری ہیں جو خاص طور پر "شاہنامہ اسلام" کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس حوالہ سے مقالہ نگار نے "ان کی نعت کا دائرہ نہ صرف سیرت رسول اکرم ﷺ بلکہ پوری تاریخ اسلام پر محیط ہے۔" (ص ۴۴۳) قرار دیا ہے۔ اس کا کینوس اس نوع کی نظموں کی نسبت بہت وسیع ہے اس میں عہد رسالت کے حالات و فتوحات کی تاریخ کے پس منظر میں حضور اکرم ﷺ کی سیرت کا بیان ہے۔ اس میں ایسی روایات سے پرہیز کیا گیا ہے جو مستند نہیں ہیں لیکن عام کتابوں میں بیان کی جاتی ہیں۔ مقالہ نگار نے شاہنامہ اسلام کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پورے کا پورا شاہنامہ ہی دائرہ نعت میں آجاتا ہے کہ اس میں عہد رسالت مآب ﷺ کی معاشرتی و تمدنی جھلکیوں کے پس منظر میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت مبارک، پرورش، اعلان نبوت، ہجرت، غزوہ بدر، احد اور سیرت طیبہ کے اہم واقعات کا بیان ہے۔ بعض مقامات ایسے ہیں جو خالص نعت کی ذیل میں آتے ہیں اور جن میں شاہنامہ کے تاریخی پہلو پر اوصاف محمدی کا بیان غالب آجاتا ہے۔ اس میں سب سے معروف اشعار وہ ہیں جو ولادت رسول اکرم ﷺ کے موقع پر سلام کی شکل میں ہیں۔ اس کا عام فہم اور پر خلوص انداز اس کی مقبولیت کی وجوہ ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق کی نسبت ڈاکٹر ریاض نے بہتر تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور ڈاکٹر اشفاق کے بیان کردہ اہم نکات ہی کو بہتر وضاحت سے پیش کیا ہے البتہ ڈاکٹر ریاض نے حفیظ کی ان غنائی نظموں کا حوالہ بھی دیا ہے جو بہت مقبول ہوئیں۔ حفیظ گیت کے شاعر تھے اس لئے شاہنامہ سے ہٹ کر بھی گیت کی لے میں نعت کا بھی سلیقہ رکھتے تھے۔

اکبر وارثی نعت گو بھی تھے اور نعت خواں بھی۔ وہ مجالس میلاد کے مزاج کو سمجھتے اور لوگوں کو متاثر کرنے کے ہنر کو جانتے تھے ان کے نعتیہ کلام اور سلام مقبول عام رہے ہیں وہ شہر شہر گھوم کر اپنا کلام سناتے۔ اس سے لوگوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اب بھی ان کا لکھا ہوا ایک سلام زبان زد خاص و عام ہے جبکہ اکثر لوگ بالخصوص خواتین اس کو پڑھتی ہیں۔ ان کا مقبول سلام ہے۔

یا نبی سلام علیک، یہ رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک، صلوات اللہ علیک

مقالہ نگار نے میر اعظم علی خان شائقؔ (ص ۴۵۱ تا ۴۵۳) سید محمد مرتضیٰ بیاں یزدانی (ص ۴۵۴)، منشی محمد شمس الدین امیر حمزہ (ص ۴۵۷، ۴۵۸)، ممتاز جہاں گنگوہی (ص ۴۵۷)، اور عبدالقدیر حسرت (ص ۴۵۹) کو بھی اس دور میں شامل کیا ہے۔ ان شعراء کے کلام کا ایک حصہ وہ ہے جو سلامت روی کے ساتھ عقیدت کے پھول نچھاور کرتا ہے تو ساتھ ان کے ہاں ایسا کلام بھی ملتا ہے جو سوء ادب کے ضمن میں آتا ہے۔ ان میں عشق مجاز کا رنگ غالب ہے اور طرز تخاطب عامیانہ ___ ہمارے نقاد رواداری میں ان کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن حسن و قبح کی حضور کے مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے نشاندہی نہیں کرتے۔

ان کے علاوہ مظفر علی معلیٰ، اور جلیل مانک پوری کے کلام میں مختصر تبصرے ہیں جو ڈاکٹر اشفاق کی کتاب میں بھی شامل ہیں۔ علماء و صوفیاء کی نعتیہ شاعری کی ذیلی سرخی میں مفتی غلام سرور لاہوری (ص ۴۶۳)، صحو ابو العلائی (ص ۴۶۳، ۴۶۴)، مفتی دیدار علی شاہ (ص ۴۶۴)، سید افضل شاہ طوفان (ص ۴۶۵)، حکیم سید غوث علی شاہ (ص ۴۶۶)، بیدم وارثی (ص ۴۶۷، ۴۶۸)، مولانا الیاس برنی (ص ۴۶۹، ۴۷۰) پر مختصر تبصروں کے ساتھ گذر جاتے ہیں یہ حصہ تعارفی نوعیت کا ہے اور احساس دلاتا ہے کہ یہاں پہنچتے پہنچتے مقالہ نگار کا قلم تھک گیا تھا۔

عصر جدید کے دورِ آخر میں اقبال سہیل پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ اقبال سہیل شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف نہیں۔ ان کا نعتیہ کلام اعلیٰ پایہ کا ہے ڈاکٹر اشفاق بھی ان کے مداحوں میں ہیں۔ ڈاکٹر ریاض نے بھی ان کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ ڈاکٹر ریاض، اقبال سہیل کی نعت کو صوری و معنوی خوبیوں کے سبب انہیں عصر جدید کے نمائندہ نعت گو مانتے ہیں۔ ان کی خصوصیات یہ بتلائی ہیں۔

(۱) جوش عقیدت اور خلوص جذبات (۲) تاریخ اسلام کے صحیح اور موثر واقعات کی تلمیح اور شاعرانہ پیرایہ میں مستند احادیث و روایات کا ترجمہ یا ان کی تفسیر۔ (۳) توحید اور رسالت کا صحیح اسلامی تصور (۴) جناب رسالت مآب علیہ السلام کے فضل و شرف کا اس طرح ذکر کہ دوسرے انبیاء کی عظمت میں فرق نہ آئے۔ (۵) عشقیہ غزل کے ان عوامل سے اجتناب جو حضور علیہ السلام کی شان کے خلاف ہیں۔ (۶) سیرت پاک پر اس طرح اظہار خیال کہ اسلامی نظریات کی مکمل توضیح بھی ہو جائے۔ (۷) بزم رسالت کے ارکان خاص کے درجہ و مرتبہ کا صحیح تعین۔ (۸) نعت و منقبت میں فلسفہ، حکمت کے بہت سے رازہائے سربستہ کی عقد کشائی۔ (۹) شاعرانہ محاسن کی آمیزش، متوازن انداز میں۔ (۱۰) تخیل اور حقیقت میں کامل ہم آہنگی۔

اس حصہ کے سب سے اہم شاعر امجد حیدر آبادی ہیں۔ ان کی زندگی قال اللہ و قال رسول میں ہی نہیں گزری بلکہ وہ انہیں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی گذارتے تھے۔ ان کا سارا کلام تصوف، معرفت اور نعت پر مشتمل ہے۔ وہ اردو کے ممتاز رباعی گو ہیں اور اس صنف میں بھی اپنے محبوب موضوعات پر دل

نشین انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ بارگاہِ رسالت میں امجد کی عرضداشت اور استغاثہ کا انداز بھی دلآویز ہے۔ مقالہ نگار نے ان کی تعریف میں بھی انصاف سے کام لیا ہے۔

چھٹے اور آخری باب کی ابتداء اس امر کے اعلان سے کی ہے کہ جو نقوش حالی سے اقبال سہیل تک واضح ہوئے اور اقبال سہیل نے جن کو درجہ کمال پر پہنچایا وہی عصر جدید کے نعت گو شعراء کے لئے روشن چراغ ثابت ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ عصر حاضر کی نعت گوئی کی بنیادیں عصر جدید ہی نے فراہم کی ہیں۔ عصر جدید موجودہ صدی کی آخری چھ سات دہائیوں پر محیط ہے اس میں مولانا حسرت موہانی، اختر شیرانی، ضیاء القادری، بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، شمس مینائی، ورد کاکوروی، محمد ذکی کیفی، میر افق کاظمی، راجہ محمد عبداللہ نیاز، اثر صہبائی اور اسد ملتانی کو عصر جدید کے حصہ اول میں شامل کیا ہے۔ دوسرے حصہ کا آغاز عبدالعزیز خالد سے کیا ہے۔ متذکرہ شعراء پر مختصر مگر یہ جامع تبصرے بھی کئے ہیں۔

• ہمارے سامنے بیک وقت ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید کے مقالے رہے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر اشفاق سے گہرا اثر قبول کیا اور ہمیں احساس ہوا کہ انتہائی محنت، دیدہ ریزی سے نعتوں کا مطالعہ کر کے قوت فیصلہ کو بروئے کار لاکر نہایت مناسب انداز میں تبصرے کر کے گویا تحقیق و تنقید کا حق انہوں نے ادا کر دیا ہے اور جب ڈاکٹر ریاض مجید کے مقالہ کا مطالعہ کیا تو واضح طور پر احساس ہوا کہ ان کو مشکل ترین مرحلے سے گزرنا پڑا ہوگا۔ ایک جامع تحقیق اور مناسب تبصروں کے مقالہ کے بعد مقابلے پر آنا کوئی کھیل نہ تھا۔ نقش ثانی کو نقش اول بنانے کے لئے انہوں نے بے انتہا محنت کی ہے۔ دماغ سوزی سے کام لیا ہے اپنی ساری متاعِ علم یکجا کر کے ان سے پورا پورا عالمانہ کام لینے کی سعی کی ہے۔ انہوں نے موضوع کے ہر پہلو میں نئے پہلو تلاش کئے، ہر بحث کو آگے بڑھانے اور وسیع تر کرنے کے لئے نئے نئے نکات نکالے چنانچہ ڈاکٹر ریاض مجید کی کتاب کے تمہیدی ابواب بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں۔ نعت نگاروں کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے نعتوں کا غائر مطالعہ کیا ہے باریک بینی سے اوصاف بیان کئے پورے مقالہ میں چند ہی مقامات ایسے ہیں جہاں انہوں نے اپنی رائے قلمبند کرنے کے جائے کسی کے فرمودہ پر انحصار کیا ہے یہ صورت بھی آخری حصے میں ہے جہاں ان کے قلم پر تھکن طاری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

ان دو مقالوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ابتداء سے لے کر موجودہ صدی کے ربع آخر تک کی نعت گوئی کا کوئی پہلو یا کوئی دور تشنہ نہیں رہا۔ ان دونوں مقالہ نگاروں نے حد درجہ محنت سے کام لیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے بعد کے لکھنے والوں کے لئے راہ مسدود کر دی ہے۔ اس راہ پر وہی قدم رکھنے کی جسارت کر سکتا ہے جو کسی اعتبار سے بھی ان میں اضافہ کرنے کا اہل ہو اور جو کتاب یا مقالہ ۱۹۷۶ء کے بعد شائع ہوا ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نکتہ پر خاص نظر رکھنی ہوگی کہ ان دونوں مقالوں کی نسبت کس حد تک اضافہ ہوا ہے۔

"اردو شاعری میں نعت گوئی" از ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی

یہ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا پی ایچ۔ڈی کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے اس امر کی اطلاع ہمیں کتاب میں شامل "حرف آغاز" سے ملی ہے لیکن مقالہ نگار نے یہ نہیں بتلایا کہ کس جامعہ نے کس سال ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی۔ ہماری معلومات کے مطابق رانچی یونیورسٹی (صوبہ بہار) نے ڈگری دی ہے۔ جہاں تک اس موضوع پر سابقہ مطبوعات کا تعلق ہے کتابیات سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر طلحہ رضوی برق اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصانیف سے انہوں نے استفادہ کیا ہے جن کے بارے میں ہم رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ یہ قدرے طویل مضامین ہیں جو موضوع کا مکمل احاطہ کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اگر مقالہ نگار ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید کے مقالوں کا مطالعہ کر لیتے تو شاید افادہ کی بہتر صورت نکلتی لیکن مقالہ نگار کا رویہ بتلاتا ہے کہ وہ دوسروں کی آراء سے مطمئن نہیں ہوتے اور دوسروں کے زیر اثر رائے قائم نہیں کرتے کیونکہ "حرف آغاز" میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> "میری ایک آسانی یہ تھی کہ میرے محترم نگراں نے مجھے کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ میں اپنی راہ خود ہموار کروں چنانچہ میں نے کسی بحث کی گنجائش اور بغیر کسی خارجی دباؤ کے اپنی راہیں خود بنائیں۔ اپنے مخصوص ادبی زاویے اور فنی و شعری رویے کے تحت موضوع کا مطالعہ اور تجزیہ کرتا رہا۔ اس طرح میں کہہ سکتا ہوں اور بڑے اعتماد کے ساتھ کہ میرے اندر جتنی کچھ تنقیدی صلاحیت تھی میں نے بروئے کار لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔" (ص ۴)

یہی وجہ ہے کہ کتابیات بے حد مختصر ہے ان میں سے اکثر کتابیں ایسی ہیں جن سے مشکل دو چار سطروں کی مدد مل سکی ہوگی۔ مقالہ بھی زیادہ طویل نہیں ہے جلی حروف میں دو سو صفحات سے کم پر پھیلا ہوا ہے۔ دوسرے حصے میں نعتیہ غزلوں کا انتخاب ہے جو پچاس صفحات پر محیط ہے۔

مقالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے باب اول، دوم، سوم تمہیدی مباحث اور عربی و فارسی نعت سے متعلق ہیں جبکہ چوتھا باب (۹۷ تا ۱۴۳) اصل موضوع "اردو شاعری میں نعت گوئی کا ارتقاء" ہے۔ مقالہ نگار نے بات تو "ارتقاء" کی کی ہے جس کا اظہار عہد بہ عہد تبدیلیوں اور نشوونما و ترقی سے ہو سکتا تھا لیکن مقالہ نگار نے اصناف سخن کے لحاظ سے مطالعہ نعت کیا ہے یعنی اس باب میں (الف) قصیدہ میں نعت (ب) مثنوی میں نعت (ج) نظم میں نعت (د) نظم آزاد میں نعت (ہ) غزل میں نعت جیسے عنوانات ہیں۔

پہلے باب میں (۱) نعت کے فن (۲) نعت کی دینی حیثیت اور اہمیت سے بحث کی گئی ہے۔ ان دونوں عنوانات پر متعدد اہل علم نے لکھا ہے ان میں مقالہ نگار نے کوئی خاص اضافہ نہیں کیا ہے البتہ بعض

پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے قرآن اور احادیث کے حوالوں سے کام لیا ہے۔

باب دوم، سوم مقالہ کے عنوان سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لیکن یہ روایت بن گئی ہے کہ کسی بھی صنف ادب پر اظہار خیال کرنا مطلوب ہو تو آغاز عربی اور پھر فارسی سے کیا جاتا ہے اگر اس پس منظر کو ضروری بھی سمجھا جائے تو اس کی اہمیت ثانوی رکھنی چاہئے۔ ان عنوانات پر اختصار سے اظہار کیا جائے ہر ایک کو باب بنا دینا صرف ضخامت بڑھانا ہے موضوع سے انصاف نہیں ہے۔ اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہوتی کہ عربی اور فارسی کے اردو نعت پر اثرات کی نشاندہی کی جاتی عام طور پر ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

"اردو میں نعت گوئی کا ارتقاء" مقالہ کا اصل موضوع ہے اس میں بھی تمہیدی مباحث شامل ہیں جیسے نعت گوئی کے محرکات، نعت گوئی کی مقبولیت و وسعت کے اسباب وغیرہ۔

"قصیدہ میں نعت" کا آغاز ص ۱۰۳ سے ہوا ہے اس میں قصیدہ کی مختلف تعریفیں ہیں۔ پھر قصیدہ کی ہیت سمجھائی گئی ہے کہ اسکے پہلے شعر میں دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں (ص ۱۰۳) اس کے اجزائے ترکیبی (۱) تشبیب (ص ۱۰۴، ۱۰۵) (۲) گریز (ص ۱۰۵) (۳) مدح (ص ۱۰۵) (۴) دعا (ص ۱۰۶) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مڈل اسکول کی کلاس کی نصابی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو قصیدے کی تاریخ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے نام سے شروع کی گئی ہے ان کے کسی قصیدے کے اشعار کا حوالہ تو بڑی بات ہے اختصار اس قدر ملحوظ رکھا گیا ہے کسی قصیدے کا عنوان تک نہیں لکھا گیا محمد قلی قطب شاہ سے سوداؔ تک قصیدے کا ارتقا ایک جملہ میں آگیا ہے۔

"سوداؔ کے زمانہ تک اردو میں اچھے خاصے قصیدے کہے جا چکے تھے۔" (ص ۱۰۷) سلسلہ کلام میں قصیدہ گو شعراء کے نام گنوا دیئے گئے ہیں اور نعتیہ قصیدہ کا آغاز ولی دکنی سے شمار کیا ہے ان کے بعد سودا، سودا کے بعد مومن اور پھر میر تجلی دہلوی، راسخ عظیم آبادی اور ناسخ لکھنوی، ان کے بعد کرامت علی شہیدی کا ذکر ہے جبکہ شہیدی وہ خوش نصیب شاعر جن کے بارے میں مقالہ نگار کو ایک صفحہ لکھنے کی توفیق ہوئی۔ غلام امام شہید کی قسمت میں نصف صفحہ آیا یہی انداز پورے باب میں نظر آتا ہے۔ شاعر کا نام دو چار تعارفی جملے دو چار اشعار بطور نمونہ ____ ! کہیں کوئی تبصرہ ایسا نہیں جس میں علمی وقار کی جھلک ہو اردو قصیدے میں نعت صفحہ ۱۰۳ سے ۱۲۰ صفحات تک ہے گویا مقالہ نگار نے ۱۷ صفحات میں سب کو نمٹا دیا ہے۔ انتخاب نعتیہ قصائد (ص ۱۲۲ تا ۱۳۵) قصیدہ کے ارتقاء اور قصائد کے انتخاب میں توازن ہے یعنی دونوں کے صفحات قریب قریب برابر ہیں۔

اس باب کے دوسرے حصے میں مثنوی میں نعت گوئی موضوع ہے جو صفحہ ۱۳۶ سے ۱۴۸ تک جملہ ۱۲ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ ۸ صفحات میں مثنویوں سے منتخب نعتیہ اشعار ہیں۔ دکنی زبان کے مثنوی

نگار شعراء میں جتنے نام یاد تھے درج کر دیئے گئے ہیں خصوصیات کلام سے کوئی بحث نہیں۔ ان ناموں میں ولی اورنگ آبادی اور

"ولی کے جانشین سراج اورنگ آبادی نے بھی "چھ سات" کامیاب مثنویاں لکھی ہیں یہ سب کی سب متصوفیانہ ہیں۔" (ص ۱۴۳)

تحقیق کا یہ انداز لائق غور ہے کہ مقالہ نگار سراج کی مثنویوں کی تعداد کا تعین کرنے سے بھی قاصر ہے۔ پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ میں اندازاً تخمینہ کا رواج پہلی بار دیکھا۔

"نظم جدید میں نعت" اسی سلسلہ کی کڑی ہے مقالہ نگار نے "نظم جدید" کی تعریف یوں کی ہے:

"نظم جدید ایسی نظمیں ہیں جن میں ہیئت کے اعتبار سے کسی صنف یا اسلوب کی تقلید کی گئی ہو۔ علاوہ ازیں ایسی نظمیں جن میں مصرعوں، بندوں اور قوافی کی ترتیب کا ایک نیا اور اچھوتا التزام ہو یعنی ہیئت کے اعتبار سے کلاسیکی نظم سے مختلف ہوں لیکن جن میں اوزان اور قوافی کے مروجہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو۔" (ص ۱۵۸)

اردو نظم کے معماروں میں بلا تخصیص نظیر اکبر آبادی، حالی اور محمد حسین آزاد سے تصدق حسین خالد اور ڈاکٹر تاثیر تک سب شامل ہیں۔ یہ حصہ چودہ صفحات پر مشتمل ہے (ص ۱۵۷ تا ۱۷۲) اور انتخاب جدید نظم ۱۶ صفحات پر محیط ہے۔ (ص ۱۷۳ تا ۱۸۹)

نظم آزاد میں نعت کے زیر عنوان پہلے تو آزاد نظم کی تعریف سات صفحات میں کی ہے جس میں مغربی خیالات کی ترجمانی کے بعد نظم آزاد میں نعتیہ تجربے کرنے والوں کی فہرست درج کر دی ہے۔ (ص ۱۵۶) ان میں مختار صدیقی عبدالعزیز خالد، قیوم نظر، امین راحت چغتائی، عارف عبدالمتین، جیلانی کامران، ادا جعفری، نعیم صدیقی، ظہور نظر، اطہر نفیس، محسن احسان، امجد اسلام امجد، قمر ہاشمی، رشید قیصرانی، پروین شاکر، صائمہ خیری، ناہید قاسمی، تحسین فراقی، جعفر بلوچ اور الطاف قریشی کے نام دئے گئے ہیں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ ان میں کتنے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے رسمایا نعتیہ مشاعروں یا ٹیلی ویژن پروگراموں میں رونمائی کے لئے نعتیں لکھی ہیں اور ان کے کلام کی تعداد اور کیفیت ان کے نام کا حوالہ بنتی ہے یا نہیں۔ ہم نے صفحات ماقبل میں بھی لکھا ہے کہ نعت گو شعراء میں صرف ان کو شامل کرنا چاہیے جن کے کلام کا غالب حصہ نعتوں پر مشتمل ہو لیکن اس فرق کو ملحوظ رکھنے کی زحمت پی ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ نگار کہاں اٹھا سکتے ہیں۔ متذکرہ شاعروں میں عبدالعزیز خالد اپنی انفرادی شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ مقالہ نگار نے ان کے مقام شناس ہونے کا ثبوت دیا ہے اور ان کی طویل نظم "ماذ ماذ" کا موضوعاتی جائزہ تو کیا ہے فنی

جائزے سے گریز کیا ہے۔ اطہر نفیس کی آزاد نظم کے چھ ٹکڑوں کو ان کی شاعرانہ عظمت کی گواہی کے طور پر پیش کیا ہے اور رشید قیصرانی کی نظم کے طویل اقتباسات ایک دو جملوں کی پیوندکاری کے ساتھ درج کر دیئے ہیں یہی کیفیت صلاح الدین پرویز کے بیان کی ہے۔ گویا دی گئی فہرست میں سے یہی حضرات توضیح، تشریح و توصیف کے حقدار تھے۔ باب کا یہ حصہ بیس صفحات پر مشتمل ہے آزاد نظم میں کہی گئی نعت کے ۱۵ صفحات پر پھیلے ہوئے نمونے اس حصے کی تکمیل کرتے ہیں۔

اردو میں زیادہ تر نعتیں غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہیں۔ مقالہ نگار کی نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہی انہوں نے "غزل میں نعت" کے موضوع پر گراں قدر خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کو سب سے آخر میں رکھا ہے اس حصہ میں معروف صنف سخن کے بارے میں بنیادی فنی معلومات چھ صفحات میں بیان کی ہیں جن سے میٹرک کے طالب علم بھی واقف ہوتے ہیں۔ پھر چند صفحات پر اردو غزل کے ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے نعتیہ غزلوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔ نعتیہ غزلوں کے حوالے سے ان تمام شاعروں کے نام وجود ہیں جن کی خصوصیات کلام پر ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید نے کئی کئی صفحات میں تبصرے کئے ہیں۔ ڈاکٹر عثمانی نے ہر ایک کو چند سطروں میں نمٹا دیا ہے۔ یہ حصہ خاصہ طویل ہے جو ۲۴ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں ضمنی طور پر غیر مسلم نعت گو شعراء کو شامل کر لیا ہے جن میں کوثری، کشن پرشاد شاؔد، پیارے لال رونق، ہری چند اختر، جگن ناتھ آزاد، مہندر سنگھ بیدی سحر، کے نام ملتے ہیں اور ہر اک پر دو چار سطروں سے رہنمائی فرمائی گئی ہے جبکہ کچھی نرائن شفیق، راجیشور راؤ اصغر، چندو لال شادان، جگ دیش مہتہ درد، فراق گورکھ پوری، تلوک چند محروم، رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم، برج نرائن چکبست، دیا شنکر کم، لال چند فلک، آنند نرائن، گوپال متل، نریش کمار شاؔد، مہاراجہ بہادر برق، گرسرن لال دیپ لکھنوی، سالک رام سالک، کالی داس گپتا کو صرف نام دے کر ٹرخا دیا گیا ہے ممکن ہے مقالہ نگار نے ان کے کلام کی جستجو کو وقت کا زیاں سمجھا ہو۔

۲۴ صفحات کے اس حصہ کے تکملہ کے طور پر ۴۲ صفحات پر مشتمل انتخاب نعتیہ غزلیات کا بھی ہے۔ چاہے مقالہ نگار کو مقالہ لکھنے کی داد نہ دی جائے لیکن انہوں نے ہر حصے میں انتخاب نعت کے لئے جو "محنت" کی ہے اس کی داد ضرور دینی چاہیے۔

آخری باب مقالہ کا سب سے اہم عنوان ہے "اردو نعت کی ادبی و شعری قدر و قیمت" اس میں بھی "شاعر" کے بارے میں بہت کچھ ہے "اردو شاعری" کے بارے میں کم اور نعتیہ شاعری کے بارے میں بالکل ہی کم ہے۔

پی ایچ۔ ڈی کے مقالوں کے بارے میں ہم نے بار بار جس "بدگمانی" کا اظہار کیا ہے اس میں ڈاکٹر

شاہ رشاد عثمانی کا مقالہ پڑھ کر ایسا "استحکام" آگیا ہے کہ مدتوں اس کے دور ہونے کا امکان نہیں۔ بلحاظ دریافت وبازیافت مواد ہو یا بلحاظ تجزیہ و تبصرہ و تنقید ہو یہ مقالہ کوئی مثبت تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہوا

۔۶

"اردو شاعری میں نعت" از ڈاکٹر اسمٰعیل آزاد فتح پوری

"اردو شاعری میں نعت" پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ پی ایچ ڈی کے لئے تین مقالے بھارت میں اور ایک پاکستان میں لکھا گیا۔ اگر میں عرض کروں کہ پاکستان میں لکھا گیا مقالہ بھارت کے تینوں مقالوں پر بھاری ہے تو اس میں نہ تو جانبداری ہے اور نہ تعصب۔ یہ ایک طالب علمانہ تخمینہ Assessment ہے۔ افسوس کہ ڈاکٹر آزاد فتح پوری کو پاکستان میں لکھا گیا مقالہ دستیاب نہ ہو سکا۔ ان کی تحقیق و جستجو کا یہ حال ہے کہ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا مقالہ بھی نہ دیکھ سکے جو ان کی کتاب سے دو سال قبل شائع ہو چکا تھا۔ مقالہ نگار کو اس مقالہ میں چند باتیں پیش کرنے پر ناز ہے۔

(۱) "اس امر کا انکشاف کیا گیا ہے کہ اردو کے پہلے شاعر شمالی ہند کے رائے بریلی ضلع میں واقع ڈلمؤ کے رہنے والے ملا داؤد ہیں اور یہی اردو کے پہلے نعت گو بھی ہیں جنہوں نے مثنوی چندائن میں ایک بند نعت کا لکھا ہے۔" (ص ۱۴)

(۲) "مذکورہ السبق مطبوعات (اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر طلحہ رضوی برق، اردو کی نعتیہ شاعری از ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور اردو میں نعتیہ شاعری از ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق) میں اصناف سخن کا تنقیدی تجزیہ نہیں کیا گیا اور نعت کے بہت سے گوشے رہ گئے۔" (ص ۱۳)

(۳) "ایسے شعراء کی نشاندہی کی گئی ہے جنہوں نے نعت کے میدان میں قابل ذکر کارنامے سرانجام دیئے ہیں لیکن اردو زبان وادب کے تذکروں اور تاریخوں میں ان کے نام تک محفوظ نہیں۔" (ص ۱۵)

(۴) "تحقیق کی گئی ہے کہ مقدس ویدوں میں سے رگ وید اور اتھروید میں نعت سے متعلق کئی منتر ملتے ہیں۔" (ص ۱۷)

(۵) "نعت کے کس مضمون کے بیان کے کس شاعر کو اولیت کا فخر حاصل ہے۔" (ص ۱۷)

(۶) "اردو نعت میں ہندوستانی صنمیات کے اثرات سے بھی بحث کی گئی ہے۔" (ص ۱۷)

پہلی بات کے حوالے سے گذارش یہ ہے کہ اس قسم کے دعوے نہایت احتیاط کے متقاضی ہیں۔ صفحات ماقبل میں بھی اظہار کیا گیا کہ تقدم کے جو دعوے پہلے کئے گئے ان میں سے بعض باطل ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر تحریر کیا گیا تھا کہ "معراج العاشقین" کی تصنیف کا سہرا خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے سر تھا۔ مولوی عبدالحق اور نصیر الدین ہاشمی کے مفروضات کی اس عمارت کو استاذی محترم ڈاکٹر حفیظ قتیل نے شواہد اور دلائل کے ساتھ ڈھا دیا ہے۔ اردو میں تحقیق کا سائنٹیفک طریقہ رائج ہی نہیں ہے دعوے ہوتے ہیں اور مٹتے ہیں اسلئے احتیاط ضروری ہے۔ احتیاط کی مثال ڈاکٹر جمیل جالبی نے قائم کی ہے "کدم راؤ پدم راؤ" مرتب کرنے کے بعد اس کے تقدم کا قطعی دعویٰ نہیں کیا بلکہ لکھا تو یہ لکھا:

"جب تک کوئی اور تصنیف سامنے نہ آجائے اولیت کے تخت سلطنت پر کدم راؤ پدم راؤ کی حکمرانی رہے گی۔"

اس طرح کے محتاط رویے سے محقق کی قدر گھٹتی نہیں ہے بڑھتی ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری گذارش یہ ہے کہ نہ تو کنی قدیم اردو ہے جس کے نمونے خواجہ بندہ نواز سے منسوب کلام میں بتلائے جاتے ہیں نہ اودھی کا وہ ادب جسے ملا داؤد نے "ہندکی" کہا ہے اردو ہے نہ "کدم راؤ پدم راؤ" جس پر غالب عناصر سنسکرت کے ہیں قدیم اردو ہے۔ دراصل وسیع و عریض برصغیر میں جدید زبانوں کی نشوونما کا آغاز ایک ہی زمانہ میں ہوا۔ ان میں سے بعض بولی کی حد تک رہیں زبان بنانے کی سعی ہوئی لیکن مقامی لسانی مسابقت کے بعد چند زندہ اور باقی رہیں چند فراموش رہ گئیں۔ زندہ رہنے والی جدید زبانوں میں اردو، ہندی، دکنی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی، کوکنی اور ایسی ہی بے شمار زبانیں ہیں۔ پھر ان میں آپس میں میل سے وقت کے ساتھ ردوبدل ہوتا رہا۔ پرانی اردو نئی اردو میں بدلی، پرانی دکنی جدید دکنی کے طور پر بیسویں صدی کے اختتام پر بھی زندہ ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہے۔ ہم نے یہ رویہ اختیار کر لیا ہے کہ جو مخطوطات عربی اور فارسی رسم الخط میں ہیں ان پر اردو ہونے کی مہر ثبت کر دیتے ہیں۔ ملا داؤد کی زبان اردو نہیں اودھی کی پرانی شکل ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ اردو کی تصنیف نہیں قدیم سنسکرت کی شکل ہے۔ زبان کے رشتے صرف ونحو، اصوات، ذخیرہ الفاظ سے متعین ہوتے ہیں رسم الخط سے نہیں۔ بہر حال اگر محقق کو اصرار ہے تو ہم اردو کی عمر آٹھویں صدی ہجری تک بڑھانے پر تیار ہیں اگر اس کو ماننے نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

دعوے نمبر ۲ کے بارے میں گذارش ہے کہ ڈاکٹر طلحہ اور ڈاکٹر فرمان کی کتابوں پر اعتراض کسی حد تک جواز رکھتا ہے لیکن یہ کہنا کہ ڈاکٹر اشفاق نے نعت یا اصناف نعت کا تنقیدی تجزیہ نہیں کیا ہے لاعلمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ نعت کے جو گوشے تشنہ رہ گئے تھے اور ڈاکٹر آزاد نے جن کی تشنگی دور کی ہے اس کی شہادت "حرف آغاز" سے "حرف آخر" تک کہیں نہیں ہے۔

دعویٰ نمبر ۳ کے بارے میں بھی وہی گذارش ہے جو دعویٰ نمبر ۲ کے حوالہ سے کی گئی ہے۔

دعویٰ نمبر ۴ کے بارے میں عرض ہے کہ مقالہ نگار نے دو "مقدس ویدوں" کے حوالہ سے حضور ﷺ کی بشارت اور نعت کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید نے تو قرآن و حدیث کے علاوہ تورات، زبور اور انجیل کے علاوہ ویدوں کے حوالہ سے دوسرے باب کا ایک حصہ (ص ۱۱۰ تا ۱۱۹) رقم کیا ہے جو معلومات کے لحاظ سے ڈاکٹر آزاد کی فراہم کردہ معلومات سے کئی گنا زیادہ ہے اس سے موضوع ہی کی نہیں جامعیت کی اولیت بھی ڈاکٹر ریاض کے حصے میں آتی ہے۔

دعویٰ نمبر ۵ یہ تحقیق نہیں کارِ طفلاں ہے۔

دعویٰ نمبر ۶ موضوع نیا نہیں ہے ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض نے نہایت مختاط انداز میں صنمیات اور ہندو روایات کے نعت پر اثرات کی نشاندہی پہلے ہی کر دی ہے۔ ڈاکٹر آزاد نے موضوع میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر آزاد کا مقالہ سات ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب کا عنوان "اردو میں نعت گوئی کا آغاز" ہے۔ اس باب میں ہند و عرب کے روابط مذہب اسلام کے آغاز سے پیشتر تلاش کیے گئے ہیں کیا عنوان اور اس کے تحت موضوع میں کوئی مطابقت ہے؟ مقالہ نگار کے لئے ضروری نہ تھا کہ اپنی معلومات کا اس طرح غیر متعلقہ طور پر اظہار کرتے۔

مقالہ نگار کو اس اظہار پر فخر ہے کہ ملا داؤد کی تصنیف اردو کی پہلی تصنیف ہے اس کا ثبوت پیش کرنے کے لئے انہوں نے کہیں کہیں اشعار کا حوالہ دیا ہے۔ قدیم دکنی کی طرح یہ بھی آج کے لئے اجنبی ہے اور دو ایک الفاظ کی قدیم شکل کے سوا اس میں اردو نہیں ملتی۔ مقالہ نگار نے ملا داؤد کے شعر کے حوالہ سے اعتراف کیا ہے:

> "مخطوطات کے عنوانات فارسی زبان میں اور ہر عنوان کے "ذیلی ابیات" اردو زبان میں ہیں جس کو اس وقت "ہندکی" کہا جاتا تھا۔" (ص ۴۱)

جب شاعر اپنی زبان کو "ہندکی" کہہ رہا ہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ اس کے برخلاف فیصلہ دیں۔

پہلے باب میں دکنی شعراء کے صرف نام گنائے گئے ہیں (ص ۴۰ تا ۶۶) اور اگلے ابواب میں ان کے بارے میں تفصیل ہے۔ مقالہ نگار کو جب ان شعراء کے بارے میں تفصیلی مباحث سے گزرنا ہی تھا تو اس "اسم شماری" کی زحمت کیوں گوارا کرنی پڑی؟ ملا داؤد اور ان کی تصنیف "چنداین" کا ذکر بار بار کرنے اور ایک ہی بات کو دہرانے کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی (دیکھیے ص ۱۴، ۳۱، ۴۱، ۲۳۶) معلوم ہوتا ہے اب پی ایچ ڈی کے مقالوں کے لئے دقیع، نئی اور اہم معلومات ضروری نہیں رہی ہیں۔ ضخامت ضروری ہو گئی ہے اور اس کے لئے ایک بات کو چاہے کتنی بار دہرا لیا جائے مضائقہ نہیں۔

مقالہ کا دوسرا باب دکنی شعری ادب میں نعت کی اہمیت سے متعلق ہے۔ اس میں بھی کئی صفحات دکن کی تاریخ پر صرف کئے گئے ہیں۔ مقالہ نگار کو ہر معاملہ میں اولیت کے شرف کی تلاش کا جو شوق ہے اس کی بناء پر انہوں نے پروفیسر ہارون خان شروانی کے حوالہ سے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ

"کیرل کے شہر کرانگانور میں ایک مسجد ہے جس کے متعلق یہاں کے مسلمانوں میں یہ مشہور ہے کہ یہ برصغیر کی سب سے پرانی عبادت گاہ ہے۔" (ص ۶۸)

اس باب میں ان قدیم شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جن کے کلام میں نعت کے اشعار ملتے ہیں۔ ان سب کا ذکر ہے لیکن اجمال سے اور کہیں تفصیل سے جو ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض کے ہاں بھی ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر اشفاق نے مخطوطات سے براہ راست استفادہ کیا ہے اور ان کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ڈاکٹر آزاد کے ماخذ ثانوی نوعیت کے ہیں انہوں نے مخطوطات تک رسائی کی زحمت نہیں کی کتب اور رسائل کے حوالہ سے کام چلایا ہے حد یہ ہے کہ ملا داؤد کے بارے میں بھی انکی معلومات ثانوی نوعیت Second hand knowledge ہے۔ دکنی تخلیقات میں ان ہی کتب کا ذکر ہے جن کا حال ڈاکٹر اشفاق بیان کر چکے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ڈاکٹر اشفاق نے مخطوطات سے براہ راست استفادہ کیا ہے۔ ان کا مطالعہ کیا جو اوصاف نظر آئے ان کو ضبط تحریر میں لے آئے۔ ڈاکٹر آزاد نے ان مخطوطات کے بارے میں کئی کئی اہل قلم کے قیاسات لکھ دیئے ہیں۔ جن میں سے بعض ایک دوسرے سے متضاد ہیں اور ڈاکٹر آزاد نے اصل ماخذ کا مطالعہ کئے بغیر ہی نتائج کا اعلان کر دیا ہے مثلاً میراں جی کے بارے میں معلومات مولوی عبدالحق (ص ۸۵) محمد ہاشم (ص ۸۵) ڈاکٹر نذیر احمد (ص ۸۶) ڈاکٹر فہمیدہ (ص ۸۶) ڈاکٹر گراہم بیلی (ص ۸۷) کے ذریعہ فراہم کی گئی ہے۔ غالباً دوسروں کے بکھرے ہوئے خیالات کی یکجائی کا نام تحقیق پڑ گیا ہے۔ دریافت، بازیافت، ذاتی مطالعہ اور ذاتی نتائج کی اب تحقیق میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ مقالہ نگار کو اعداد و شمار سے زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی ہے جو ان جملوں سے ظاہر ہے۔

"(شہادت الحقیقت) ایک طویل منظوم رسالہ ہے جس میں کل ۵۶۳ اشعار ہیں یعنی ۱۱۲۶ مصرعے ہیں۔" (ص ۸۷)

"خوش نغز میں ۲۷ اشعار اور ۹ ر ابواب ہیں ہر باب میں اشعار کی تعداد مختلف ہے۔" (ص ۸۹)

"مثنوی شکار نامہ میں (۱۱۵) اشعار ہیں اس میں "خالص نعت" کے (۵) اشعار ہیں۔ (ص ۹۰)

"عبدالملک بھر دچی نے ڈھائی سو اشعار کی ایک مثنوی تصنیف کی۔" (ص ۹۳)

"محمد قلی قطب شاہ نے (۱۱) نعتیہ نظمیں بھی کہیں ہیں جن میں سے (۶) میلاد

النبی ﷺ کے موضوع پر اور (۵) "عید بعثت النبی ﷺ کے مضمون پر ہیں۔"

(ص ۱۰۱)

کم و بیش ہر شاعر کے بیان میں اعداد و شمار ضرور شامل ہیں اگر دوسروں کی تحقیق و تبصرے پر انحصار، دوسروں کے آراء کی یکجائی، اشعار کے تعداد کی گنتی ہی سابقہ کتب میں اضافہ کے لئے کافی ہیں تو ہم تصدیق کرتے ہیں کہ ڈاکٹر آزاد فتح پوری نے "گرانقدر اضافے" کیے ہیں۔

جہاں تک قدیم دکنی شعراء کا تعلق ہے اس مقالہ میں شامل تمام شعراء پر ڈاکٹر اشفاق اور ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنی اپنی آراء کا اظہار کیا ہے جو کہیں مختصر ہے اور کہیں طویل ہے۔ زیادہ تر ان کی اپنی آراء ہیں دوسروں کی لکیر ان محققین نے نہیں پیٹی ہے۔

ڈاکٹر آزاد نے یہ مناسب جدت کی ہے کہ دور قدیم سے حال تک کے دکنی شعراء کو ایک ہی باب میں سمیٹ لیا ہے۔ ورنہ دیگر محققین، ولی اور سراج کے بعد دکنی تحقیق کو نظر انداز کر کے شمالی ہند کے شاعروں کا ذکر کرتے ہیں اور زمانہ کے لحاظ سے ان کے طبقات کا تعین کرتے ہیں۔ جہاں دکنی شاعری میں نعت گوئی ایک باب میں مختص ہو گئی ہے وہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس نوعیت کا لحاظ دیگر علاقوں کے لئے کیوں نہیں رکھا گیا جیسے دہلی کے نعت گو شعراء، لکھنؤ کے نعت گو شعراء، پنجاب کے نعت گو شعراء وغیرہ وغیرہ جبکہ یہ معروف جداگانہ دبستان شمار ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کے شعراء کہ کر سب کو بغیر علاقائی لحاظ کے کیوں یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس طرز عمل سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ دکنی اردو سے مختلف زبان ہے اگر چہ کہ دونوں میں بعض عناصر مشترک ہیں۔

ڈاکٹر آزاد نے دیگر شعراء کے ساتھ شائق کا بھی ذکر کیا ہے اردو کی نعتیہ غزلوں کے جو اوصاف بیان کیے ہیں اور ان کے تعریف کی ہے وہ قابل تحسین ہیں لیکن "ہندوستانی" اور "مقامی" اثرات میں رطب اللسانی اور ان کی تعریف میں حد سے گزر جانا جدت پسندی کے جال میں پھنسنے اور حسن و قبح کے امتیاز کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

> "اردو نعت گوئی کی تاریخ میں شائق کا نام انکی ٹھمریوں کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ ٹھمری ایک قسم کا چھوٹا گیت اور دوسرے لفظوں میں دو بول کا گیت ہے۔ وہ عورت کے جذبہ شیفتگی کا برملا اظہار ہے اور اس میں عورت سماج کے لئے ایک علامت کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔" (ص ۱۷۸)

آخری جملہ انفرادی سوچ کا حامل اور صداقت سے عاری ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

> "ٹھمری خالص ہندوستانی چیز ہے شائق کی نعتیہ ٹھمریوں میں ہندستانی فضا پوری طرح چھائی ہوئی ہے اور عورت کے جذبات وصل و جذبات فراق دونوں کی عکاسی

کی گئی ہے۔" (ص ۱۷۹)

ڈاکٹر آزاد کے خیال میں "خالص ہندستانی" چیز پر حضور ﷺ کا تمام تقدس اور احترام نثار کیا جا سکتا تھا۔ ان کے "وصال" اور "فراق" کے سلسلہ میں عورت کے جذبات کی ترجمانی کی خاطر ہر نوع کے نازیبا الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہیں اور عامیانہ اسلوب سے کام لیا جاسکتا ہے اس سے چاہے حضور ﷺ کی توہین ہو (نعوذباللہ) "ہندوستانی فضا" کی چمک ہوئیدا ہو جاتی ہے ممکن ہے اس نوع کی توصیف بھارتی اسکالروں کی سیاسی مجبوری ہو۔ حضور ﷺ سے عقیدت رکھنے والوں کے لئے "براہ کی دیوانی" کا "نینا لڑائے" "دکھ میں پڑنا اور "ساجن" سے عشق مجاز میں مبتلا عورت کی طرح مطالبات کرنا سوءادب کے سوا کچھ نہیں۔ یہی حال امیر حمزہ کے نعتیہ کلام کی "ہندوستانی فضا" کا ہے۔ ڈاکٹر آزاد کا یہ دعویٰ بے معنی کہ شائق اور امیر حمزہ کا نام اس "ہندوستان فضا" والی "ٹھمری زدہ" شاعری سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اب یہ ٹھمریاں صرف کتابوں میں ملتی ہیں اور لوگ انہیں زبان سے ادا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ امجد کی نعت گوئی انتہائی اعلیٰ درجہ کی ہے لیکن جب ان کی نعتوں میں "جوگن" کا پیوند نظر آتا ہے اور مبصرین "ہندوستان زدگی" کے زعم میں اس کی تعریف کرتے ہیں تو ناطقہ سر بگریباں ہو جاتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ کیا جوگن کا تصور اسلامی ہے؟ اگر نہیں تو اس کی آواز پر سر دھننا کیا معنی؟ عبدالقدیر حسرت کی نعتیہ ٹھمریوں میں حضور ﷺ کی ذات والا صفات "مکہ والے بالما" "معراجی سیاں" "کالی کملی والے بھیا" بن جاتے ہیں

مسلمان خوشامدانہ التجا کرتا ہے "مدینے بلاؤ مجھے" تو "ہندوستانی فضا" پر جان دینے والا شاعر "آجارے" "پھر نہ جارے" کہتا اور بے وقعت نقادوں کے ذریعہ داد سمیٹنا چاہتا ہے۔

دوسرا باب قدیم دور سے شروع ہو کر جدید دور تک یعنی خواجہ بندہ نواز سے تہنیت النساء تک (ص ۶۸ سے ۲۳۲) تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں مشہور شعراء کے مختصر سوانحی حالات ان کی جملہ تصانیف اور ان تصانیف میں موجود نعتیہ اشعار کے علاوہ مقالہ نگار کی اپنی رائے اور ان کی رائے سے زیادہ دوسرے اہل علم کی آراء شامل ہیں۔ ڈاکٹر آزاد کے تبصرہ کا اسلوب سمجھنے کے لئے چند جملے درج کئے جاتے ہیں پڑھئے اور داد دیجئے:

"انہوں نے (میراں جی نے) بلاواسطہ یا بالواسطہ بانی نعت کے متعلقین و متعلقات ہی کو "ہدف تحریر" بنایا ہے" (ص ۸۷)

"اس لئے ڈاکٹر نذیر احمد کی بات قطعی طور پر درست معلوم ہوتا ہے۔" (ص ۸۶)

"کہیں کہیں "خالص نعت" کے اشعار بھی ملتے ہیں۔" (ص ۹۱)

"شاعری میں وہ چستی طبع اور الفاظ و معنی میں ہم آہنگی کا قائل تھا۔" (ص ۱۵۸)

"شاعر نے آپ کے بے نظیر حسن کے بارے میں "بدیع انداز بیاں" اپناتے ہوئے کہا ہے کہ قدرت کے البم (مرقع) میں سے "ایک" "حسین" "تصویریں" تھیں" (ص ۲۱۷)

"طرز تخیل، انداز بیان اور وفور جذبات کے نقطہ نگاہ سے "معرص حث" "ترجیح بند نہایت دلکش و شگفتہ ہے۔" (ص ۲۲۰)

تیسرا باب "شمالی ہند کی نعتیہ شاعری ابتداء سے عہد محسن تک" ہے اس کے ذیلی موضوعات ہیں:

(۱) نعت گوئی سودا سے قبل (ملا داؤد، ملک محمد جائسی، ولی)

(۲) سودا کا دور (سودا، میر، قائم چاند پوری)

(۳) انشاء و مصحفی کا دور (میر حسن، انشاء، مصحفی، نظیر اکبر آبادی، رنگین، ممنون، شاہ رؤف)

(۴) ناسخ کا دور (ناسخ، انیس، دبیر، خواجہ وزیر)

(۵) مومن کا دور (آرزو، ذوق، مذاق، ظفر، اسماعیل شہید، مومن، نازنیں، شہید، شہیدی، لطف، کافی

(۶) امیر، داغ و محسن کاکوروی کا دور (محمد یعقوب نانوتوی، امیر مینائی، محسن کاکوروی، منیر شکوہ آبادی) داغ غائب!؟

یہ ادوار لحاظ زمانہ قائم کیے گئے ہیں جن کی صراحت کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ورنہ اسلوب اور انفرادی رجحانات کے اعتبار سے ایک ذیل میں شامل نام ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے بھلا ناسخ اور انیس و دبیر میں کیا قدر مشترک ہو سکتی ہے۔ اس باب میں ملک محمد جائسی کی شمولیت سوالیہ نشان ہے یہ امر متنازعہ ہے کہ انہیں اردو کا شاعر کہا جائے یا ہندی کا۔ چونکہ ان کی تصنیف پدماوت اردو رسم الخط میں ہے مولوی عبدالحق نے اسے مرتب کر کے اردو کے زمرے میں شامل کر دیا ہے لیکن دیگر محققین نے اسے صاد نہیں کیا۔ ان کے علاوہ نہ تو کوئی نام نیا ہے اور نہ خصوصیات کے بیان میں کسی ژرف نگاری سے کام لیا گیا ہے البتہ حسب روایت سابقہ باب "اہل الرائے" سے خاطر خواہ استفادہ کر کے ان کے "اقوال زریں" کے حوالہ سے مقالہ کو گراں بار کیا گیا ہے کوئی شاعر ایسا نہیں ہے جس میں مقالہ نگار کی رائے سے ۳، ۴ گنا زیادہ دیگر زعماء کی رائے موجود نہ ہو۔

محسن کے قصیدہ لامیہ کی توضیح و تشریح اشعار کی مدد سے نہیں اپنے تخیل سے کی گئی اور تعریف میں یہاں تک لکھ گئے ہیں:

"اسلامی تہذیب کو ہندوستانی رنگ ڈھنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے نہ صرف یہ کہ ہندوانی رسوم و رواج اور میلوں ٹھیلوں کا تذکرہ کیا ہے بلکہ ہندوستانی تشبیہات و استعارات سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ قصیدہ پہلی نعتیہ کاوش

ہے جس میں ہندوؤں کے "مقدس مقامات" کو مسلمانوں کے مقدس مقامات کے لئے بطور استعارہ استعمال کیا گیا ہے۔" (ص ۳۸۴)

ایسے ہی موقع کے لئے کہا گیا ہے "ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہئے"

مقالہ کا چوتھا حصہ "شمالی ہند کی نعتیہ شاعری حالی سے حال تک" کے زیر عنوان ہے اس کے ذیلی حصے بھی ہیں۔

(۱) حالی کا عہد (۲) دور جدید (۳) عصر حاضر

حالی کے عہد میں معروف ناموں کے ساتھ عبدالرحیم رحیسا اور محمد تجمل حسین تجلی دو ایسے نام ملتے ہیں جن کا ذکر ماقبل کی کتابوں میں نہیں ہے۔ رحیسا کا تعلق مقالہ نگار کے وطن مالوف سے تھا اس لئے جہاں اسماعیل میرٹھی کو تین سطور اور سات اشعار بطور نمونہ پر ٹرخا دیا ہے وہاں رحیسا کے لئے چھ صفحات مختص کر دیئے ہیں۔ مقالہ نگار نے ان نعتوں میں ۲۲ تخلیقی کارنامے گنائے ہیں جو بھاشا میں بھی ہیں، فارسی میں بھی، بھاکا میں بھی، پوربی میں بھی، ہندی میں بھی اور اردو میں بھی۔ ان میں بھجن، دادرا، ٹھمری بھی ہیں اور باوصف خاص کہ "در ہر شعر مضمون چہار زبان نوشتہ یعنی بھاکھا، اردو، فارسی و عربی۔ شاعری کیا ہے زبان دانی کا مظاہرہ ہے اور مقالہ نگار نے "اردو شاعری میں نعت" کے زیر عنوان ایسا کلام بھی بطور نمونہ دیا ہے جو کسی اردو دان کی سمجھ میں نہ آسکے مثلاً

یونس کا من سے کشٹ بریو بلی اسماعیل کا بدل دیو
یوسف کی کوب منھ ہاتھ دھریو تمہہ کھیو نوح کی نادیا
اے پون بھور (ص ۴۴)

دوسرے شاعر تجمل حسین تجلی عرف کلن بھی فتح پور سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کا تعارف چند سطور میں کروانے کے بعد ان کے خصوصیات کلام کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے:

"کلام میں بلا کا تغزل اور داخلیت ہے سبھی نعتیں غزل کی ساخت میں ہیں کلن کی زبان صاف، سادہ اور عام فہم ہے۔" (ص ۷ ۴)

باقی شعراء کے بارے میں وہی کچھ لکھا جو ماقبل میں بار بار لکھا جا چکا ہے۔

"دور جدید" میں اقبال کے ساتھ اختر شیرانی، ظفر علی خان، جگر مراد آبادی، عزیز لکھنوی، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، حسرت موہانی، اصغر گونڈوی، اقبال سہیل اور عزیزالحسن مجذوب ہیں۔ اس حصہ میں مجذوب کا حوالہ مقالہ نگار کا اضافہ ہے۔

عصر حاضر میں دو درجن نعت گو شاعروں کے نام ہیں ان میں دو ایک کے سوا سب کو سطر، دو سطر میں نمٹا دیا ہے۔ ان نعت گویوں کے جلو میں جوش ملیح آبادی ہیں جو اعلان کر چکے ہیں کہ مذہبی نوعیت

کاکلام ان کے عہد جاہلیت کی یادگار ہے جبکہ یہ صراحت نہیں کی ہے کہ عہد جاہلیت کب تک قائم رہا۔

اس سے قبل بھی تحریر میں آچکا ہے ایک، دو نعتیں لکھ کر جو رسمی خانہ پری کرتے ہیں، مشاعرہ لوٹنے کے لئے چند نعتیہ اشعار کہہ لیتے ہیں یا ٹیلی ویژن میں رونمائی اور حصول چیک کے لئے اس صنف میں زور آزمائی کرتے ہیں ان کو نعت گویوں کے قابل احترام گروہ میں شامل کرنا زیادتی ہے۔ وہ لوگ ہرگز نعت گو کہلانے کے مستحق نہیں جن کا ظاہر قرآن، حدیث، اسوہ حسنہ کے برخلاف رہا ہے اور اپنی گمراہی پر فخر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مقالہ نگاروں کی مجبوری یہ ہے کہ ان کو ڈگری اعلیٰ درجہ کے مواد پر نہیں مقالہ کی ضخامت اور اسم شماری پر ملتی ہے۔

پانچویں باب میں غیر مسلم شعراء کا حال قدیم تذکرہ شعراء کے انداز میں ہے جن تمیں شاعروں کا تذکرہ مرتب کیا گیا ہے وہ انتہائی معروف ہیں اگر اسے ایک باب کی صورت ہی دینا تھی تو کم از کم اضافہ ہی کر دیتے جو بھارت میں رہتے ہوئے ایسا مشکل بھی نہ تھا پاکستان میں نور احمد میرٹھی نے "بہر زماں بہر زباں" کے نام سے جو غیر مسلم شعراء کا تذکرہ لکھا ہے اس میں ۳۱۴ شعراء شامل ہیں۔

چھٹے باب میں "مختلف اصناف سخن میں نعت" کے عنوان سے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل، قطعہ، رباعی، ترجیع بند، مثلث، مخمس، مسدس، مستزاد، نظم، گیت، ترانہ، ٹھمری، دادرا غرض تمام شعری ہئیتں اور ان میں موجود نعتیہ حصوں کو بیان کیا ہے۔ اس میں معلومات کا کوئی اضافہ نہیں مقالہ میں پیش کردہ مواد کی صفت بار بار تکرار ہے اس میں جدت بھی کوئی نہیں ہے کہ ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی کا مقالہ ان ہی بنیادوں پر لکھا جا چکا ہے۔

ساتویں باب میں "نعت کی اہمیت اور اردو ادب میں اس کے مقام" سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں بھی ان خیالات کا اعادہ ہے جو پہلے ہی مقالہ میں آچکے ہیں۔

فی احسن تقویم   از جاوید احسن خان

مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ اس کتاب کے مصنف کا نام میرے لئے اجنبی ہے۔ یہ کتاب ڈیرہ غازی خاں سے شائع ہوئی ہے۔ پیش لفظ اور عرض مصنف کے آخر میں بھی پتے ڈیرہ غازی خان کے درج ہیں جو انتہائی خوشی اور طمانیت کے باعث ہیں۔ ڈیرہ غازی خان خاص ثقافت کا حامل ہے وہاں کی اپنی زبان ہے اور وہاں بسنے والوں کی اپنی روایات ہیں۔ یہ سب قابل احترام ہیں۔ وہ بھائی بھی قابل احترام ہیں جو ان اعلیٰ ترین اقدار کے پاسبان ہیں۔ وہ اردو کے مراکز سے دور رہتے ہیں لیکن اردو سے دور نہیں ہیں۔ نام نہاد تہذیبی مراکز کی نسبت انہیں پس ماندہ سمجھا جاتا ہے لیکن وہ فطرت کے امین، فطری تہذیب کے آفریدہ ہیں۔ ان کے دل تصنع اور منافقت سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کی باتوں میں خلوص ہوتا ہے سچائی ہوتی ہے۔

جاوید احسن خان کی تحریر اس کی غماز ہے ان کی کاوش "کتاب سازی" کی مرہون منت نہیں خاص مقصد کے تحت سامنے آئی ہے۔ سردار حافظ اورنگ زیب عالمگیر آزردہ نے اپنے پیش لفظ میں درست تحریر فرمایا ہے کہ

"جاوید احسن صاحب نے اس موضوع پر اپنا تنقیدی مطالعہ "فی احسن تقویم" کی صورت میں پیش کر کے آئندہ کے نعت گو حضرات کے سامنے راستہ صاف کر دیا ہے اور نہایت شرح و بسط کے ساتھ بتا دیا ہے کہ نعت کے لوازمات، آداب اور حدود کیا ہیں اور کیسے حق نعت گوئی ادا کرتا ہے۔" (ص ۱۱، ۱۲)

مصنف نے سادگی اور دلنشیں انداز میں حق گوئی سے کام لیتے ہوئے نعت کی عظمت اس صنف سخن کی پاکیزگی اور اس کے آداب پر بے لاگ گفتگو کی ہے۔ ان کے بیان کا ایک ایک لفظ ان کی علمیت اور رائے کا مظہر ہے ان میں نہ تصنع ہے نہ تفاخر۔

باب اول میں مصنف نے رسم پوری کرنے کی خاطر حمد، نعت اور منقبت کی تعریف کی ہے۔ جو انتہائی مختصر ہے چونکہ اس اصطلاحات کے معنے عام طور پر معلوم ہیں اس لئے مصنف نے لفظوں کے ڈھیر لگا کر بات کو طول دینے کی کوشش نہیں کی ہے البتہ نعت کے اصطلاحی پس منظر پر کافی روشنی ڈالی ہے جس میں فرمان خداوندی کے علاوہ علمائے قدیم کے فرمودات کے حوالہ سے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عربی زبان پر عبور رکھتے ہیں اس لئے وہ بے ساختہ عربی کے حوالے دیتے جاتے ہیں اور ان کے ترجمہ کر کے استفادہ کا حلقہ وسیع کرتے جاتے ہیں۔

باب دوم میں نعت کے لوازمات سے بحث کی گئی ہے۔ مختلف اہل علم کے حوالوں سے انھوں نے لکھا ہے:

(۱) نعت میں وہی ذکر ہونا چاہئے جو اللہ کے نبی کے شایان شان ہو (ص ۲۸)

(۲) آنحضور ﷺ کے شمائل و محاسن بیان کرتے وقت وقار اور متانت اور تعظیم و تقدیس کی روش اختیار کرنی چاہئے۔ (ص ۲۸)

(۳) نعت ہی نہیں ہر طرح کے کلام میں مبالغہ صرف اس حد تک جائز ہے کہ اس کے پیچھے یا اس کے نتیجے میں حقیقت بالکل چھپ کر یا دب کر نہ رہ جائے۔ (ص ۲۹)

(۴) نعت کہنے میں بڑی احتیاط برتنی چاہئے۔ شاعر کبھی بڑھتا ہے تو الوہیت تک پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہو جاتی ہے۔ (۲۹)

اسی کے ساتھ مصنف نے عمومی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ ان میں (۱) شرک فی المراتب (۳۱ تا ۳۵) (۲) فرق فی التفضیلات الانبیاء (ص ۳۶، ۳۷) (۳) ادب و احترام (ص ۳۸، ۳۹) (۴) تشبیہ و استعارے کا محتاط استعمال (ص ۳۹ تا ۴۲) (۵) انتخاب الفاظ (ص ۴۳ تا ۴۵) (۶) انداز

بیان (ص ۴۶ تا ۵۰) (۷) انداز تخاطب (ص ۵۰ تا ۵۳) (۸) حقیقت نگاری (ص ۵۴ تا ۵۷)
(۹) مضامین نعت (ص ۵۸ تا ۶۸) ان تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے اپنے بیان کی تائید
میں عربی و فارسی اور اردو کے حوالہ نہایت موزوں اور مناسب طریقہ سے دیئے گئے ہیں کہ ایک مبتدی بھی
فاضل مصنف کا مافی الضمیر آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔

باب سوم حسب روایت قدیم عربی زبان میں نعت گوئی کی روایت سے متعلق ہے (ص ۶۸ تا
۷۳) اس میں ان شعراء کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جن کا تعلق بر صغیر سے رہا ہے اور انہوں نے عربی زبان
میں نعت گوئی میں کمال دکھلایا ہے۔

باب چہارم "فارسی میں نعت گوئی" سے متعلق ہے اسی میں ان تمام شعراء کے نام دیئے گئے
ہیں جنہوں نے فارسی میں نعت کہہ کر نام کمایا ہے۔ اگرچہ ان کے بارے میں تفصیلات درج نہیں چونکہ یہ
اصل موضوع نہیں تعارفی حصہ ہے اس لئے تفصیل میں نہ جانا ہی اچھا ہے۔

باب پنجم میں اردو نعت کے آغاز اور ارتقاء پر روشنی ڈالی گئی ہے اس میں ایک فہرست نعت گو
شعراء کی مرتب کی ہوئی موجود ہے جس میں سلطان محمد قلی قطب شاہ سے غلام امام شہید تک کے نام موجود
ہیں۔ فہرست کے بعد خاص نعت گو شعراء کے بارے میں مصنف نے اپنی رائے ظاہر کی ہے اس کے اختتام
پر اس دور کی خصوصیات درج ہیں۔

اردو نعت کی نئی روایت (۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء) میں ان سیاسی، سماجی اور مذہبی امور کا جائزہ
لیا ہے جو مسلمانوں کے ذہنوں کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوئے اور مذہبی اصلاحی ضرورت کے تحت
نعت گوئی کا فروغ ہوا۔ اس ضمن میں امیر مینائی، محسن کاکوروی، مولانا حالی، بریلوی برادران کا خصوصی ذکر
ہے۔ محسن کے کلام کے مثبت و منفی رویوں کی نشاندہی حقیقت پسندانہ ہے۔

باب ہشتم "حدیث دیگراں" کے زیر عنوان ہے جس میں غیر مسلم شعراء کی نعت گوئی کا خاکہ
ہے اس میں دلورام کوثری کے کلام پر تفصیلی رائے ہے دیگر شعراء کا سرسری حال درج ہے۔

"اردو نعتیہ شاعری میں ہندی صنمیات کے اثرات" اسی باب کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں خوشی ہے
کہ موضوع کے بارے میں ہم جن خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں مصنف کو ان سے اتفاق ہے۔

باب پنجم، نعت کے دور اقبال سے متعلق ہے جس میں اقبال کے علاوہ محمد علی جوہر، مولانا ظفر
علی خان کا خصوصی ذکر ہے۔ اس باب میں عہد جدید پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ، بیدم
وارثی، سیماب اکبر آبادی، حسرت موہانی، اسد ملتانی، ماہر القادری، بہزاد لکھنوی اور ابو الاثر حفیظ جالندھری
کو شامل کیا گیا ہے اور ہر ایک کی نمایاں خصوصیات اجاگر کی گئی ہیں۔

دراصل جاوید احسن خان کی یہ جامع کتاب نہیں اور نہ انہوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے یہ اردو میں

نعت گوئی کا خاکہ ہے جس پر مربوط، وقیع کام کی بنیاد ڈالی جا سکتی ہے۔ ویسے بھی ان لوگوں کے لئے جو "غیر اردو کے علاقوں" میں رہتے ہیں یہ نہایت اچھی تعارفی کوشش ہے۔

حرف آخر

سب سے آخر میں، میں ایک نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں جس کی جانب اہل علم حضرات کی نگاہ نہیں گئی۔ ان کتابوں کا ہی ذکر نہیں جن کا اس مضمون میں جائزہ لیا گیا ہے بلکہ دیگر کتب و مضامین جو نعت کے موضوع پر میری نظر سے گزرے ہیں ان میں بھی کہیں اس کی جانب اشارہ تک نہیں۔

اہل علم نے نعت کو ذریعہ اظہار سمجھ لیا ہے جس میں حضور اکرم ﷺ اور ان سے متعلقہ موضوعات و پہلوؤں کے لئے خلوص، عقیدت، احترام اور محبت بیان کی جائے گی۔ یہ بیان عربی، فارسی، ہندی زبانوں میں اسلامی اقدار کے مطابق یا کسی بھی مذہب کے اقدار کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اگر نعت پر عربی اثر ہے تو وہاں کی رسومات، روایات، چاہے وہ ادبی ہوں، شعری ہوں یا معاشرتی ہونا چاہئے۔ اسی طرح فارسی نعت میں ایرانی رنگ اور اردو میں وہ پنچ رنگی کیفیت ہو جو اس زبان میں پائی جاتی ہے تو ہمارے خیال میں نعت گوئی تو ہو جاتی ہے نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اردو نعت میں کتنا ہی ہندوستانی تہذیب، ہندوانی معاشرت، ہندوانی صنمیات کا اجتماع کر کے ادبی حلقوں میں وسیع القلبی، وسیع النظری، جدت طرازی، ترقی پسندی کے نام پر تعریف و توصیف و ستائش کو بٹور لیا جائے اہل دل کراہیت کے ساتھ اسے نعت تو مان لے گا ساتھ ہی یہ بھی کہے گا کہ نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہوا۔ نعت صنف شاعری نہیں، نعت شاعرانہ طرز اظہار نہیں، نعت روح کی گہرائیوں کی پاکیزگی سے نکلنے والی لے ہے وہ ایک مقدس فریضہ ہے جو خدا اور قرآن نے ہم پر عائد کیا ہے۔ نقاد کو شعری خوبیاں اور خامیاں نظر آتی ہیں اہل نظر ایسے کلام میں خلوص اور سچائی ڈھونڈتے ہیں جب یہ مل جائیں تو سند افتخار عطا کرتے ہیں جس سے قبولیت خواص و عام کی راہ کھل جاتی ہے اور ضروری بھی نہیں کہ اہل نظر اور اہل دل سند ہوں۔ نعت کے باب میں ہر خاص و عام اس پیمانے سے واقف ہے جس کے ذریعے سند عطا ہوتی ہے جو خلوص، محبت، اپنائیت، دل کا تقدس اور کلام کی پاکیزگی نے حالی اور اقبال کی نعت کو قبولیت خواص و عام عطا کی ہے ــــــ ہے اس کا کوئی جواب ــــ؟

نعت کہنے اور نعت کہنے کا حق ادا کرنے کے فرق کی میں دوسرے انداز میں پوری وضاحت کروں گا جیسے مسلمان خدا کے حضور دعا مانگتا ہے۔ "دعا" کہاں سے نکلی؟ کیونکر نکلی؟ کن الفاظ اور کس لہجے میں

نکلی؟ آپ خود غور فرمائیں دعا اظہار کا نام نہیں ہے مانگنے کے سلیقے کا نام ہے جس طرح دعا مانگتے ہوئے ہم اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کے حضور میں پاتے ہیں تو حفظ مراتب کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ جذبے کے نیک ہونے کا احساس بھی ہوتا ہے بات دل کی گہرائیوں سے پورے تقدس واحترام سے نکلتی ہے تب ہی اثر بھی رکھتی ہے۔ دعا لفظی اظہار نہیں! دعا خواہش اور جذبے کی تکمیل کی تمنا ہے، اس میں مانگنے والے اور جس سے مانگا جارہا ہے ان کے درمیان موجود اور نہ مٹنے والا فرق ہے اسے ملحوظ رکھے بغیر دعا میں اثر پیدا ہونا ممکن ـــــ یہی حال نعت کا ہے۔ نعت صرف ذریعہ اظہار نہیں، موزونیت کلام نہیں۔ شعریت کے لئے کاشی اور متھرا میں بھٹکنے کا نام نہیں۔ کرشن کنہیا کی بانسری پر رقص کرنے کا نام نہیں، گوپیوں کے چرن چھونے کا نام نہیں، جوگن بن کر دادرا، ٹھمری گانے کا نام نہیں، عقیدت سے سر جھکانے، خلوص سے سپاس گزار ہونے اور اس مدح کو زبان پر لانے کی جرات کا نام ہے کہ جس سے روح کی کثافتیں دور ہوں، دل کی ہولناکیاں دور ہوں، آنکھوں پر پڑے توہمات اور خود ساختہ سماجی رویوں کے اندھیرے دور ہوں۔

آپ تسلیم کریں یا نہ کریں دعا کی جو شرائط اور آداب ہیں میری نظر میں نعت کی شرائط اور اس کے آداب بھی وہی ہیں۔ اگر یہ نہیں ہے تو نعت گوئی ہو رہی ہے نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے۔

(۲)

حرف آخر کے طور پر یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ جن کتابوں کا میں نے مطالعہ کیا اور تجزیہ کیا فی الواقعی وہ اپنی اپنی جگہ قابل تعریف ہیں۔ ہر مصنف نے محنت سے کام کیا ہے اور خلوص نیت سے ہر دور اور ہر شاعر کی نعت گوئی پر بے لاگ تبصرے کیے ہیں۔ یہ تبصرے لائق توجہ اور قابل احترام ہیں اگر چہ ان سے اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے جس طرح ایک رائے رکھنے کے اظہار کا مصنف، محقق اور مقالہ نگار کا حق ہے اسی طرح اس سے اختلاف کرنے کا ایک مبصر کو بھی ہے۔ اس اختلاف کا مقصد کسی سے بیر پالنا نہیں، کسی کے احترام میں کمی کرنا نہیں، یہ ممکن ہے کہ ذہنی رو میں کہیں قلم نے بے اعتدالی دکھلائی ہو اس کو تحریر کا قصور سمجھا جائے نیت کا نہیں۔ اگر میری اختلافی رائے پر سنجیدگی سے غور ہو اور آئندہ کسی تصنیف یا تالیف میں اسے درخور اعتناء سمجھ کر اتفاق یا اختلاف کیا جائے تو میں سمجھوں گا کہ جس مقصد سے میں نے قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا ہو گیا ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید

قصیدہ بُردہ شریف ــــــ کچھ اور منظوم اردو تراجم

قصیدہ بُردہ کے منظوم اردو تراجم کے سلسلے میں جناب ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا ایک مضمون "نعت رنگ ،۸" (ستمبر ۱۹۹۹ء) میں نظر سے گزرا۔ مضمون نگار نے چار منظوم اردو تراجم کا تذکرہ کیا ہے جبکہ دو (مترجم محمد حسین خاں، سیشن جج اور سید محمود علی انہوں نے محمد علی لکھا ہے جو درست نہیں ہے) کے محض نام دیئے ہیں کہ وہ ان کی دسترس میں نہیں ہیں اور یہ نام بھی جناب فروغ احمد کے منظوم اردو ترجمے "نوائے بردہ" کے دیباچے سے مستعار ہیں۔ انہوں نے درج ذیل اردو تراجم کا تعارفی اور تنقیدی انداز میں ذکر کیا ہے۔

(۱)	اشرف الاشعار	سید عبدالفتاح اشرف علی
(۲)	قصیدہ بردہ سعید	مولوی عبدالرحمٰن مغید
(۳)	قصیدہ بردہ شریف منظوم	محمد عبدالوہاب عندلیب
(۴)	نوائے بردہ	فروغ احمد

اس مضمون کے آخر میں مدیر نعت رنگ نے مزید پانچ منظوم اردو تراجم کی نشاندہی کی ہے۔ "نوائے بردہ" کے سوا باقی تین تراجم جن کا ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے تذکرہ کیا ہے وہ یقیناً کمیاب ہیں اور ان کی یہ تحقیق بھی انتہائی قابل قدر ہے کہ "اشرف الاشعار" کو تقدم زمانی حاصل ہے۔

جہاں تک قصیدہ بردہ شریف کی تشریحات، تراجم، تخمیس، تسبیع اور تشطیر وغیرہ کا تعلق ہے، مختلف زبانوں میں اس قدر کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا مکمل احاطہ بہت مشکل ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر علی محسن صدیقی نے "شرح قصیدہ بردہ" کے آغاز میں اور ڈاکٹر جلال الدین نوری نے "نعت رنگ" کے شمارہ ۶ میں کچھ اجمالی اشارے دیئے ہیں جو تلاش و تحقیق کے سلسلے میں اہل قلم کی بھرپور اعانت کر سکتے ہیں۔ یہ قصیدہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ ناز میں شرف قبول پا چکا ہے اس لئے اس کے منظوم تراجم

اور تشریحات کا سلسلہ ہے کہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جارہا ہے اس قصیدے کے دس باب ہیں (۱) عشق رسول علیہ السلام کے ذکر میں (۲) خواہش نفسانی کے رک جانے کے بیان میں (۳) مدح رسول ﷺ سے متعلق (۴) ولادت باسعادت کا ذکر (۵) برکاتِ دعوت کے بارے میں (۶) قرآن پاک کی عظمت کے سلسلے میں (۷) واقعہ معراج کے بیان میں (۸) جہاد سے متعلق (۹) طلب مغفرت اور التجائے شفاعت کے سلسلے میں (۱۰) مناجات اور عرض حاجات۔ اشعار کی کل تعداد ۱۷۲ ہے بعض کے نزدیک ۱۶۰ ہے۔

اس کے منظوم اردو تراجم یقیناً بہت سے ہیں مگر اب تک دستیاب اردو تراجم (زمانی اعتبار سے) درج ذیل ہیں۔

۱۔ اشرف الاشعار	سید عبدالفتاح اشرف علی	۱۹۰۵ء	مطبع گلزار حسنی۔ بمبئی
(مذکورہ بالا مضمون میں سن اشاعت غور طلب ہے)			
۲۔ قصیدہ بردہ سعید	مولوی عبدالرحمٰن مفید	۱۹۲۸ء	نامور تاج پریس حیدر آباد
۳۔ قصدیہ بردہ منظوم اردو' فارسی	محمد حسین خاں سیشن جج	۱۹۲۹ء	رحمانی پریس دہلی
۴۔ قصیدۃ البردہ	پروفیسر سید محمود علی	۱۹۵۱ء	کتب خانہ انصاریہ پشاور
۵۔ قصیدہ بردہ شریف منظوم ترجمہ	فیاض الدین نظامی	۱۹۵۷ء	تاج کمپنی کراچی
۶۔ قصیدہ بردہ شریف منظوم ترجمہ	درد کاکوروی	۱۹۶۸ء	کراچی
۷۔ قصیدہ بردہ منظوم ترجمہ	عبداللہ ہلال صدیقی	۱۹۷۰ء	کراچی
۸۔ نوائے بردہ	فروغ احمد	۱۹۷۵ء	ادب اسلامی پبلی کیشنز لاہور
۹۔ قصیدہ بردہ منظوم ترجمہ	محمد سعید دہلوی	۱۹۷۷ء	نوری بک ڈپو لاہور
۱۰۔ قصیدہ بردہ منظوم ترجمہ	مہر عبدالحق	۱۹۷۸ء	سرائیکی ادبی بورڈ۔ ملتان
۱۱۔ قصیدہ بردہ منظوم ترجمہ	سید مبارک علی	۱۹۸۳ء	سرائیکی ادبی بورڈ لاہور
۱۲۔ قصیدہ بردہ شریف منظوم ترجمہ	محمد عبدالوہاب عندلیب		مطبع اعظم جاہی شاہ حیدر آباد
۱۳۔ قصیدہ بردہ شریف منظوم ترجمہ	حکیم حیدر امر تسری		مطبع اعظم جاہی شاہ لاہور
۱۴۔ قصدیہ بردہ منظوم (آزاد نظم)	ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی	۱۹۹۶ء	نعت رنگ شمارہ ۳' کراچی

سید عبدالفتاح اشرف علی' مولوی عبدالرحمٰن مفید' محمد عبدالوہاب عندلیب اور فروغ احمد کے منظوم تراجم پر سید یحییٰ نشیط تبصرہ کر چکے ہیں۔ احقر کے پیش نظر آٹھ منظوم اردو تراجم کا اجمالی تعارف ہے (جبکہ درد کاکوروی اور سید مبارک علی کے منظوم تراجم میرے پاس نہیں ہیں) اور ہر تعارف کے ساتھ بطور نمونہ اردو اشعار اس ترتیب سے دے رہا ہوں کہ قصیدہ بردہ کا ایک ایسا منظوم اردو ترجمہ بھی محفوظ ہو جائے

جو ایک نہیں بلکہ مختلف شاعروں کی فکری اور فنی صلاحیتوں کا عکاس ہو۔ احقر کی یہ کاوش محض تعارفی نوعیت کی ہے اور بعض نایاب اردو تراجم کو محفوظ کرنا مقصود ہے کسی نوع کا تقابلی، تنقیدی یا فنی محاکمہ پیش نظر نہیں ہے کیونکہ اس کے لئے ایک الگ مبسوط تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے۔

۱۔ قصیدہ بردہ اردو

خان بہادر پیرزادہ محمد حسین (ایم۔اے۔سی۔آئی۔ای سابق سیشن جج)

جناب محمد حسین، عارف تخلص کرتے تھے۔ میرے پاس ان کا ایک مجموعہ کلام "خزینہ معارف یعنی مجموعہ نظم عارف" ہے۔ اس میں ۱۶ اردو نظمیں ہیں، پہلی نظم قصیدہ بردہ اردو ہے۔ اسے محمد نذیر حسین، حافظ محمد شریف حسین، تاجران کتب دہلی نے رحمانی پریس دہلی سے طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ اس پر سن اشاعت تحریر نہیں ہے۔ البتہ محمد الدین کاتب نے کتابت کی تاریخ رجب ۱۳۳۲ھ (مئی ۱۹۱۴ء) لکھی ہے جبکہ تذکرہ نگاروں نے تاریخ طباعت ۱۹۲۹ء لکھی ہے اور فارسی منظوم ترجمے کا ذکر بھی کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں عربی متن کے بغیر صرف منظوم اردو ترجمہ ہے۔ جناب فروغ احمد کے مطابق محمد حسین خاں عارف کے اردو و فارسی دونوں منظوم ترجمے مع متن رحمانی پریس دہلی سے ۱۹۲۹ء میں چھپے تھے۔ "مجموعہ نظم عارف" کے سرورق پر مصنف کی کچھ کتابوں کا بھی ذکر ہے جو درج ذیل ہیں۔

عجائب السفار، مثنوی عقد گوہر، قصیدہ بردہ، حکایات لقمان، خون کا پیاسا۔ یہ اولین منظوم ترجموں میں سے ہے۔ اسی لئے ہر ایک نے اسے نایاب قرار دیا ہے۔ ترجمہ نگار بھی معروف نہیں ہیں مگر ان کا یہ ترجمہ رواں دواں اور خوبصورت ہے۔ زبان و بیان شگفتہ و برجستہ ہے کہیں بھی کھینچ کا احساس نہیں ہوتا۔ انہوں نے اپنے اس ترجمے کے بارے میں لکھا ہے:

"اس عارف بے معرفت کی مدت سے یہ آرزو تھی کہ مداحان رسول مقبول ﷺ میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کروں لیکن حوصلہ نہ پڑتا تھا کیونکہ اس میدان میں بڑے بڑے شہسوار گر چکے ہیں اور قبولِ عام کا مرتبہ بہت ہی کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوا ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

منجملہ متاخرین کے ایک صاحب قصیدہ بردہ ہیں جو اس مضمون میں گویا قلم توڑ گئے ہیں جو قبول ان کے قصیدے کو درگاہ ایزدی اور جناب مصطفوی میں حاصل ہوا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ صاحب قصیدہ امام ابو عبداللہ شرف الدین محمد بن سعید البوصیری القاہریؒ سبب تالیف کی بابت یہ فرماتے ہیں "مجھ پر فالج گرا۔ نیچے کا دھڑ بالکل نکما ہو گیا۔ میں نے نیت کی کہ نعت نبی ﷺ میں ایک قصیدہ نظم کروں چنانچہ جب اس

قصیدے کی نظم سے فارغ ہوا تو خواب میں دیکھا کہ آپ میرے بدن پر نہایت شفقت سے دست مبارک پھیر رہے ہیں۔ صبح کو اٹھا تو بالکل صحیح وسالم تھا۔ نماز کے لیے گھر سے باہر نکلا تو دروازے پر ایک درویش کھڑا دیکھا۔ اس نے مجھ سے کہا جو قصیدہ تم نے نعت میں تصنیف کیا ہے ہمیں بھی سناؤ۔ میں نے کہا کون سا قصیدہ؟ میں نے تو اپنی تمام عمر نعت گوئی کے لیے وقف کی ہوئی ہے۔ درویش نے کہا وہ قصیدہ جس کا اول شعر یہ ہے۔

امن تذکر جیران بذی سلم من جت دمعاً جری من مقلة بدم

میں بہت متعجب ہوا کہ میں نے تو اب تک اس قصیدے کا ذکر بھی کسی سے نہیں کیا تھا اس کو کس طرح خبر ہوگئی۔ درویش نے کہا کل رات کو یہ قصیدہ جناب مصطفوی ﷺ میں پڑھا گیا تھا اور آپ سن کر بہت محظوظ ہوئے تھے۔ میں نے اس درویش کو اس قصیدے کی ایک نقل دے دی اور وہ چلا گیا۔ یہ خبر رفتہ رفتہ تمام شہر قاہرہ میں مشہور ہو گئی۔ بہاء الدین وزیر ملک طاہر نے جب یہ حال سنا تو مجھے بلا بھیجا۔ اور ایک عالیشان محفل میلاد منعقد کر کے مجھ سے قصیدے کو سنا اور خود برہنہ سر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا ہمیشہ یہ دستور رہا جب بھی اس کو کوئی مشکل لاحق ہوتی تھی اسی طرح محفل کر کے سر برہنہ کھڑا ہو کر اس قصیدے کو سنا کرتا تھا۔ خداوند تعالیٰ اس کی مشکل کو حل کر دیتا تھا۔ جب سعد الدین فاروقی کو ملک طاہر نے اپنا وزیر مقرر کیا اور وہ ایک بار بیماری چشم سے بہت ناچار ہوا۔ اس سے خواب میں کسی نے کہا کہ وزیر بہاء الدین کے پاس جا اور اس سے بُردہ لیکر آنکھوں پر رکھ انشاء اللہ تیری شکایت رفع ہو جائے گی۔ سعد الدین نے آکر بہاء الدین سے یہ تمام قصہ بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایسی کوئی شئے نہیں جس کا نام بردہ ہو لیکن میرے پاس ایک قصیدہ ہے جس کو میں مشکل کے مواقع پر محفل کر کے پڑھوایا کرتا ہوں۔ اس نے وزیر سعد الدین کو وہ قصیدہ دے دیا۔ وزیر نے قصیدے کو اپنی آنکھوں پر رکھا اور خدا کے حکم سے اس کو فوراً صاف نظر آنے لگا۔ اس روز سے اس قصیدے کا نام بُردہ مشہور ہو گیا۔ (بُردہ بالضم۔ خط دار چادر کو کہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ مضامین مختلفہ ہونے کے باعث سے قائل نے اس کو بردہ کہا ہو لیکن اغلب ہے کہ بالفتح ہو اور برد سے مشتق ہو۔ برد ہوا سے ٹھنڈا کرنے کو کہتے ہیں اور حکایت بالا سے اس وجہ تسمیہ کی تائید بھی ہوتی ہے۔ قبول جناب مصطفویؐ کے لیے یہ شہادت کافی ہے۔)

قبول ایزدی کا یہ حال ہے کہ سات سو سال سے مصر و عرب و شام و مغرب کے ملکوں میں اس قصیدے کو وہاں کے مسلمان ہر روز محفل کر کے بعد نماز عشاء کے سوز و گداز کے ساتھ پڑھتے اور سنتے ہیں۔ ہندوستان اور فارس میں بھی خوشنویس نہایت اہتمام کے ساتھ اس کو لکھا کرتے تھے اور اہل اللہ بطور عمل کے بھی اس کی اجازت دیا کرتے تھے۔

میں نے جب تیرکا اس کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ عربی علم وادب کا ایک ادق نمونہ ہے اور بغیر شرح کی مدد کے کوئی اچھا مستعد عربی داں بھی اس کو حل نہیں کر سکتا۔ اس خیال سے کہ میرے ہم وطن مسلمان بھائی اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہیں میں نے مولانا جامی کی تقلید سے مصنف کے مضامین اور خیالات کو اسی قافیہ میں لیکن ایک اور مشابہ مگر زیادہ تر عام پسند بحر میں ترتیب اور الفاظ میں ذرا تصرف کر کے زبان اردو میں لانے کا ارادہ کیا تاکہ اس ملک کے عوام اور خواص کے مذاق کے موافق ہو جائے اور ترجمے کی بے لطفی اس میں باقی نہ رہے۔ کام تو ایسا آسان نہ تھا مگر میرا شوق پورا اور نیت خالص تھی۔ عنایت ایزدی سے چند روز میں فارغ ہو گیا۔ اب اس کو بطور برگِ سبز عاشقانِ رسول مقبول ﷺ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ ہدیہ بھی جناب مصطفوی ﷺ میں خلعتِ قبول سے مشرف ہوگا۔"

یاد رہے کہ انہوں نے خواب میں حضرت بصیریؒ کے مفلوج جسم پر حضور ﷺ کے صرف دستِ مبارک پھیرنے کا ذکر ہے' چادر عطا کرنے کی بات نہیں ہے۔ جبکہ بعض تذکروں میں اپنی چادر مبارکِ بصیریؒ کے کندھوں پر یا بصیریؒ ہی کی چادر ان کے جسم پر ڈالنے کا ذکر ہے۔ اقبالؒ نے بھی لکھا ہے۔

اے بصیری را ردا بخشیدہ ۔۔۔ بربطِ سلمیٰ مرا بخشیدہ

بطور نمونہ ان کے منظوم ترجمے کا پہلا باب درج ذیل ہے جس کا عنوان ہے "رسول اللہ ﷺ کی محبت میں"۔

اشک خونیں آنکھ سے بہتے ہیں تیری دمبدم ۔۔۔ آرہے ہیں یاد کیا ہمسایگان ذی سلم

یا صبا لائی ہے سمت کاظمہ سے کچھ پیام ۔۔۔ کوند میں بجلی کی یا دیکھا کہیں کوہ اضم

روکنے سے ورنہ کیوں رکتے نہیں یہ تیرے اشک ۔۔۔ بیقرار ایسا ہے کیوں؟ تیرا دل پُردرد و غم

کیوں چھپاتا ہے؟ کبھی چھپنے نہ دیں گے راز عشق ۔۔۔ یہ دو غماز اشک خوں آمیز و قلبِ مضطرم

زخمی گر شمشیر انگشتِ حنائی کا نہیں ۔۔۔ مثل بسمل کیوں تپاں؟ ہے کیوں تجھے آرام کم

فائدہ انکار سے کیا! آنکھیں اور چہرہ ترا ۔۔۔ کھولے دیتے ہیں علی الاعلان تیرا سب بھرم

ہاں! خیالِ زلف نے مجھ کو جگایا رات بھر ۔۔۔ سونے کب دیتا ہے مارِ عشق کا نیشِ الم

ناصحا! بہر خدا کر معذرت میری قبول ۔۔۔ بس' نہ کر ہرگز بلند اتنا ملامت کا علم

ہو گیا ہے راز میرا فاش ہر غماز پر ۔۔۔ درد کا درماں ہے میرے اب جہاں میں کالعدم

ہے نصیحت تیری بیشک خیر خواہانہ تمام ۔۔۔ کان عاشق کا مگر سنتا نہیں پند و حکم

ناصح کافی تھا میرے واسطے موئے سفید ۔۔۔ لینے آیا تھا مجھے یہ قاصد ملکِ عدم

آخر میں "عرض مترجم" بھی ہے جو درج ذیل ہے۔

نام لیوا تیرے اب، گو ہیں مسلماں نام کے — پر نہیں تیری محبت دل میں کچھ ان کے بھی کم
دیکھ اب بھی تو عیاں ہیں تیری راہ شوق میں — دشت میں اور کوہ میں عشاق کے نقشِ قدم
ان میں سے سب سے ہے ادنیٰ اور احقر اور اذل — اس قصیدے کا مترجم، عار انفار و خدم
یاوہ گوئی میں ہمیشہ عمر ضائع جس نے کی — کی کبھی دشمن کی غیبت کی کبھی یاروں کی ذم
خدمتِ اربابِ دنیا میں رہا مشغول وہ — عاقبت کی فکر کی ہرگز نہ اس نے ایک دم
کارہائے دنیوی کرتا رہا اور جہل سے — آخرت کے کام کو سمجھا کیا ہیچ سَلَم
پھنس رہا ہے ہر طرف سے نفس کے پھندے میں وہ — کوہ سے اونچے ہیں گرد اس کے گناہوں کے اثم
نفس سرکش اس کا پر اب بھی نہیں آتا ہے باز — قبر میں لٹکے ہوئے ہیں اس کے گو دونوں قدم
آسرا بالکل نہیں آتا نظر اس کو کہیں — یاس کے سنتا ہے جب ہر سمت سے صوت و نغم
چھوڑ کر ارثِ توکل اور قناعت کا عروج — حرص سے دائم رہا جویائے دینار و درم
ہاں مگر، باقی شفاعت کی تری امید ہے — تو نے فرمایا کریں گے بخش گنہگاروں کی ہم
ہے ترا ہم نام، گو اس نام کا شایاں نہیں — نام ہو جس کا محمد ﷺ حشر کا کیا اس کو غم
نیز ہے ہم نام اس کا جس نے امت کیلئے — کربلا میں خط شفاعت کا کیا خوں سے رقم
گو ضرورت کچھ نہیں پر عرض کر دیتا ہے یہ — نسبت اس کی ہے ترے صدیقؓ سے بھی منتظم
ثانی اثنین جس نے ہو کے فانی فی الحبیب — محو کر ڈالا تھا اپنے جان و تن کو یک قلم
نسبت اس کی اس لئے تجھ سے نہیں ہے غیر بھی — گو ترے نزدیک سب یکساں ہیں اولاد و خدم
آپ تو وہ ہیں کہ کرتے درگزر بوجہل سے — بدنصیب آکر اگر، کرتا سر تسلیم خم
آپ کے خلق و محبت سے نہیں ہرگز بعید — ہو جو عارف پر عنایت سے کبھی چشم کرم
یعنی کھچ جائیں طنابیں دشت و دریا کی تمام — حکم حق سے پاس ہو جائیں مدینہ اور ہم
ہو کے حاضر دست بستہ جالیوں کے سامنے — عرض حال اپنی زباں سے خود کروں بے بیش و کم

درج بالا اشعار میں تو مترجم نے اپنی کیفیات کو نظم کر دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی اس منظوم ترجمے میں اشعار بھی اصل کے مقابلے میں کم ہیں اور بعض موضوعات بھی موجود نہیں ہیں۔ اس ترجمے میں درج ابواب کے عنوانات یوں ہیں: قول ناصح، جواب عاشق، مذمت نفس، گریزبہ نعت، شب میلاد رسول ﷺ، معجزات، معراج، فرقان حمید، جہاد، صحابہؓ اور ان کی تکمیل۔ چونکہ عربی متن نہیں ہے اور اردو اشعار مسلسل ہیں اس لئے ترتیب میں الجھاؤ سا نظر آرہا ہے۔

۲۔ الشعر ارد الفردہ علیٰ قصیدۃ البردہ

مولانا سید محمود علی پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ

مترجم کا نام سید محمد علی لکھا جا رہا ہے جو درست نہیں جبکہ جناب غوث میاں نے مجلّہ نعت نمبر میں ۱۹۸۶ء میں ملتان سے چھپنے والے ایک منظوم اردو ترجمے کا ذکر کیا ہے جو سید محمود علی کا لکھا ہوا ہے۔ میرے پیش نظر کتب خانہ افکاریہ پشاور کا مطبوعہ نسخہ ہے جس پر ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء کی تاریخ ہے۔ اس سے قبل یہ قصیدہ ۱۳۵۰ھ / ۱۹۳۱ء میں جالندھر سے چھپا تھا۔ زیر نظر نسخے میں اردو کے ساتھ فارسی میں بھی منظوم ترجمہ ہے۔ لفظی اور معنوی تشریحات بھی ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ میں :

"ایک دن تنہائی میں نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے دل میں کچھ دُنیوی افکار تھے کچھ سیاہ کاری کا افسوس رسول کریم ﷺ کا واسطہ دے کر التجا کرنا چاہتا تھا کہ قصیدہ بُردہ کے چند نعتیہ اشعار زبان پر آئے۔ مضمون پر دل قربان ہوا۔ الفاظ پر زبان نثار ہوئی۔ بار بار پڑھتا اور لطف اٹھاتا رہا۔ اضطراب نے اُمید کی صورت پکڑی کہ ایسا ہے تو عاصیوں کو مایوسی کی وجہ نہیں' دل نے تاکید کی کہ اسی دروازہ کو پکڑو اور یہی صدا کئے جاؤ۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ مضمون کے نور علیٰ نور ہونے میں کلام نہیں' الفاظ کی تاثیر سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ بندش فصیحانہ ہے' ترکیب چست ہے' درد مند دل سے نکلے ہیں' روزانہ تلاوت میں سینکڑوں' ہزاروں مردانِ خدا کی زبان پر آئے ہیں۔ ہر دل کے درد سے اور ہر زبان کے اثر سے متاثر ہوئے ہیں اس سے زیادہ فضیلت کیا ہوگی اگر یہی مضمون اور الفاظ میں ادا ہو تو غالباً اثر ایسا نہ ہو مگر کوئی ترجمہ مل جائے تو دیکھنا چاہئے کیسا ہوگا۔

ہم جیسے غفلت شعاروں کو شوق کے ایسے ایسے ولولوں کا تجربہ تو بہت ہے لیکن بالعموم فوری جوش ہوتا ہے جو آیا اور گھڑی بھر میں فنا ہو گیا۔ یہ خیال ایسا دامنگیر ہوا کہ منظوم ترجمہ کی چینٹک سی لگ گئی ایک فارسی ترجمہ قصیدہ کے ساتھ چھپا ہوا بازار میں ملتا ہے وہ دیکھا۔ ایک بزرگ نے پنجابی میں ترجمہ کیا ہے اس کا قلمی نسخہ دستیاب ہوا مگر دونوں میں شوق ہی شوق تھا شاعریت نہ تھی تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگایا۔ دل کو تسکین نہ ہوئی۔

خواجہ نظامی علیہ الرحمۃ کی رُوح کو خدا جانے اس میں کیا دلچسپی تھی کہ سکندر نامہ کے دو شعر زبان پر جاری کر دیئے ۔

چو از ران خود خورد باید کباب   چہ گردم بدر یوزہ چوں آفتاب

نشینم چو سیمرغ در گوشہ   دہم گوش را از دہن توشہ

یہ تو نہیں کہ کبھی شعر کہنے کا اتفاق ہی نہ ہوا ہو۔ احباب میں اس کا چرچا دیکھا یا کسی خاص خیال نے دل پر خاص اثر کیا تو چند کلمات موزوں ہوتے رہے ہیں مگر طبیعت میں شاعریت اور مزاج میں ایسا ولولہ کبھی نہیں رہا کہ اس کام کی مشق اور نظم پر قدرت حاصل ہو۔ میں اپنی خواہش سے یہ ارادہ کر ہی نہ سکتا تھا کہ نظم کو نظم میں ترجمہ کرنے کے مشکل کام پر ہاتھ ڈالوں مگر نظامی کے اشعار نے ترغیب دی اور غور کیا تو اسی وقت ایک دو شعر کا مطلب فارسی میں اور پھر وہی مضمون اردو میں ادا ہو گیا۔ شوق مہمیز کرتا رہا طبیعت رستہ پر لگی رہی' خریدارانِ یوسف میں بڑھیا کا فرض ادا کرنے اور مداحین دربار رسالت کے زمرہ میں شمار ہونے کی سعادت مقدر تھی' کچھ عرصہ میں دونوں قصیدے تیار ہو گئے۔"

مولانا سید محمود علی جالندھری کا نسبی تعلق دہلی کے ایک ایسے خاندان سے تھا جس کا زہد و اتقاء اور علم و بصیرت مسلم تھی۔ قصیدہ بردہ کی فصل دوم کا درج ذیل منظوم اردو ترجمہ پروفیسر سید محمود علی ہی کے رشحات خامہ سے ماخوذ ہے۔ اس فصل کا عنوان ہے "اپنے آپ کو خواہش نفسانی سے روکنے میں"۔

ہے بدی پر نفس کو اصرار کچھ سنتا نہیں ... اس کو سمجھاتی ہے پیری جس قدر سود و زیاں
نیکیوں سے دعوت اس ناخواندہ مہماں کی نہ کی ... موئے سر جس کے اترنے کے لئے ہے نردباں
شان پیری کو چھپا رکھتا میں وسمہ سے ضرور ... گر خبر ہوتی کروں گا اس کو رسوائے جہاں
روکتے ہیں تیز گھوڑے کو دہانہ سے مگر ... کون روکے نفس سرکش کی مرے طغیانیاں
کثرت عصیاں بدی سے سیر کردے' یہ غلط ... اشتہا ہو گی بہت کھانے سے زائد بیگماں
نفس بچہ ہے جو روکو دودھ سے رک جائے گا ... ورنہ ہو گا شیر خواری ہی کی حالت میں جواں
روک دل کو ورنہ طغیانِ ہوائے نفس کا ... ہے نتیجہ یا ہلاکت یا کوئی بھاری زیاں
اس کو چرنے دے چراگاہ تمنا میں مگر ... جس جگہ پانے لگے لذت بدل دے وہ مکاں
نوش میں بھی نیش ہوتا ہے نہیں دل کو خبر ... اس کو لذت سے غرض ہے گرچہ ہو نقصان جاں
وسوسہ سیری سے ہو یا بھوک سے بچنا ضرور ... بھوک سے جو ہیں کہاں سیری سے وہ بدنامیاں
جب نظر جائے بدی پر آنکھ سے جاری ہوں اشک ... اور دل ہو آتش جوش ندامت سے تپاں
نفس و شیطاں کو سمجھ دشمن نہ مان ان کو کبھی ... کہ نہ باور مخلصی اپنی کریں کتنی عیاں
ہوں فریق حث یا منصف بنیں' ہرگز نہ مان ... کرتے آئے ہیں یونہی اہل غرض چالاکیاں
کیا معاذ اللہ قول بے عمل سے فائدہ ... بانجھ سے امید کیا باقی رہے گا خانداں
جب نہیں اپنا قدم ثابت کہا اوروں کو کیوں ... نیکیوں کا وعظ کیا جب خود نہ کیں کچھ نیکیاں
فرض سے زائد نہ ہرگز ہو سکا روزہ نماز ... کیں نوافل سے نہ زادِ راہ کی تیاریاں

۳۔ قصیدہ بردہ شریف : محمد فیاض الدین نظامی بہزاد دکن

یہ قصیدہ تاج کمپنی کراچی نے مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ کے معروف منظم فارسی ترجمے کے ساتھ بڑے اہتمام سے ۱۹۵۷ء میں چھاپا تھا۔ جناب فیاض نظامی نے اپنی اس کاوش کو حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ سے منسوب کیا ہے اور ابتدا میں خواجہ حسن نظامیؒ ہی کا پیش لفظ بھی ہے۔ انہوں نے مترجم کا تعارف اپنے مخصوص انداز میں یوں کرایا ہے :

"بہزاد دکن نظامی کا سب سے بڑا تعارف تو یہ ہے کہ وہ عاشقِ رسول ﷺ ہیں۔ دوسرا تعارف یہ کہ ان کا عشق حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے چرواہے کا عشق نہیں ہے۔ وہ آرٹسٹ ہیں، ہندوستان کے مایہ ناز آرکیٹکٹ اور ٹاؤن پلانر، جن کے جذب اندروں کی نمائش موئے قلم کی گردش سے مسلسل ہوتی رہتی ہے لیکن یہاں آکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عاشق آرٹسٹ ہو یا چرواہا جب وہ عشق کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو قاعدے قانون کی کتاب بند ہو جاتی ہے۔ موئے قلم اپنی مرضی کے تابع نہیں رہتا اور چاک دامانی میں سب برابر ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بہزاد دکن کا سا عشق عطا فرمائے۔"

اور مترجم کے اپنے الفاظ میں :

"اس قصیدہ کو میں نے ۱۹۵۶ء میں مسجد نبوی ﷺ کی چھت کے گنبدوں میں نہایت خوش خط لکھا ہوا دیکھا ہے۔ اس سے اس قصیدہ کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ یہ قصیدہ اپنی ادبی لطافتوں اور نزاکتوں اور سلاست و روانی کے قطع نظر خاص خصوصیات اور بڑے ہی فیوض و برکات کا حامل ہے اور جن حالات میں یہ قصیدہ شریف لکھا گیا اس کی وجہ سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے ــــــــ ۱۹۶۰ء میں دوسری مرتبہ جب کہ میں حرمین الشریفین میں حج و زیارت کی غرض سے حاضر ہوا تھا تو الحمد للہ مجھے بھی اپنے اردو ترجمے کو بارگاہ نبوی ﷺ میں شروع سے آخر تک گزارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ خدا کرے کہ میرے اس ترجمے کو سرکار کے دربار سے شرف قبولیت عطا ہو اور یہ بھی عربی اور فارسی کی طرح برکتوں کا حامل ہو جائے۔ آمین۔"

فیاض کا یہ منظوم اردو ترجمہ فنی اعتبار سے معتبر، علمی لحاظ سے قابل قدر اور روحانی نقطہ نظر سے دل نشین ہے۔ اسی لئے یہ ترجمہ نسبتاً زیادہ مشہور ہے اور تذکروں میں عموماً اسی کا حوالہ ملتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ اس منظوم اردو ترجمے کو بھی مترجم نے حضور ﷺ کی بارگاہ بندہ نواز میں ذاتی طور پر پیش کیا تھا اور اسی وجہ سے اسے قبول عام کا شرف بھی نصیب ہوا ہے۔ قصیدہ بُردہ کی تیسری فصل کا منظوم اردو ترجمہ جو حضور ﷺ کی مدحت سے متعلق ہے بطور نمونہ نذر قارئین ہے اور اس سے فیاض نظامی کی شعری عظمتوں کا بھی خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اس نبی کی پاک سنت پر کیا میں نے ستم — تھا قیام شب سے جن کے پائے نازک پر ورم

بھوک کی شدت کے باعث اور فاقوں کے سبب — آپ نے پتھر سے باندھا ناز پروردہ شکم

بن کے سونے کے پہاڑ آئے کہ مائل ہوں حضور — کچھ توجہ تک نہ کی' تھے آپؐ وہ عالی ہمم

ایسی حاجت پر بھی تقویٰ کو کیا مضبوط تر — سچ ہے حاجت غالب آسکتی نہیں اوپر عصم

کیا کرے مائل ضرورت ان کو دنیا کی طرف — گر نہ ہوتے آپ تو دنیا بھی ہوتی کالعدم

یا محمد ﷺ دو جہاں کے آپ ہی سردار ہیں — شاہِ جن و انس بھی اور مہتر عرب و عجم

آمر و ناہی پیمبر میں نہیں ان کا جواب — ہیں نہایت صاف گو وہ قول لاھو یا نعم

وہ حبیب ایسے ہیں جن سے ہے شفاعت کی امید — وقت ہول و خوف میں پیش آئیں گے جب رنج و غم

دعوت حق آپ نے دی اور کیا جس نے قبول — ایسی رسی اس نے پکڑی جو نہ ہوگی منفصم

سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے خلق میں اور خلق میں — انبیاء میں سب سے اکمل آپ کا علم و کرم

انبیاء سب ملتمس ہیں تاکہ مل جائے انہیں — ایک چلو بحر سے یا قطرہ از ابر کرم

اپنے حد مرتبہ پر سب کھڑے ہیں روبرو — جیسے نقطہ حرف میں اعراب لفظوں میں بہم

صورت و سیرت میں ہیں سرکار عالی مرتبت — اس لیے ان کو کیا حق نے حبیب محترم

کوئی عالم میں نہیں ان کا محاسن میں شریک — حسن میں جوہر ہے اس کا فرد کل لا ینقسم

جو نصاریٰ نے کہا عیسیٰ کے حق میں تو نہ کہہ — اور جو ممکن ہو کر مدح نبی محترم!

جو شرف ہو ذات اقدس کی طرف منسوب کر — جتنی عظمت چاہئے کر شان والا میں رقم

حد نہیں ہے کوئی حضرت کے کمال و فضل کی — ہو بیاں کس منہ سے توصیف شہ خیر الامم

ان کی عظمت کے مطابق معجزے ہوتے اگر — نام ان کا زندہ کرتے استخواں ہائے رمم

باز رکھا امتحاں سے جس نے عاجز فہم کو — مہربانی کی نہ چھٹے یوں شک و حیرت سے ہم

سر باطن کی حقیقت نے کیا خلقت کو دنگ — دور سے نزدیک سے ہر طرح ہے مجبور مبہم

وہ ہیں مثل شمس جو ظاہر ہو چھوٹا دُور سے — اور آنکھیں قرب سے ہوتی ہیں خیرہ ایک دم

اہل دنیا کس طرح ان کی حقیقت پا سکیں — خواب غفلت میں ہیں گویا قوم خوابیدہ ہیں ہم

انتہائے علم کہتی ہے وہ ہیں خیر البشر — جملہ مخلوقات میں رکھتے ہیں وہ شان اتم

جو رسولانِ جلیل القدر کے تھے معجزے — آپ ہی کے نور سے پایا تھا سب نے یہ کرم

آفتاب فضل میں وہ اور ستارے سب رسل — کرتے ہیں ظلمت میں ظاہر سب پہ انوار کرم

ہو گیا خورشید طالع اور ہوا روشن جہاں — آپ کے نور ہدایت سے ہوئیں زندہ امم

کیا عظیم الخلق ہے صورت مزین خُلق سے
حسن صورت مشتمل ہے خندہ روئی سے بہم

تازگی میں ہیں وہ غنچہ اور شرف میں مثل بدر
دہر میں ہمت میں اور بخشش میں دریائے کرم

ہیں جلال و رعب میں سرکارؐ عالی بے نظیر
جیسے گرد و پیش رکھتا ہے کوئی فوج و حشم

ہیں وہ دندان مبارک مثل موتی سیپ میں
معدن نطق و تبسم ہے وہ دہن محترم

ہے وہ خوش قسمت جو سونگھے اور بوسہ دے اُسے
بے بدل خوشبو ہے' خاک تربت شاہ امم

۴۔ اردو قصیدہ بردہ۔ عبداللہ ہلال صدیقی

یہ منظوم اردو ترجمہ ۱۹۷۰ء میں کراچی سے چھپا۔ بقول جناب کریم بخش خالد (مدیر ماہِ نو):

"محترم عبداللہ ہلال صدیقی کے منظوم اردو ترجمہ کو بہت سے علماء اور دانشوروں نے سراہا ہے کیونکہ یہ ترجمہ مختصر' بامحاورہ اور بامعنی ہے۔ ہلال صاحب نے اس ترجمے میں اردو کی لطافت اور اس کے مزاج کا خیال رکھا ہے جس سے کہیں کہیں اظہار بیان میں معمولی سا فرق تو نظر آتا ہے لیکن اس سے قصیدے کی عبارت کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔"

قصیدہ بردہ کی چوتھی فصل کا منظوم اردو ترجمہ جناب عبداللہ ہلال صدیقی ہی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔ چوتھی فصل ولادت باسعادت سے متعلق ہے۔

اے خوشا لایا زمانہ کیا ہی پاکیزہ وہ ذات
پاک ہیں دونوں زمانے کیا ولادت کیا وفات

اہل فارس کی سمجھ میں خوف اسی دن آگیا
ملک قوم اور سلطنت پر اب عذاب آنے کو تھا

قصر وہ نوشیرواں کا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا
مجتمع وہ لشکر کسریٰ نہ جب سے پھر ہوا

آگ نے ان پر بصد افسوس ٹھنڈی سانس لی
بھول کر منبع کو دریا نے روانی چھوڑ دی

اہل ساوہ غمزدہ تھے خشک پانی ہو گیا
جو بھی پیاسا آگیا وہ خشمگیں واپس ہوا

آگ میں ایسی نمی' پانی وہ جیسے غم میں تھی
خاصیت پانی میں تھی گویا لپکتے شعلوں کی

چیخ اٹھے جنات ہر لحہ بلندی پر تھا نور
یوں امور ظاہر و باطن سے تھا حق کا ظہور

منکروں کی کھولی بینائی' سماعت بھی گئی
خوف کی بجلی دکھائی دی نہ خوشخبری سنی

وہ نہ مانے گرچہ ان کے کاہنوں نے بھی کہا
اُن کے دین کج کے مٹ جانے کا اب وقت آگیا

دیکھتے حالانکہ شعلے آسماں میں چھوٹتے
منہ کے بل گر گر کے بت جیسے زمیں پر ٹوٹتے

بھاگنا حتی کہ راہ وحی سے شیطان کا
پیش قدمی میں وہ عالم تھا عجب بحران کا

تھا وہ گویا ابرہہ کے سورماؤں کا فرار
یا فرار ان کا' تھی جن پر آپ کے کنکر کی مار

کنکر ان کے ہاتھوں سے یوں تسبیح پڑھ کر جاگرے
جیسے یونسؑ ورد میں مچھلی کے منہ سے جاگرے

۵۔ شرح قصیدہ بردہ ۔ مولانا علامہ محمد نور بخش توکلی

یہ شرح نوری بک ڈپو بازار داتا صاحب لاہور سے پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں لغوی اور فکری تشریح کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کن کن اشعار کو کس کس انداز سے کس کس مقصد کے لئے پڑھنا چاہئے کیونکہ اس قصیدے کی فیوض وبرکات کو مسلمات کی حد تک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ اس قصیدے میں پروفیسر محمد سعید دہلوی (جن کے حالات زندگی نہیں مل سکے) کا منظوم اردو ترجمہ بھی ہے بطور نمونہ پانچویں فصل کا منظوم ترجمہ درج ذیل ہے جو دعوت سے متعلق ہے۔

سجدہ کرتے آگئے اس کے بلانے پر درخت
چلتے تھے اپنے تنوں سے گو نہ تھے ان کے قدم

راہ میں دی کھینچ اس نے پہلے اک سیدھی لکیر
لکھ دیا شاخوں نے پھر خط غلامی خوش قلم

مثل بادل کے جہاں جاتا تھا، جاتے تھے درخت
تاکہ گرمی کی تپش اس کو نہ پہنچائے الم

وہ شق نسبت اس کے قلب سے رکھتا ہے خاص
کہتا ہوں سچ کھا کے والشق القمر کی قسم

گھر لیا خیر و کرم کو جمع غار ثور نے
ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں ہو گئیں بالکل بچم

صدق اور صدیق تو دونوں جمے بیٹھے رہے
اور کہتے تھے یہاں کوئی نہیں، اعداء بہم

وہ یہ سمجھے یاں نہ منڈلاتے کبوتر اور نہ یاں
جالا تنتیں مکڑیاں ہوتے اگر خیر الامم

دہری دہری زرہوں سے اور اونچے اونچے قلعوں سے
کردیا مستغنی ان کو حق نے، تھا اس کا کرم

کب ستم دہر ستم کرتے کیا مجھ پر کہ میں
ہو گیا لے کر پناہ اس کی نہ محفوظ از ستم

دولت دو دنیا دیں مانگی نہ اس سے میں نے کب
جو ملی مجھ کو نہ اس فیاض سے بے فکر و غم

اس کی وحی خواب سے منکر نہ کر انکار تو
آنکھیں سوتی تھیں تو کیا، رکھتا تھا قلب لم ینم

ہے نبوت پر پہنچنے کے زمانے کی یہ بات
وحی خوابی سے بھرے انکار کا کون دم

حاشاللہ وحی گر ہو اکتسابی کوئی شے
یا کہ علم غیب میں کوئی نبی ہو متہم

چھو کے اس نے بارہا بیمار کو اچھا کیا
اور اسیران الم کی کاٹ دی قید الم

کردیا اس کی دعا نے زندہ سال مردہ کو
خشک سالی نے بھی مارا پھر تو شادابی کا دم

ابر باراں کی سخا سے وادیوں پر تھا گماں
ہے رواں سیل عرم ان میں دیا سیلاب یم

۶۔ قصیدہ بردہ۔ ڈاکٹر مہر عبدالحق

ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، ڈبلیو پی۔ای سی (ریٹائرڈ)

اس قصیدے میں فارسی، سرائیکی اور اردو کے منظوم ترجمے کے ساتھ انگریزی کا سادہ ترجمہ

بھی ہے۔ فرہنگ' فضائل و آداب تلاوت اور اشخاص واماکن سے متعلق اشاریہ بھی ہے۔ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ کے الفاظ میں :

"ملتان کی مشہور و معروف علمی وادبی شخصیت جناب ڈاکٹر مہر عبدالحق 'پی۔ایچ۔ڈی نے سلیس فارسی اور اردو زبان میں قصیدہ بردہ شریف کا منظوم ترجمہ کیا ہے اور ساتھ ہی انگریزی میں بھی اس کے مطالب بیان کیے ہیں۔اس طرح آپ نے صرف علمی وادبی خدمت ہی انجام نہیں دی بلکہ فاضل مولف نے تعلیم یافتہ طبقہ کو قصیدہ بردہ شریف کی عظمت اور اس کے ظاہری و باطنی محاسن سے روشناس کرا کے بہت ہی نفیس انداز میں انہیں عشق و محبت رسول ﷺ کا درس بھی دیا ہے۔"

یہ قصیدہ ۱۹۷۸ء میں سرائیکی ادبی بورڈ حسن پروانہ روڈ ملتان سے شائع ہوا تھا۔یہ اپنی نوعیت کی واحد کاوش ہے جس میں مولا کریم نے ایک ہی شخصیت کو توفیق بخشی کہ وہ تین منظوم اور ایک عام ترجمے کے ساتھ ساتھ قصیدہ بردہ کے فکری' لغوی اور روحانی پہلوؤں کا بھی جائزہ لے۔ڈاکٹر مہر عبدالحق کے اپنے الفاظ میں :

"قصیدہ بردہ کی تعریف و توصیف اکثر و بیشتر بزرگانِ دین اور اساتذہ کرام کی زبانی سنی تھی۔اس کی فصاحت و بلاغت' شگفتگیٔ بیان اور تاثیر کلام سے متعلق بھی بہت سی روایات پہنچی تھیں لیکن اس کے پڑھنے' سمجھنے یا اس سے استفادہ کرنے کا موقع نصیب نہیں ہوا تھا۔ ۲۴ر اگست ۱۹۷۷ء کو اچانک میرے نظام تنفس میں خرابی پیدا ہو گئی اور اتنی شدت اختیار کر گئی کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ دل کے براہِ راست متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے چار پانچ ماہ تک ذہنی اور جسمانی محنت سے مکمل اجتناب ضروری ہے چنانچہ روزمرہ کے معمولات پر پابندی لگ گئی۔ چلنا پھرنا موقوف ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے کی عمر بھر کی عادت جو طبیعت ثانیہ بن چکی تھی جبراً چھڑوا دی گئی۔عام غذا سے پرہیز کسی حد تک گوارا تھا لیکن سگریٹ اور حقے کا شجر ممنوعہ قرار دیا جانا بہت صبر آزما تھا۔لہٰذا ذہنی کوفت سے نجات دلانے کے لئے مسکن ادویات کا سہارا لیا گیا جن کے زیر اثر مجھے طوعاً و کرہاً نیند کی آغوش میں چلا جانا پڑتا۔شام کے قریب آنکھ کھلتی۔ گھر والے روزہ افطار کر رہے ہوتے اور ٹیلی ویژن پر ایک بہت ہی باخبر' عالم و فاضل بزرگ پانچ منٹ کے لئے "آج کا دن" کے عنوان پر تقریر فرما رہے ہوتے چونکہ ان کی تقریر کا موضوع ان واقعات کا بیان کرنا تھا جو رمضان المبارک کی متعلقہ تاریخ کو عالم اسلام میں رونما ہوتے تھے'اس لئے میں ان کی مختصر مگر پر مغز تقریر کو پورے انہماک سے سنتا تھا۔ایک دن انہوں نے علامہ بوصیریؒ کے حالات زندگی بیان کئے اور ان کے شہرہ آفاق "قصیدہ بردہ" کے فضائل گنوائے۔جب انہوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس عظیم قصیدے کے ترجمے دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں لیکن انگریزی میں کوئی قابل قدر ترجمہ موجود نہیں ہے تو معاً میرے

دل میں خیال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ توفیق ارزانی فرمائے تو یہ کام میں ہی کیوں نہ مکمل کر لوں۔ ترجمہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ خاص طور پر عربی زبان کی فصاحت و بلاغت کو انگریزی یا کسی بھی دوسری زبان میں منتقل نہیں کیا جا سکتا لیکن عشق مشکلات کے بحر عمیق کو بھی پایاب بنا دیتا ہے۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔"

قصیدہ بردہ کی چھٹی فصل قرآن پاک کے فضائل سے متعلق ہے۔ ان کا منظوم اردو ترجمہ دیکھیے کہ ڈاکٹر مہر عبدالحق نے کس انداز سے عربی متن کو اردو شعر کا آہنگ دیا ہے۔

کرنے دو مجھ کو بیاں اوصاف آیات مبیں — جو سر کوہ انار دعوت کی طرح روشن ہوئیں
موتی خواہ بکھرے ہوئے ہوں تو بھی کم قیمت نہیں — ہار میں ہوں منسلک تو اور ہو جائیں حسیں
ہو گئیں مدحت سرا کی سب امیدیں سربلند — اس نے جب دیکھے فضائل اور خصائل ارجمند
آئی ہیں رحمان سے آیات قرآن عظیم — ہیں صفت موصوف کی یہ اس لئے ہیں یہ قدیم
گو زمانوں سے نہیں کچھ بھی ملاپ ان کا مگر — دیتی ہیں عاد و ارم اور آخرت کی یہ خبر
پست ہیں قرآن سے کل انبیاء کے معجزے — تا ابد ہے یہ ہمارے پاس وہ دائم نہ تھے
قول فیصل، مستقل، بے نقص اور بے اختلاف — یہ نہیں محتاج ثالث 'شک سے بھی ہیں پاک و صاف
سخت سے بھی سخت دشمن جب ہوا جنگ آزما — صلح کرنے میں بچاؤ دیکھ کر پسپا ہوا
رد کرے ان کی بلاغت یوں معارض کا فتور — گھر کو جیسے چشم بد سے دور رکھتے ہیں غیور
ہیں معانی موج دریا متصل باہم دگر — حسن و قیمت میں ہیں دریا کے گہر سے بیش تر
ان عجائب کا جمع کرنا یا گننا ہے محال — جتنی کثرت سے خریدو گے نہ آئے گا ملال
قاری کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی تو میں نے کہا — تھام لے اللہ کی رسی تو مظفر ہو گیا
آتش دوزخ کے ڈر سے بھی جو تو ان کو پڑھے — بے شبہ بجھ جائیں شعلے ان کے آب ورد سے
حوض کوثر کی طرح دھو ڈالیں گی تیرے گناہ — کوئلے جیسا بھی ہو گرچہ ترا چہرہ سیاہ
عدل میں ہیں یہ ترازو اور مثل راہ خیر — لوگوں میں انصاف ہو سکتا نہیں ان کے بغیر
حاسد عاقل ہے ان آیات کا منکر اگر — یہ تجاہل عارفانہ ہے' تعجب تو نہ کر
آنکھیں ہوں سوجی ہوئی تو کیسا نور آفتاب — میٹھا پانی کڑوا لگتا ہے اگر منہ ہو خراب

۷۔ قصیدہ بردہ شریف مع منظوم ترجمہ۔ حکیم حید امرتسری

یہ خوب صورت منظوم اردو ترجمہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ کیونکہ محققین کے ہاں اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا (احقر کے محدود مطالعہ کے مطابق) یہ ترجمہ ماہنامہ "سلسبیل لاہور" کے دسمبر ۱۹۸۵ء

کے شمارے میں چھپا تھا۔ مترجم کے حالات زندگی احقر کو نہیں مل سکے۔ عین ممکن ہے کہ یہ کتابی شکل میں موجود ہو اور وہیں سے "سلسبیل" نے اخذ کیا ہو مگر رسالے میں ایسا کوئی حوالہ نظر نہیں آتا۔ اس نادر ترجمے کو بہر کیف محفوظ ہونا چاہیے۔ اسی لئے قصیدے کے باقی ماندہ چار ابواب بطور نمونہ اسی سے نقل کر رہا ہوں جو بالترتیب معراج، جہاد، شفاعت و مغفرت اور مناجات و عرض حاجات سے متعلق ہیں۔

ساتویں فصل آنحضور ﷺ کے معراج کے بیان میں

اے کہ ہے خیر المنازل اس جہاں میں تیرا در
دوڑتے آتے ہیں ہر جانب سے اشراف و امم

اے کہ تو سب سے بڑی آیت ہے ذات پاک کی
اور ہے سب سے بڑی نعمت ترا نقش قدم

لے گئے تشریف کعبے سے اندھیری رات میں
تھے ہلال اور اس سفر سے بن گئے بدرِ حرم

ارتقائی منزلیں طے کر کے پہنچے ذات تک
عقل کی یہ دسترس میں راز آسکتا ہے کم

انبیاء اور اولیاءؑ ہیں سب کے سب زیر لوا
اور رسولوں کے، فرشتوں کے ہیں سر زیر قدم

چیر کر ساتوں فلک آگے گئے سورۃ تلک
جس طرح لشکر میں سب سے آگے ہو صاحب علم

بڑھ گئے آگے ہر اک بڑھ جانے والے سے حضور
ہو گئے نزدیک تر ذاتِ خدا سے ایک دم

ہر مکاں نیچے رہا جیسے کہ ہو حرفوں کی زیر
خود ہوئے اونچے الف کی شکل مانندِ علم

ہو گئے واصل خدا کی ذات سے اور شان سے
راز آنکھوں پر ہوئے ظاہر جو مخفی تھے بہم

فخر و عزت کا بلا شرکت ہوا حاصل مقام
پہنچے اس جا پر جہاں کوئی نہ لے سکتا تھا دم

مل گئے وہ مرتبے جو تھے نہایت ہی بلند
جو سمجھ میں ہی نہ آئے وہ ملا عز و نعم

ہو مبارک تا قیامت ہر مسلماں کے لیے
وہ ستوں ہم کو ملا جو ہو کبھی نہ منہدم

دی خدا نے آپ کو آواز طاعت کے لیے
ہے رسول اکرمؐ ہمارا اور ہم خیر الامم

آٹھویں فصل آنحضور ﷺ کے جہاد کے بیان میں

ڈر گئے دل کافروں کے آپ کی بعثت کے وقت
جیسے بکری شیر سے ڈرتی ہے تنہا بے غنم

معرکوں میں سب سے آگے آپ خود ہوتے تھے جب
دشمنوں کے پاؤں پھر میداں میں کب سکتے تھے جم

بھاگتے تھے لشکر کفار ان کے خوف سے
اور لاشوں سے درندے بھرتے تھے اکثر شکم

دن گزرتے اور راتیں بھی گزرتی تھیں یونہی
جنگ رک سکتی نہ تھی جب تک نہ ہو شہر حرم

دین اسلام ان کے ہاں مہمان کی صورت میں تھا
کافروں کا گوشت تھا مرغوب تر اس کا طعم

جنگ ہے دریائے شور انگیز گھوڑوں پر سوار
مارتا ہے دشمنوں کو اپنی موجوں سے لطم

ہر مجاہد سم حق سے پیکر تسلیم تھا
بیخ و بن سے بد طرف کرتا تھا سب کفر و ظلم

تھا غریب اسلام جس کو پوچھتا کوئی نہ تھا — کر دیا قوت میں اور دولت میں الفت میں اہم

باپ ہیں اُمت کے اور بے چارگاں کے سرپرست — تربیت سے کر دیئے ہیں دور ہر رنج و الم

اور صحابہؓ قوت و شوکت میں تھے کتنے عظیم — کافروں پر شدت و غلظت میں شیران اجم

ہیں گواہ ان کی شجاعت کے احد' بدر و حُنین — منکروں کے سامنے دیوار پیچھے سے و خم

اپنی شمشیروں کو کرتے دشمنوں کے خوں سے سُرخ — کاٹتے ان کے سیہ چہروں کو تلواروں کے خم

لکھتے نیزوں کے قلم سے ان کی قسمت کے حروف — اور نقطوں کے بجائے زخم کر دیتے رقم

اسلحہ شان صحابہؓ کی علامت تھا' مگر — خارِ گل کی مثل تھا خارِ مغیلاں تھا وہ کم

فتح و نصرت کی بہاریں ہر طرف ارزاں ہوئیں — پھول امن و عافیت کے کھل رہے تھے دمبدم

بیٹھ کر گھوڑوں پر اُڑ جاتے تھے صرصر کی طرح — خواہ کتنے تیز رو ہوں پیٹھ پر جاتے تھے جم

دھاک ان کے دبدبے کی بیٹھتی تھی ہر طرف — اور بہائم کی طرح آوارہ تھے کافر بہم

جس کی نصرت پر رسول اللہ خود ہوں مستعد — اس کے آگے شیر بھی آکے سر کرتا ہے خم

دوست ان کا ان سے بیگانہ کبھی رہتا نہیں — اور دشمن رہ نہیں سکتا کبھی کوئی سلم

ہے محافظ اُن کی اُمت کا یہ ملت کا حصار — شیر کے بچے ہوں جیسے بے خطر اندر اَجَم

ہیں دلائل اور جدل میں لاجواب آیاتِ حق — ہو نہیں سکتا مقابل کتنا لائق ہو خصم

معجزہ بڑھ کر ہے سب سے یہ کہ اک اُمّی لقب — ہو فصاحت میں بلاغت میں ادب میں محتشم

نویں فصل دُعا' شفاعت اور مغفرت کے بیان میں

ہے دُعا اللہ سے مدحِ رسالتؐ کے طفیل — ہیں گنہ میرے بہت شعر و خوشامد مدح و ذم

مالِ دُنیا کی طمع' شہرت کا لالچ' حُب زر — بن گیا ان خواہشوں سے مثلِ حیوان و نعم

حرکتیں بچگانہ مجھ سے بارہا صادر ہوئیں — کچھ نہ حاصل ہو سکا ان سے بجز اثم و ندم

میں نے کی ایسی تجارت جس سے نقصان میں رہا — دین' دُنیا کے عوض بیچا یہی ہے رنج و غم

بیچ ڈالا آخرت کو جس نے دنیا کے عوض — وہ خسارے میں رہا ہو نقد سودا یا سلم

گرچہ ہوں عاصی مگر اس عہد پر قائم ہوں میں — کہ رسول اللہ کے دامن سے لپٹوں گا بہم

آپ خود ضامن ہیں میرے جبکہ ہوں اُن کا غلام — نام ہے اُن کا محمد ﷺ صاحب حمد و علم

عاقبت میں دست گیری ان کے ہاتھوں ہے مری — وہ اگر رحمت نہ فرمائیں کدھر جائیں گے ہم

حاشا اللہ ہو نہیں سکتا کبھی' ان کا غلام — لوٹ جائےاُنؐ کے در سے یونہی بے نیل و مرم

مدح ان کی جانتا ہوں فرض' اپنی فکر پر — اور پھر میری بریت کے لیے بھی ہے لزم

ان کی خاکِ آستاں پر جو ہوا سر سجدہ ریز
اس پہ رحمت کی گھٹائیں ہیں برستی دمبدم

مجھ کو دُنیا کی نہیں خواہش کہ مانندِ زُہیر
مال و دولت کے لیے کرتا نہیں مدحِ ہرم

دسویں فصل، مناجات اور عرضِ حاجات

اے کریم الخلق ﷺ! دنیا میں نہیں ملتی اماں
جز ترے در کے کہاں ملجا و ماوئے عوم

آپؐ کا فضل و کرم میرا شفیع ہو گا ضرور
جب کیا جائے گا میرا احتساب بیش و کم

آپؐ کی برکت سے ہیں دُنیا و دیں کی نعمتیں
آپؐ کے علموں سے ہیں ماخوذ یہ لوح و قلم

کیوں ہو وہ مایوس جس کے دل میں ہو حبِ نبیؐ
جب محبت سے بدل جاتا ہے شرینی میں سم

ہوتی ہیں تقسیم محشر میں خدا کی رحمتیں
جب زیادہ جرم ہوں رحمت بھی خود ہو گی اہم

اے خدا میری امیدوں کو نہ رَد فرمائیو
چاہتا ہوں میں تری درگاہ سے عز و نعم

مجھ پہ ہو لطف و کرم دنیا میں بھی عقبیٰ میں بھی
صبر کا دامن نہ چھوٹے مجھ سے ہنگامِ الم

اور اجازت دے صلوٰۃ و مدح کے بادل کو اب
زور سے برسے رسولِ پاکؐ کے روضے پہ چھم

اور ان کی آلؑ پر، اصحابؓ در اصحابؓ پر
اہل تقویٰ پاک دل اور پاک چشم اہل کرم

ہو رضا تیری ابوبکرؓ و عمرؓ پر تا مدام
اور عثمانؓ و علیؓ کانِ حیاء جانِ کرم

جب تلک چلتی رہے گلزار میں بادِ صبا
جب تلک گاتے رہیں اشعار یہ اہل نغم

بخش دے حیدرؔ کو اور سب پڑھنے والوں کو بھی بخش
ہے سوال ادنیٰ سا میرا اور تو کہہ دے نعم

ہے عرق ریزی یہ اردو دان لوگوں کے لیے
ورنہ بُوصیری کا ہے اعجاز انداز رقم

۸۔ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کا ترجمہ

جہاں تک جناب ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کے منظوم ترجمے (نعت رنگ، ۳) مطبوعہ ۱۹۹۶ء کا تعلق ہے وہ اپنی نوعیت کی غالباً اولین کاوش ہے کہ وہ نظم آزاد میں ہے جبکہ دیگر مختلف شعری ہیئتوں میں تو بے شمار تراجم موجود ہیں۔ یہ ترجمہ کم اور ترجمانی زیادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس میں ترجمے سے کہیں زیادہ تخلیق کا گمان گزرتا ہے۔ فکری جمال، شعری کمال سے ہم آہنگ ہے۔ تاثراتی گداز قلم قلم اور لفظ لفظ لودے رہا ہے۔ حق یہ ہے کہ پابند شعر کا اگر پابند انداز میں شعری ترجمہ ایک مشکل امر ہے تو اس کا آزاد نظم میں ترجمہ بھی آسان کام نہیں ہے۔ ایک خیال کو خود شعری قالب میں ڈھال لینا ایک شاعر کے لیے کہیں سہل ہے مگر نثری جملے یا کسی شعری ٹکڑے کا برمحل اور موزوں ترجمہ تخلیقی عمل سے کہیں دشوار ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اس نوع کے ترجمے بسا اوقات بے کیف اور مغلق ہوا کرتے ہیں اور مولا کریم کسی کسی قلم کو یہ توفیق عطا کرتے ہیں کہ اس کا کیا ہوا ترجمہ اصل سے کہیں زیادہ واضح اور شفاف ہوتا ہے۔ شعری ترجمہ نگاری بہر کیف ایک انتہائی مشکل فن ہے۔ اپنی سوچ کو پرائی فکر کے سانچے میں ڈھال کر ابھارنا اور نکھارنا ہر "با تخلص" کے بس کی بات نہیں ہے اور یہ دعویٰ بھی ہر ایک نہیں کر سکتا کہ۔

یہ جب شیشے میں آتے ہیں مری تحریر بنتے ہیں ترے عکسوں پہ گویا آج بھی ہے دسترس میری

اللہ تعالیٰ نے جناب کشفی کو تخلیقی جوہر، فنی بصیرت اور ادبی استعداد کے ساتھ ساتھ قلب سلیم کی عظمت سے بھی نوازر کھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد نظم کے بعض ٹکڑے پابند نظم کی جمالیاتی دلپذیری کو بھی شرما رہے ہیں۔ اُن کے ترجمے کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

نبیِ محتشم! تیرا گدائے بے نوا کشفی
بہ چشمِ تر ترے دامن کا سایہ ڈھونڈنے آیا
ہر اک جذبہ ہے میرا شعلۂ بے باک کے مانند
جسے اشکِ ندامت سے ترے دربار میں دھولوں
مری آنکھیں مرے عجز و ندامت کی گواہی ہیں
تری عصمت مرے ہر جرم کو سنگیں بناتی ہے
عبادت کی شب بیدار میں قدموں پہ سوجن تھی
ادھر میں ہوں کہ اکثر جسم کے جھوٹے تقاضوں پر
حدودِ شرع کو توڑا
محمد ﷺ سید الکونین! تو ہے آمر و ناہی
ترا ہر قول سچا ہے
شفاعت کی توقع تیرے دامن تک مجھے لائی
ترا دامن کسی مضبوط رسی کی طرح اب ہاتھ میں آیا
یہ رسی جادۂ راہِ صفا معلوم ہوتی ہے
حبیبِ کبریا! رتبہ کسے معلوم ہے تیرا
تری شفقت نے حیرانی کے ہر گرداب کو ساحل بنا ڈالا
تری قربت میں دوری کس قدر بے چین رکھتی ہے
تری دوری میں قربت کی ادا تسکین جان دیدہ و دل ہے
ترا خلقِ مجسم پرتوِ اسمائے حسنیٰ ہے

شرف میں بدر کامل کی طرح یکتا
شگوفے کی طرح آغوش خوشبو سے
ترا جود و کرم دریا کی موجوں کی طرح وافر
تری ہمت مثال "دہر" ہے گویا
ترے الفاظ روح نطق انسانی
تبسم جیسے آویزہ ہے گوش حسن آدم کا
وہ خاک جسم طاہر 'خالق خوشبوئے بے پایاں
مشام جاں معطر ہو گیا جس سے

ایک ضروری بات

گزشتہ دنوں محبی سید سبط الحسن ضیغم کا ایک مختصر سا مضمون "نوائے وقت" میں نظر سے گزرا جس میں انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ عنقریب پیکیجز لمیٹڈ لاہور کا شعبہ طباعت واشاعت 'قصیدہ بردہ کے منظوم تراجم کا ایک ایسا دل آویز مرقع شائع کر رہا ہے جس میں ایک صفحے پر بصیری کے ایک شعر کے ساتھ پنجابی اور انگریزی کے سادہ ترجموں کے پہلو بہ پہلو غالباً ایک منظوم اردو 'ایک منظوم فارسی اور چار منظوم پنجابی ترجمے ہوں گے۔ یہ کاوش پیکیجز لمیٹڈ کی روایات کے مطابق فی الواقع دیدہ زیب اور جامع ہو گی۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ چار منظوم پنجابی ترجموں کے بجائے ایک پنجابی ترجمہ ہوتا اور اس کے ساتھ دیگر علاقائی زبانوں کے منظوم تراجم دے دیئے جاتے اور انگریزی ترجمہ بھی شعری شکل میں ہوتا۔ پروفیسر عبدالرؤف انجم (۱۹۳۲ء __ ۱۹۹۲ء) کا "فری انگلش ورس" میں توضیحی نوعیت کا ایک جامع ترجمہ بھی ہے۔ مرحوم گورنمنٹ کالج لاہور میں صدر شعبہ انگریزی اور شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی مدینہ منورہ میں غیر ملکی زبانوں سے متعلق شعبہ کے چیئرمین رہے ہیں۔ ان کا یہ منظوم انگریزی ترجمہ 'اسلامک بک فاؤنڈیشن لاہور کی طرف سے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا گیا تھا۔ کتاب کا طباعتی بانکپن نظر افروز ہے۔ متن کی کتابت حضرت نفیس رقم کے اعجاز آفرین قلم کا فیض ہے۔ احقر کے پاس میاں حاجی محمد عبدالخالق تاجران کتب قصہ خوانی بازار پشاور کی فرمائش پر سرحد پریس پشاور سے چھپنے والا (سن اشاعت درج نہیں ہے) ایک قدیم قصیدہ بردہ بھی ہے جس میں ہر شعر کی چار منظوم ترجمے ہیں۔

(۱) منظوم فارسی ترجمہ 'مولانا جامیؒ نے کیا ہے مگر کہیں کہیں لفظی تصرفات نظر آتے ہیں۔
(۲) منظوم پشتو ترجمہ' عبدالقادر خٹک پسر خوشحال خاں خٹک
(۳) منظوم پشتو ترجمہ 'ملا شرف

(۴) منظوم پشتو ترجمہ محب الدین لمشکل مخمس

ان منظوم تراجم کے علاوہ پشتو نثر میں لغوی اور معنوی تشریحات بھی ہیں۔

جناب پروفیسر حفیظ تائب نے جناب پروفیسر اسیر عابد کے منظوم پنجابی ترجمے کے پیش لفظ میں بہاول پور کے ابوالرجا فقیر محمد عزیزالدین کے ایک تخمیس بردہ مع مخمس فارسی اردو اور پنجابی مسمی بہ "نظم الورع" کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یہ تصنیف ۱۳۰۱ھ / ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی تھی جبکہ سرائیکی میں منظوم ترجمہ ڈاکٹر مہر عبدالحق کا موجود ہے دیگر زبانوں میں بھی منظوم تراجم یقیناً موجود ہیں ــــــ یوں پیجز لمیٹڈ لاہور سے چھپنے والا یہ مرقع مسلم امہ کی قلبی یگانگت اور روحانی مماثلت کا ایک خوب صورت شعری ذریعہ ثابت ہوتا۔

❖❖❖❖❖

رفاقت علی شاہد

گلدستہ "انوارِ محمدی ﷺ" ایک تعارف

(۱)

تقسیم برصغیر کے وقت امرت سر اُردو زبان وادب کا ایک بڑا مرکز تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل سے، ادبی لحاظ سے لاہور کو جو مرکزیت حاصل ہونے لگی تھی، اس میں ایک قابلِ ذکر حصہ امرت سر اور مشرقی پنجاب کے دیگر اضلاع کا بھی ہے۔ اُن شہروں کے مشاہیر نے لاہور میں رہ کر یہاں شمع اُردو کو روشن رکھنے میں اپنی صلاحیتیں صرف کیں۔ خود ان شہروں میں بھی اُردو زبان وادب کی سرگرمیاں ماند نہیں پڑیں، بلکہ ان میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا رہا۔ امرت سر کو اس حوالے سے یک گونہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ زرخیز شہر، لاہور کے بعد پنجاب کا دوسرا بڑا علمی، دینی اور ادبی مرکز رہا ہے۔ اردو زبان وادب کے علاوہ مذہبی، خصوصاً اسلامی انجمنوں اور شخصیات کے سلسلے میں بھی امرت سر کی خدمات کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان اسلامی انجمنوں اور شخصیات نے نہ صرف یہ کہ اسلام کے حوالے سے تحریری اور علمی کارہائے نمایاں انجام دیئے، بلکہ اردو، فارسی، عربی اور پنجابی ادب کی ترویج واشاعت میں بھی ان کا کردار قابلِ ذکر رہا ہے۔ پنجابی اور جدید اردو میں امرت سری ادباء کی خدمات کسی طور بھی دیگر بڑے ادبی مراکز کی خدمات سے کم نہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ اسلامی انجمنوں اور مذہبی شخصیات کے حوالے سے امرت سر کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ "مجلسِ انوارِ محمدیہ ﷺ" بھی امرت سر کی ایک ایسی ہی انجمن تھی۔ یہ انجمن انیسویں صدی کے آخری عشرے میں وجود میں آئی، مگر یہ کب تک قائم رہی؟ اس کے بارے میں شواہد دست یاب نہیں۔ اس انجمن کے اہتمام سے ایک مذہبی جریدہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس ماہوار رسالے کا نام "انوارِ محمدی ﷺ" تھا۔ اس وقت میرے پیشِ نظر اس رسالے کے دو شمارے موجود ہیں۔ ان کی مدد سے اس انجمن اور اس رسالے کے بارے میں معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔

"انوارِ محمدی ﷺ" کے جو شمارے پیشِ نظر ہیں، ان کی تفصیل یوں ہے:

۱: جلد اوّل، شمارہ نمبر ۱۱۔ بابت ماہِ جمادی الاوّل ۱۳۰۹ھ۔

۲: جلد دوم، شمارہ نمبر ۸۔ بابت ماہِ صفر المظفر ۱۳۱۰ھ مطابق اکتوبر ۱۸۸۲ء (؟۱۸۹۲ء)

(آئندہ دونوں شماروں کو بالترتیب "شمارۂ اوّل" اور "شمارۂ دوم" لکھا جائے گا)

اردو صحافت کی تواریخ میں "انوارِ محمدی ﷺ" کا ذکر نہیں ملتا۔ اس لیے "انجمن انوارِ محمدیہ ﷺ" اور "انوارِ محمدی ﷺ" کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ سرِدست یہی دو شمارے ہیں۔

دونوں شماروں کے سراوراق کی تفصیل کچھ یوں ہے:

سراوراق کی عبارت چوکور حاشیے کے اندر درج کی گئی ہے جو قدرے مذہب ہے

۔حاشیے کے اندر سب سے اوپر، درمیان میں "اللہ نورِ السموات والارض" تحریر ہے۔ نیچے ایک مذہب محرابی خانے کے اندر دائیں سے بائیں، فارسی کا یہ شعر درج ہے:

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتوِ آں

ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

محراب کے اوپر دائیں جانب شمارے کا شمار نمبر اور بائیں جانب جلد نمبر تحریر ہے۔ محراب کے اندر جلی حروف میں رسالے کا نام "انوارِ محمدی ﷺ" درج ہے۔ اس سے نیچے قدرے جلی حروف میں "یعنی مجلسِ انوارِ محمدیہ ﷺ امرت سر کا ماہواری رسالہ" کی عبارت ہے۔ شمارۂ دوم میں "یعنی" ایک سطر میں اور بقیہ عبارت دوسری سطر میں دی گئی ہے۔ اس کے نیچے "بابت" اور اگلی سطر میں مہینے اور سال کا اندراج ہے۔ اس کے بعد کی سطر میں صرف "مصنفہ" کا لفظ ہے اور اگلی سطر میں غلام مصطفیٰ کشمیری کا نام درج کیا گیا ہے۔ شمارۂ اوّل میں اندراج یوں ہے: "جناب مولوی غلام مصطفیٰ صاحب کشمیری ثم الامرتسری۔" یہ اندراج ایک ہی سطر میں آ گیا ہے جبکہ شمارۂ دوم میں اندراج دو سطور میں کیا گیا ہے اور اس کی صورت یوں ہے:

"جناب ابوالحسن مولوی پیر غلام مصطفیٰ صاحب کشمیری ثم الامرت سری۔"

نیچے کی سطر میں "بہ تشہیر و اہتمام رسول شاہ صاحب نائب میر مجلس" درج ہے۔ شمارۂ دوم میں "رسول شاہ" سے پہلے "جناب" کا اضافہ ہے۔ شمارۂ اوّل میں اس کے نیچے لکیر کھینچ کر مطبع کا نام اس طرح درج کیا گیا ہے: "مطبوعہ چشمۂ نور پریس، امرت سر۔" یہاں شمارۂ اوّل کے سرورق کی عبارت ختم ہو جاتی ہے۔ جبکہ شمارۂ دوم میں "رسول شاہ" والی سطر کے بعد آخری سطر ہے جس میں "بہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۲ء" کا

اندراج ہے۔ یہ یقیناً شمارۂ دوم کے اشاعتی قمری مہینے صفر المظفر ۱۳۱۰ھ کے مطابق عیسوی ماہ و سنہ کا اندراج ہے، لیکن اندراج غلط سنہ کا کیا گیا ہے۔ مہینہ تو درست ہے لیکن سنہ ۱۸۸۲ء کے بجائے ۱۸۹۲ء ہونا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہو کاتب کے باعث ہے شمارۂ دوم میں "مطبوعہ چشمۂ نور پریس امرت سر" کی عبارت سرورق کے چوکور حاشیے کے نیچے درج ہے۔

شمارۂ اوّل میں متن کی تقطیع بیس × ساڑھے گیارہ سم (۲۰×۲/۱۱،۱ سم)، جب کہ شمارۂ دوم میں متن کی تقطیع پونے اکیس × پونے تیرہ سم (۳/۴ ۲۰×۳/۴ ۱۲ سم) ہے۔

شمارۂ اوّل کے سرورق میں سامنے کا اوپری حصہ غائب ہے جس کی وجہ سے اندرونِ سرورق میں درج ضوابط رسالہ میں سے پہلا ضابطہ مکمل اور دوسرے ضابطے کا کچھ حصہ مفقود ہیں۔ پہلے ضابطے کے جو دو ایک لفظ بچ گئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ضابطے میں رسالے کی قیمت کی تفصیل ہوگی۔ دیگر ضوابط درج ذیل ہیں:

(۲) اس میں مضامین عقلی و (نقلی) دستور العمل شارع کے درج ہوں گے۔

(۳) اس کے جملہ مضامین کل اہلِ اسلام عموماً اور خصوصاً نوجوان طالبِ علموں کے لیے فائدہ بخش ہوں گے۔

(۴) معترضینِ اسلام کا جواب، بہ پیرایۂ تہذیب ہوگا۔

(۵) اس رسالہ کی اشاعت میں کوئی ذاتی غرض نہ ہوگی۔

(۶) جن حضرات کی خدمت میں یہ رسالہ بلادر خواست روانہ کیا جاوے، تو ان کو لازم ہے کہ بہ شرطِ منظوری قیمت معینہ فوراً ارسال فرمادیں، یا بہ شرطِ نامنظوری ایک ماہ کے اندر، بہ ذریعہ پوسٹ کارڈ اطلاع دیں۔ اگر ایسا نہ کریں گے تو ان کا نامِ نامی درجِ رجسٹر خریداران ہو جائے گا۔ بعدہ جن صاحبوں کو خریداری منظور نہ ہو تو جس قدر رسالے اُن کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں، ان کی قیمت ارسال فرمادیں، ورنہ رسالہ بدستور جاری رہے گا، کیونکہ اکثر معزز عہدہ داران نے باوجود کئی ایک رسالوں کے ہضم کرنے کے، خریداری سے انکار کر دیا ہے۔

(۷) رسالہ ہذا پیشگی بہ خدمت مولوی غلام رسول صاحب میر مجلس امرت سر، مسجد میاں محمد جان صاحب مرحوم ارسال فرمادیں۔

(۸) خط و کتابت بنام غلام احمد المتخلص بہ اخگر نائب دبیر مجلس انوارِ محمدیہ ﷺ، امرت سر، کٹرہ قلعہ بھنگیاں کے پتہ (پتا) پر ہونی چاہیے۔ شمارۂ دوم میں ضوابط کی یہ تفصیل نہیں ہے۔ مختصر طور پر ذیل کے

ضوابط درج ہیں:

"ضوابط رسالہ انوار محمدیہ ﷺ امرت سر"

یہ ماہ واری رسالہ ہر قمری کی آخری تاریخوں میں مجلس انوار محمدیہ ﷺ امرت سر کی طرف سے شائع ہوتا ہے جس کا سالانہ چندہ حسب ذیل ہے:

قسم خریدار	بلا محصول	مع محصول
گورنمنٹ ووالیان ملک	ڈیڑھ روپیا	پونے دو روپے
رؤسا و عظام	ایک روپیا	سوا روپیا
عام شائقین	آٹھ آنے	بارہ آنے

زرِ چندۂ مقررہ، رسالہ ہذا، پیشگی بہ خدمت جناب مفتی مولانا مولوی غلام رسول صاحب میر مجلس، بہ مقام شہر امرت سر مسجد میاں محمد جان صاحب مرحوم ارسال فرماویں۔ بذریعۂ منی آرڈر ارسال زرِ چندہ ہر قسم کی خط وکتابت بنام منشی صاحب غلام احمد اخگر نائب دبیر مجلس انوار محمدیہ ﷺ، امرت سر، قلعہ بھنگیاں کے پتہ (پتا؟) پر ہونی چاہیے ورنہ توقف جواب کی شکایت معاف۔"

شمارۂ اوّل کے اندرون سرورق میں، ضوابط کے اختتام کے بعد "پروپرائٹران و اڈیٹران اخبارات" کی خدمت میں درج ذیل درخواست پیش کی گئی ہے: "مجلس کا ماہ وار رسالہ آپ کی خدمت میں ہمیشہ حاضر ہوگا۔ رجاء واثق (پوری امید) ہے کہ آپ بہ نظر ہمدردی اسلام مقدس، اپنے اپنے اخبارات بہ طور تبادلہ عطا فرمائیں گے اور مجلس کے اغراض، جو متعلقہ دیجہ کے ہیں، آئندہ درج کئے (کیے) جائیں، مجلس کو اپنا شکر گزار بنائیں گے اور عند اللہ ماجور ہوں گے۔"

شمارۂ اوّل کے اختتام پر "التماس ضروری" کے تحت درج ہے کہ: "خریداران رسالہ انوارِ محمدی! رسالہ انوارِ محمدی کا گیارہواں نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ جن اصحاب نے تاحال زرِ چندہ (قیمتِ رسالہ) عنایت نہیں فرمایا، ان کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے کہ بہ نظر ہمدردی اسلامِ مقدس بہت جلد زرِ چندہ عنایت فرما کر مجلس کو اپنا شکر گزار بناویں۔ راقم دبیر مجلس"

شمارۂ دوم کے اندرون سرورق میں یہ "معذرت" درج ہے: "الامان۔ امرت سر میں بیماری، بخار و دیگر عوارضات (عوارض؟) کا سخت زور ہے۔ چونکہ مولوی صاحب، مصنفِ رسالہ سلمہ اللہ تعالیٰ، باشندگانِ امرت سر سے مستثنیٰ نہ تھے۔ لہٰذا حسبِ طلب داشتِ حساب وکتاب، چند روز سے مصروفِ حساب رہی ہیں، لہٰذا آں جناب تیاریِ مضمون اور انجمن نے اس کے انطباع میں مجبور ہو کر اس مہینے کا رسالہ

چھار ورقی رکھا۔ آئندہ اس کی تلافی کی جاوے گی اور شیہ وقت معافی کا ہے استدعا ہے کہ مولانا صاحب کے حق میں دعا فرمادیں۔"

(۳)

"انوارِ محمدی ﷺ" کے درج بالا ضوابط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی اشاعت اسلامی مہینوں کے حساب سے ہوتی تھی۔ اس دور میں (اور بعد میں بھی بہت عرصے تک) اسلامی رسائل کی اشاعت قمری یعنی اسلامی مہینوں کے حوالے سے ہی ہوتی رہی ہے۔ "انوارِ محمدی ﷺ" کی اشاعت کے سلسلے میں بھی اسی روش کو اختیار کیا گیا۔

قدیم دور کے دیگر جرائد کی طرح "انوارِ محمدی ﷺ" کی قیمت بھی خریداروں کی استطاعت کے مطابق مختلف مقرر کی گئی۔

شمارۂ اوّل میں اغراض و مقاصد کی جو تفصیل ہے، اس میں سے بیش تر شمارۂ دوم سے غائب ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے ان مقاصد کو غیر ضروری جانتے ہوئے، شمارۂ دوم تک، ان کا اندراج حذف کر دیا گیا ہوگا۔

شمارۂ اوّل میں چھٹے ضابطے کے تحت اور آخر میں رسالے کی خریداری کے سلسلے میں جو تنبیہ درج کی گئی ہے اس طرح کی تنبیہ اس دور کے اکثر رسالوں اور گلدستوں میں ملتی ہے۔ شمارۂ دوم میں یہ تنبیہ موجود نہیں۔ شمارۂ دوم، رسالے کا بیسواں شمارہ ہے۔ عموماً ایک سال میں رسالے کے مستقل خریداروں کا تعین ہو جاتا تھا، اس لیے ممکن ہے بعد میں اس تنبیہ کو غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیا گیا ہو۔ اس امکان کے باوجود ایسے شواہد موجود ہیں کہ بعض رسائل میں ایسی تنبیہ مستقلاً شائع ہوتی رہی ہے۔ ایسا غالباً اس لیے ہوتا تھا کہ ان رسائل کے لیے نئے خریدار پیدا کرنے کے لیے کئی حضرات کو رسالہ بھجوانے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

"انوارِ محمدی ﷺ" کے سالانہ چندے کی ادائی کے لیے مولوی غلام رسول کا پتا دیا گیا ہے، جبکہ باقی امور کے سلسلے میں خط کتابت کے لیے منشی غلام اخگر سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "مجلس انوارِ محمدیہ ﷺ" کے مالی معاملات مولوی غلام رسول ہی دیکھتے ہوں گے۔ وہ مجلس کے میر بھی تھے اور بڑی حد تک ممکن ہے کہ رسالہ "انوارِ محمدی ﷺ" کی اشاعت میں ان کی مساعی زیادہ ہو۔

اخگر امرت سری کے ذمے جو خدمت لگائی گئی، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انجمن میں بھی ان کی حیثیت یہی ہوگی، یعنی انجمن کے علمی معاملات کی نگرانی۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ۱۸۹۲ء تک اخگر امرت سری اس قدر صاحبِ علم ہو گئے تھے کہ ایک اسلامی انجمن کے علمی معاملات ان کی نگرانی میں

دیے جا سکتے۔

رسالے کے سر ورق پر یا کہیں اور بھی رسالے کے مدیر یا مرتب کا نام نہیں ملتا۔ جیسا کہ آئندہ تفصیل درج ہوگی "انوارِ محمدی" میں مولوی غلام مصطفےٰ کی کتاب، سلسلے وار شائع ہوتی رہی ہے۔ غالباً اسی لیے رسالے کے سر ورق پر ان کا نام بطور مصنف ملتا ہے۔ شمارۂ دوم کے اندرون سر ورق میں درج معذرت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ رسالے میں مولوی غلام مصطفےٰ کی تصنیف ہی قسط وار شائع ہوتی تھی۔ ان شواہد سے یہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رسالے میں صرف مولوی غلام مصطفےٰ کی کتاب ہی سلسلے وار شائع ہوتی ہو گی۔

لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ شمارۂ دوم میں شعراء کی طرحی غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ طرحی غزلیں شائع ہونے کا واضح مطلب یہ ہے کہ کم سے کم ایک شمارہ قبل طرح مصرع رسالے میں مشتہر کیا گیا ہوگا، جیسا کہ دیگر گلدستوں کا مستقل طریق تھا۔ اس کے علاوہ شمارۂ دوم کے آخر میں آئندہ کے لیے طرح مصرع بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح کم سے کم تین شماروں کی حد تک شواہد ملتے ہیں کہ ان میں طرحی نعتیہ کلام شائع ہوا ہے۔ ممکن ہے یہ سلسلہ بہت پہلے سے شروع ہو۔ ایسی صورت میں یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پہلے پہل "انوارِ محمدی" میں مولوی غلام مصطفےٰ کی کتاب ہی شائع ہوتی ہو گی۔ بعد میں طرحی نعتیں شائع کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سلسلہ اخگر امرت سری کی مساعی سے ہی شروع ہوا ہو۔ اخگر کی علمی استعداد اور "انوارِ محمدی" میں ان کی ذمے داری کو دیکھتے ہوئے یہی امکان پیدا ہوتا ہے۔

(۴)

شمارۂ اوّل آٹھ اوراق یعنی سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان میں دو صفحات سر ورق کے ہیں۔ بقیہ چودہ صفحات میں رسالے کا متن ہے۔ یہ متن کسی مسلسل کتاب کے صفحات کا ہے۔ شمارۂ اوّل میں اس کتاب کے مسلسل صفحات ۱۳۷ تا ۱۵۰ کا متن شامل ہے۔ ص ۱۳۷ پر متن کے شروع میں ذیل کی وضاحت ملتی ہے:

"سلسلہ کے لئے (لیے) دیکھو باب ۱۰، صفحہ ۱۳۶۔"

گویا یہ صفحات اس مسلسل کتاب کے دسویں باب کا حصہ ہیں۔ یہ دسواں باب ص ۱۴۲ پر ختم ہوتا ہے۔ ص ۱۴۳ سے گیارھواں باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان "قرآن شریف کی فضیلت وغیرہ کے بیان میں" قائم کیا گیا ہے۔ یہ باب ص ۱۵۰ پر ختم ہو گیا ہے۔ اس کے اختتام پر "مصنفہ فقیر غلام مصطفےٰ عفی عنہ" درج ہے۔ گویا یہ صفحات غلام مصطفےٰ کی کتاب کے ہیں۔ غالباً یہاں کتاب بھی ختم ہو گئی ہے۔ اس کے بعد "التماس ضروری" کی وہ عبارت ہے جو مضمون ہذا کے دوسرے حصے میں نقل کی جا چکی ہے۔ پھر ایک کتاب

کا اشتہار ہے (جو مضمون کے آخر میں ایک ضمیمے کے تحت نقل کر دیا گیا ہے) ص ۱۵۰ پر شمارۂ اوّل کا اختتام ہوتا ہے۔

شمارۂ دوم کی ضخامت چار اوراق یعنی آٹھ صفحات ہے۔ سرورق کے پہلے دو صفحات کے بعد باقی کے چھے صفحات میں "نعتیہ غزلیں" درج ہیں۔ ان چھے صفحات کو ۹۹ سے ۱۰۴ تک کے نمبر شمار دیئے گئے ہیں۔ آخری صفحے کے حاشیے پر آئندہ کے لیے ذیل کا طرح مصرع دیا گیا ہے:

جہاں میں شکلِ احمد بن کے وہ نورِ قدیم آیا　　　　"قدیم قافیہ"

اس (شمارۂ دوم) شمارے کے اندرونی سرورق میں جو معذرت شائع ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شمارے کی ضخامت یعنی آٹھ صفحات، رسالے کے مستقل صفحات سے کم تھی۔ شمارۂ اوّل کی ضخامت (سولہ صفحات) سے اندازہ ہوتا ہے کہ "انوارِ محمدی" کی مستقل ضخامت یہی ہوگی۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ طرحی نعتیہ کلام شائع ہونے کے بعد مسلسل کتاب اور نعتیہ کلام کے لیے صفحات مستقلاً مختص کر دیئے گئے ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ کتاب کے صفحات سولہ اور نعتیہ کلام کے صفحات کی مستقل تعداد چار یا چھے ہو۔ بہر حال اس سلسلے میں یقین کے ساتھ کوئی بات نہیں لکھی جا سکتی۔

(۵)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے "انوارِ محمدی" کے پیشِ نظر دو شماروں میں سے ایک گلدستہ ہے۔ شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ "گلدستہ انوارِ محمدی کے زیرِ نظر شمارے سے قبل ہی اس کی اشاعت بہ طور گلدستہ شروع ہو گئی ہوگی یہ بھی بیان ہو چکا کہ "انوارِ محمدی" اور "گلدستۂ انوارِ محمدی" میں کہیں بھی مرتب یا مدیر کا نام مرقوم نہیں اور نہ کہیں کوئی ایسا قرینہ موجود ہے جس سے مرتب کا مدیر کی شخصیت کا اندازہ ہو سکے۔ سرورق پر "مصنفۂ جناب ابوالحسن مولوی غلام مصطفےٰ صاحب کشمیری ثم الامرت سری" ضرور ملتا ہے۔ یہ بیان ہو چکا کہ "انوارِ محمدی" میں انہی غلام مصطفےٰ صاحب کی کتاب ہی قسط وار شائع ہوتی تھی، اس لیے سرورق پر ان کا نام بطورِ مصنف ملتا ہے۔ "انوارِ محمدی" کے عام شمارے کی حد تک تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہے لیکن گلدستے کے شمارے پر بھی غلام مصطفےٰ صاحب کا نام بہ طور مصنف درج ہے۔ اس سے اور اندرون سرورق پر درج "معذرت" سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ گلدستے میں طرحی نعتیہ کلام کے ساتھ غلام مصطفےٰ صاحب کی سلسلہ وار کتاب کا متن بھی شامل ہوتا تھا لیکن پیشِ نظر شمارے میں مذکورہ کتاب کا متن شامل نہیں۔ اس کی وجہ مذکورہ "معذرت" میں بیان کر دی گئی ہے کہ کتاب کے مصنف بیمار تھے، اس لیے کتاب کا متن تیار نہ کر سکے۔ اس لیے اس بار صرف طرحی نعتیں ہی پیش کی جا رہی ہیں۔

ان شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے "انوارِ محمدی" رسالے کی شکل میں شائع ہوتا تھا اور اس میں غلام مصطفےٰ صاحب کی کتاب ہی سلسلے وار شائع ہوتی تھی، لیکن بعد میں اسے گلدستے کی شکل دے دی گئی اور اس میں مذکورہ کتاب کے متن کے علاوہ طرحی نعتیہ کلام بھی شائع ہونے لگا۔

رسائل کی طرح گلدستوں میں بھی مرتب یا مدیر کا نام ملتا ہے۔ ظاہر ہے شائع کیے جانے والے شعری ونثری کلام کی تصحیح وترتیب کرنے کے بعد ہی انھیں شائع کیا جاتا ہوگا۔ تاہم بعض (بہت ہی کم تعداد میں) رسائل یا گلدستوں میں مرتب ومدیر کا نام نہیں بھی ملتا۔ ایسا عموماً کم معروف رسائل وگلدستوں کے سلسلے میں دیکھنے میں آتا ہے۔ "انوارِ محمدی" اور "گلدستہ انوارِ محمدی" میں بھی قاری کو ایسی ہی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ گلدستے میں اگرچہ مرتب یا مدیر کا نام کہیں موجود نہیں لیکن قرائن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ طرحی کلام کی تصحیح وترتیب اخگر امرت سری کرتے ہوں گے۔ ان کی علمی استعداد، علمی وادبی مشاغل اور ان سے گہرے لگاؤ کا ذکر ہو چکا ہے (رک مضمون ہٰذا کا چوتھا حاشیہ) اسکے علاوہ "مجلس انوارِ محمدیہ" سے ان کے تعلق کا ذکر بھی اوپر گزر چکا ہے۔ (رک: مضمون ہٰذا کا چوتھا حصہ) علم وادب سے اس لگاؤ اور انجمن سے تعلق کے سبب قیاس چاہتا ہے کہ طرحی کلام کی تصحیح وترتیب کا کام اخگر امرت سری کے ذمے ہی لگایا گیا ہوگا۔ اسی تناظر میں یہ بھی ممکن ہے کہ "انوارِ محمدی" کو گلدستے کی شکل دینے میں بھی انھی کی مساعی کارفرما رہی ہو۔

گلدستہ "انوارِ محمدی" کے دستیاب پیشِ نظر شمارے میں پندرہ شعراء کا طرحی نعتیہ کلام شائع ہوا ہے۔ اس طرحی کلام کے لیے ذیل کا طرح مصرع دیا گیا تھا:

بھروسا ہے گنہ گاروں کو حضرت کی شفاعت کا

پیشِ نظر شمارے میں جن شعراء کا نعتیہ کلام شامل ہے، ان کا تعارف (جو خود گلدستے میں شامل ہے) اور ان کی نعتیہ غزلوں کے مقطعے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) جناب مولانا ابوالجمیل محمد عبدالجلیل صاحب شیفتہؔ تخلصاً والمظفر پوری مولداً وسکناً والمدنی مضجعاً ومدفناً ان شاءاللہ۔ (۲۲ر اشعار)

ارادہ کیا کرے کوئی نبی علیہ السلام حق کی مدحت کا | ہے اُن پر خاتمہ جو دو سخا و فیض و نعمت کا

(۲) جناب بابو غلام محمد صاحب ناظمؔ، کلرک دفتر لوکو سپرنٹنڈنٹ۔ از محبان شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۱۳ر اشعار)

تو شارع ہے شریعت کا، تو رہبر ہے طریقت کا | تو واقف معرفت کا، رازداں رازِ حقیقت کا

(۳) جناب مولانا مفتی غلام سرور صاحب سروؔر لاہوری از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۹/اشعار)

طریقت کا نبی ہے، رہنما ہادی شریعت کا — حقیقت میں وہی واقف ہے اسرارِ حقیقت کا

(۴) در مدح حضرات خلفائے اربعہؓ۔ از جناب مولوی محمد عباس صاحب سنبلؔ، وکیل درجۂ اوّل سرکار نظام خلد ملکہ از محبان شیفتہ۔ (۶/اشعار)

لکھوں گا وصف اصحابِ شہنشاہِ رسالت کا — صداقت کا، عدالت کا، قرابت کا، شجاعت کا

(۵) جناب مولوی محمد عطاء اللہ صاحب عطاؔ پشاوری۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۷/اشعار)

محمدؐ نام ہے اللہ اکبر سر قدرت کا — انا احمد بلا میم بیاں ہے قربِ وحدت کا

(۶) جناب مولوی محمد سردار علی صاحب اخترؔ لاہوری۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۵/اشعار)

نہیں ڈر کچھ بھی خورشیدِ قیامت کی تمازت کا — کہ ہو گا سر پہ اپنے سائبان ابرِ شفاعت کا

(۷) جناب مولوی محمد عبد المجید صاحب مجیدؔ کیرت پوری۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۵/اشعار)

نہ خواہاں مال و زر کا ہوں، نہ طالب جاہ و حشمت کا — تمنا ہے، ہوں جاروب کش احمدؐ کی تربت کا

(۸) جناب حکیم مفتی محمد انور صاحب انورؔ چشتی قادری لاہوری۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۶/اشعار)

محمد ﷺ پر کیا ہے خاتمہ حق نے رسالت کا — کہ شایاں انتہا ایسے نبی پر تھا نبوت کا

(۹) جناب منشی محمد بدر الدین صاحب مشتاقؔ لکھنوی۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۶/اشعار)

بیاں کیا ہو شہنشاہِ عرب کی شان و شوکت کا — فلک جس کے درِ دولت پہ نقارہ ہے نوبت کا

(۱۰) از جناب منشی فخر الدین احمد صاحب خاکیؔ، مینجر فخر الدین پریس۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۷/اشعار)

کہاں ہے حوصلہ اے صاحبو! مجھ بے لیاقت کا — کہ لکھوں وصف میں کچھ اس شہِ ختمِ رسالت کا

(۱۱) جناب سید اصغر علی صاحب اصغرؔ گیلانوی (گیلانی)۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۷/اشعار)

محمد ﷺ گوہر نایاب ہے دریائے رحمت کا — اسی کے فیض سے جاری ہوا چشمہ سخاوت کا

(۱۲) جناب منشی محمد عثمان صاحب عثماںؔ۔ از محبانِ شیفتہؔ مظفر پوری۔ (۳/اشعار)

عجب کیا، گر گلِ مقصد ثمر ہو جائے حسرت کا — کبھی برسے جو بادل میرے احمدؐ کی شفاعت کا

(۱۳) جناب منشی محمد یوسف صاحب سرگشتہؔ مظفر پوری، طالب علم انٹرنس کلاس، سوزی اسکول۔ (۴/اشعار)

کروں توصیف کیا سرگشتہ میں شاہِ رسالت کا — نہ ممکن ہے بشر سے ہو سکے اوصاف حضرت کا

(۱۴) جناب منشی ابوالفتح محمد عبدالوہاب صاحب شگفتہ بھگوان پوری، منظرپوری، برادر خرد جناب شیفتہ۔ (۵ اشعار)

بیاں کیا ہو سکے ہم سے بھلا کچھ تیری عظمت کا — ترے جود و سخا و فیض و رحمت کا عنایت کا

(۱۵) جناب ابوالاعجاز خدا بخش صاحب الموسوم بہ اسم تاریخی منظرالحق عطار طالب ملتانی شاگرد شوق نیموی۔ (۲ اشعار)

نہ کیوں کر فخر ہو طالب مجھے اپنی طبیعت کا — کہ رہتا ہے ہمیشہ مشغلہ حضرت کی مدحت کا

"طرح آئندہ بابت ماہِ ربیع الاول۔ جہاں میں شکل احمد ﷺ بن کے وہ نورِ قدیم آیا۔ (قدیم قافیہ)"

(۶)

ضمیمہ

شمارۂ دوم کے اندرون سرورق پر "گلدستۂ کلام یار" کا اشتہار شائع ہوا ہے جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

"اشتہار فرحت آثار

ہے فصلِ نوبہار عنادل ہیں نغمہ زن — پھولے نہیں سماتے ہیں نسرین و نسترن

مژدہ ہو دوستوں کو کہ بہجت کا وقت ہے — عشرت کے پھول آج کھلے ہیں چمن چمن

گلدستۂ کلام یار: یہ لاجواب گلدستہ، جس کے ہر اک شعر دل کو بے چین کرتے ہیں۔ ثقالت سے بالکل پاک۔ صفائی، بندش، روزمرہ کا بادشاہ۔ جن کو کچھ بھی شعر و سخن کا مذاق ہے، ان کے لیے خوبانِ جہاں کا تجمل اسی گلدستے کی نکھری ہوئی صورت ہے کیوں نہ ہو "کل جدید لذیذ" مشہور ہے۔ کہاں ہے شاعرانِ نازک خیال اور کہاں ہیں سامعینِ عالی خصال یہاں تشریف لائیں یا اپنی غزل ہی تاریخ معینہ کے ساتھ روانہ فرمائیں۔

المختصر ہم نے ایک گلدستہ کلام یار نکالا ہے۔ امید کہ کل حضرات ۱۰ اکتوبر تک مع غزلیات شاگردانِ خود، ارسال فرمادیں۔ بہ شرط منظوری، گلدستہ نظر کیا جائے گا۔

طرح: مرا عالم جوانی کا ترا عالم لڑکپن کا۔ — لڑکپن قافیہ، کا ردیف۔

المشتہر: محمد یوسف حنفی مہتمم گلدستہ کلام یار، منظرپور محلہ اسلام پورہ۔"

شمارۂ اوّل کے اختتام پر ایک کتاب کا اشتہار درج ہے۔ وہ بھی درج کیا جاتا ہے:

اشتہار :ازالۃ التکاویح فی تعداد التراویح

(مولفہ مولانا مولوی شاہ محمد صاحب متوطن ضلع فیروزپور)

یہ نادر کتاب جس میں مولف نے باکمال بست (بیس) رکعات تراویح کو بہ دلائل اربعہ باحوالہ کتب متداولہ نہایت احسن طور پر ثابت کیا ہے زیور طبع چھپ کر (؟) ہاتھوں ہاتھ (؟) فروخت ہو جاتی ہیں۔ اب تھوڑے ہی نسخے باقی ہیں۔ ناظرین جلد خریدیں۔ قیمت صرف ۲۰ ر بلا محصول ڈاک ہے۔ مفصل ذیل پتہ (پتا) پر طلب فرماویں

(۱) مولف سے بامقام پٹوار خانہ فیروزپور شہر۔

(۲) امرت سر میں مولوی محمد اسماعیل کلارک (کلرک) دفتر رالی برادر صاحبان ایجنسی امرت سر۔"

ایک اور اشتہار اسی شمارۂ اوّل کے اندرون سرورق پر بھی ہے

رجسٹر نکاح نامہ جات: یہ رجسٹر کار آمد کاتب نکاح اور فریقین کے لئے (لیے) بہت ہی فائدہ بخش ہے۔ علی الخصوص شہادت کے موقعہ (موقع) پر بہت ہی کار آمد ہو گا۔ اس میں نام ناکح و منکوحہ معہ (مع ؟) وکیل شاہدین اور مہر و زیور وغیرہ درج ہوتا ہے اور بس میں صرف ایجاب و قبول کیا جاوے، وہ بھی درج کیا جاتا ہے: بلا جلد ۳ ر۔ مجلد ۴ ر= علاوہ محصول۔ راقم دبیر مجلس۔"

اندرون سرورق حاشیوں میں بھی انھی رجسٹروں کا اشتہار ہے لیکن کاغذ کی دریدگی کی وجہ سے اشتہار مکمل نہیں رہ گیا۔

شمارۂ دوم میں بھی یہ اشتہار اندرونِ سرورق پر موجود ہے لیکن اختصار کے ساتھ: "رجسٹر نکاح نامہ جات یہ رجسٹر کار آمد کاتب نکاح، فریقین کے لئے (لیے) نہایت فائدہ بخش ہے۔ نکاح کے متعلق سب امور کا اندراج ہو سکتا ہے: قیمت بلا جلد ۳ ر۔ مجلد ۴ ر۔ قیمت فی جفت معہ (مع) محصول ۲۰ ر۔ چار سے زائد خریدار کو فی جفت علاوہ محصول ۱۰ ر۔"

حواشی

(۱) رک: جوہر تقویم۔ ص ۲۱۳ (ج۔ ج = ورق دریدہ ہونے کی وجہ سے عبارت مفقود ہے۔

(۴) محمد سلیم چوہدری نے غلام احمد اخگر کے بارے میں جو معلومات دی ہیں، ان کے مطابق اخگر شعبان ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام لعل محمد تھا۔ کشمیری تھے، اس لیے والد کو لوگ عرفِ عام میں لعل بٹ بھی کہتے تھے۔ اخگر نے علومِ دینیہ عربیہ کی تعلیم امرت سر سے ہی حاصل کی۔

۱۹۰۶ء میں "اہلِ فقہ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ "آپ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ کے مرید و خلیفہ تھے۔ حکیم معراج الدین احمد نے آپ کی نگرانی میں اخبار "الفقیہ" امرت سر جاری کیا۔ اخگر اس میں مضامین لکھتے رہے۔ وہ بہت اچھی نظموں کے علاوہ نعتیں بھی لکھتے تھے۔ ان کا انتقال امرت سر میں ۱۵ اگست ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ (شعرائے امرت سر کی نعتیہ شاعری۔ ص ۵۱، ۵۲)

سلیم چوہدری نے اپنی معلومات کا ماخذ یا مآخذ تحریر نہیں کیے۔

امداد صابری نے اخگر امرت سری کے بارے میں ذیل کی معلومات مزید مہیا کی ہیں:

اخگر کا اصلی وطن اسلام آباد، کشمیر تھا جہاں وہ کثیر اراضی کے مالک تھے۔ ان کے والد ریاست کے اعمال کے ظلم اور دیگر تکالیف کی وجہ سے تمام اراضی چھوڑ کر امرت سر آگئے۔ وہاں انھوں نے پہلے حاشیے (گوٹ، سنجاف) کی تجارت شروع کی جو کامیاب نہ ہو سکی، تو پشمینہ بنوانے کا کام شروع کیا۔

اخگر نے چار سال کی عمر میں ایک بزرگ رحمان شاہ سے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا اور دو سال میں قرآن ختم کر لیا۔ مختلف استادوں سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ رواجِ زمانہ کے مطابق سرکاری مدرسے میں داخل نہیں ہوئے۔ بارہ برس کی عمر میں "سکندر نامہ" اور "ابوالفضل" (رقعاتِ ابوالفضل؟) پڑھ رہے تھے۔ اسی زمانے میں ان کے والد کے مالی حالات زیادہ خراب ہوئے تو انھوں نے اخگر سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے کوئی ہنر سیکھنے کو کہا تاکہ وہ خاندان کے مالی حالات میں بہتری کے لیے عملی حصہ لے سکیں۔ لیکن اخگر نے تعلیم سلسلہ منقطع نہیں کیا اور والد کے حکم کے مطابق ہنر بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ دن کو شال بافی کے کام میں مصروف رہتے اور رات کو مولوی عبدالعزیز صاحب سے عربی کی تعلیم حاصل کرتے۔ عربی کی بعض کتب انھوں نے امرت سر کے ایک جید عالم مولوی عبدالعلی سے بھی پڑھیں۔ حساب کا شوق پیدا ہوا تو انگریزی کتابوں کی مدد سے اسے سیکھا۔

عملی زندگی کا آغاز شال بافی کے کام سے کیا۔ یہ کام امرت سر سے ختم ہوا تو انھوں نے مختلف ذرائع معاش اختیار کیے لیکن طبیعت سے مطابقت نہ اختیار کر سکے۔ کوئی سند نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمت کا حصول ناممکن تھا۔ رات کو پڑھنے کی وجہ سے آشوبِ چشم ہو گیا، اس لیے منطق میں ملا حسن اور فقہ میں "شرح وقایہ"، "اصول الشاسی" اور "نورالانوار" ختم کر کے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر دیا اور خواجہ غلام رسول صدر الدین کی دکان پر حساب کی دیکھ بھال پر ملازم ہو گئے۔ ملازمت کے وقت کے بعد فرصت میں مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۰۰ء میں اپنی تجارت شروع کی۔ اس سلسلے میں کلکتہ بھی جانا ہوتا رہا۔

(تاریخِ صحافت اردو۔ جلد چہارم۔ ص ۶۱۵ تا ۶۱۷)

امداد صابری نے اخبار "اہلِ فقہ" کے بارے میں درج ذیل معلومات مہیا کی ہیں :

۱۹۰۶ء میں اہلِ حدیثوں کے ایک مضمون پر اہل حدیث اور اہلِ فقہ حضرات میں تنازع بڑھ گیا تو اخبار "اہلِ حدیث" کے مقابلے پر اخگر نے اخبار "اہل فقہ" جاری کیا۔ یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ آغاز میں اس اخبار کے صفحات میں اہل حدیث حضرات کے خلاف نہایت سخت مضامین شائع ہوتے تھے۔ پھر کسی بزرگ نے اخگر اور مولانا ثناء اللہ امرتسری، مدیر "اہل حدیث" میں صلح کرا دی۔ اس وجہ سے "اہل فقہ" میں "اہل حدیث" حضرات کے خلاف مضامین کی اشاعت بند ہو گئی۔ اب اس میں ملکی معاملات سے متعلق بھی لکھا جانے لگا۔ درمیان میں کچھ مہینوں کے لیے اخبار بند رہا لیکن اخگر کے پیرومرشد کی کوششوں سے دوبارہ اس کی اشاعت شروع ہو گئی۔ ۱۹۱۲ء میں اس کی اشاعت ایک ہزار تھی۔ (ایضاً۔ ص ۶۱۵)

امداد صابری نے "الفقیہہ" امرت سر کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ ۱۲ر صفحات کا یہ ہفتہ وار اخبار ۱۹۱۸ء میں کٹرہ باگھ سنگھ، امرت سر سے شروع ہوا۔ اس کے مدیر حکیم ابوالریاض معراج الدین احمد تھے۔ (ایضاً۔ جلد پنجم۔ ص ۶۱۲)

ھ =اصل : =بھ

ع =اصل :=مولینا

ے =اصل :مشغلہ۔ ۸ =اصل :ہے۔

۹ =اصل :بلکل۔ ۱۰ =اصل :معہ۔

کتابیات

امداد صابری...... تاریخِ صحافتِ اُردو۔

جلد چہارم۔ دہلی، ۱۹۷۴ء۔

جلد پنجم۔ دہلی، ۱۹۸۳ء۔

سلیم چوہدری، محمد...... شعرائے امرت سر کی نعتیہ شاعری۔

لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی۔ اشاعتِ اوّل۔ جون ر ۱۹۹۶ء

ضیاء الدین لاہوری (مؤلف)...... جوہر تقویم۔

لاہور، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ طبع اوّل۔ ۱۹۹۴ء۔

ماہنامہ "انوارِ محمدی۔" امرت سر، انجمنِ انوارِ محمدی۔

جمادی الاوّل ۱۳۰۹ھ۔ صفر المظفر ۱۳۱۰ھ۔

حضرت کعب بن زہیرؓ

قصیدۂ بانت سعاد

منظوم: اردو ترجمہ

(رئیس احمد نعمانی (بھارت)

نیل المراد

(۱)

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول
متیم اثرها* لم یفد مکبول

کہاں سعاد ہیں بس راہ میں نقوش قدم
ہے قلب غم زدہ کس درجہ بے قرار نہ پوچھ
نہ پوچھ آج اسیر طلب کا حال زبوں
ہے کس بلا کی مصیبت فراق یار نہ پوچھ

(۲)

وما سعاد غداة البین إذ دحلوا
إلا أغن غضیض الطرف مکحول

دم و داع وہ اس کا کلام جاں پرور
متاع گوش ہے وہ لحن نغمہ زا، اب تک
نظر میں، باہم انداز دل ربا یانہ
ہے اس کی نرگس بیمار سرمہ سا اب تک

(۳)

هیفاء مقبلة عجزاء مدبرة
لا یشتکی قصر منها ولا طول

کرشمہ سازی ذہن صنم تراش نہ پوچھ
نظر کے سامنے ہے جیسے وہ سراپا ناز
وہ عضو، عضو، تناسب کی آئینہ داری
وہ اس کا قد کہ نہ کوتاہ اور حد سے دراز

(۴)

تجلو عوارض ذی ظلم إذا ابتسمت
کانه منهل بالراح معلول

وہ جاں نواز تبسم وہ دل ربا دنداں
کرے بوقت، تبسم جب آشکار انہیں
چمک ہو موتی سے بڑھ کر، ابھی ابھی جیسے
شراب ناب سے دھویا ہے بار بار انہیں

(۵)

شجت بذی شبم من ماه محنیة
اصف بابطح إضحی دهو مشمول

شراب جس میں ہو آمیزش آب صافی کی
وہ آب جو کہ تہ جو پیار سے نکلے
ہوں سنگریز تہ آب اور چاشت کے وقت
خنک کریں اسے باد شمال کے جھونکے

(۶)

تنفی الریاح القذی عنه و إفرطه
من صوب ساریة بیض یعالیل

ہوائیں دور کریں اس کے سب خس وخاشاک
سحر کے ابر کی بارش سے جو پیار بھرے
پھر اس کے آب میں مخلوط ہو وہ بادۂ ناب
جو اس کے دانتوں کو مانند برق چمکا دے

(۷)

إکرم بهاخلة إنها صدقت
موعودها ولوأن انصح مقبول

بہت ہی صاحب لطف و کرم ہو وہ دلبر
گر اپنے وعدۂ دیرینہ کا کرے کچھ پاس
اور اپنے سر نہ لے الزام بے وفائی کا
ہو کاش میری نصیحت کا بھی اسے احساس

(۸)

لکنها خلة قد سیط من دمها
فجع ولع وإخلاف و تبدیل

مگر سرشت میں اس کی نہیں ہے یہ شامل
کہ اس کے دم سے وفا کا چراغ ہو روشن
ستانا اہل محبت کو اس کا شیوۂ خاص
فریب و وعدہ خلافی ہے اس کا جوہر فن

(۹)

فما تدوم علی حال تکون بها
کما تلون فی اثوابها الغول

نہیں ہے اس کی طبیعت میں کچھ قرار و ثبات
کہ ایک حال پہ قائم وہ رہ سکے دم بھر
مزاج غول بیاباں کی مثل ہے اس کا
بدلتا رہتا ہے جو لحظہ لحظہ شکل دگر

(۱۰)

ولا تمسك بالعهد الذی زعمت
إلا كما تمسك الماء الغرابيل

نہیں ہے وعدہ و پیاں کا اعتبار اس کے
کہ اہل حسن کا شیوہ نہیں وفاداری
مثال عہد وفا کی جو اس کے سچ پوچھو
تو اس طرح سے ہے چھلنی میں جس طرح پانی

(۱۱)

فلا يغرنك مامنت وما وعدت
إن الأمانی والأحلام تضليل

نہ کھا فریب تمنا، نہ دیکھ وصل کے خواب
کہ خواب و آرزو کرتے ہیں نفس کو گمراہ
ہے اہل حسن کا وعدہ تمام مکر و فریب
بھرے ہے ان کا گرفتار، زندگی بھر آہ

(۱۲)

كانت مواعيد عرقوب لها مثلا
وما مواعيدها إلا الأباطيل

مثال وعدۂ عرقوب[1] ان کے وعدے ہیں
جو مکر و وعدہ خلافی میں تھا بہت ماہر
ہمیشہ ہوئی ہے دل میں تو بات ان کے کچھ اور
مگر اداؤں سے کرتے ہیں اور کچھ ظاہر

(۱۳)

أرجو و آمل أن تدنو مودتها
وما إخال لدينا منك تنويل

یہ آرزو تھی کہ ہو جائے مجھ پر وہ شیدا
ہوں ایک عرصے سے جس طرح میں فدا اس پر
مگر یہ وہم تھا، اور صرف وہم تھا میرا
کہ التفات و نوازش کسی کی ہوگی ادھر

(۱۴)

أمست سعاد بأرض لا تبلغها
إلا العتاق النجيبات المراسيل

سعاد پہنچی ہے ایسی جگہ پہ شام کے وقت
جہاں کوئی بھی نہ پہنچا سکے بہ آسانی
سوا ان اونٹوں کے، بے عیب جن کی ہوں نسلی
جمال و تیز روی میں نہ جن کے ہوں ثانی

(۱۵)

ولن تبلغها إلا عذافرة
فيها على الأين إرقال و تبغيل

وہ سرزمین، جہاں پہنچا نہیں سکے گا کوئی
سوا، ان اونٹوں کے جو ہوں قوی و سخت اقدام
وہ ناقہ جو کہ سفر خستگی کے حال میں بھی
رہے بہ جانب منزل ہمیشہ گرم خرام

(۱۶)

من كل نضاخة الذفرى إذاعرقت
غرضتها طامس الأعلام مجهول

وہ ناقہ قوم میں اپنی جو سب سے ہو ممتاز
چلے جو تیز قدم بے نشان راہوں میں
عرق فشاں دم رفتار اس کے گوش و جبیں
ہو اس کے حوصلے کا امتحان راہوں میں

(۱۷)

ترمي الغيوب بعيني مفردلهق
إذا توقدت الحزان والميل

نگاہیں اس کی ہوں یوں جستجوئے منزل میں
تپے ہوں دھوپ سے جب کوہ و دشت و ریگستان
کہ جس طرح کوئی جنگلی سفید رنگ کا بیل
بچھڑ کے گلے سے اس کے لئے ہو سرگرداں

(۱۸)

ضخم مقلدها عبل مقيدها
في خلقها عن بنات الفحل تفضيل

وہ ناقہ، حسن ہے گردن کا فربہی جس کی
اور اس کے پاؤں بھی ہوں فربہی سے حسن پذیر
جو اپنی ساخت میں بہتر ہے سارے اونٹوں سے
شرف میں جس کے نہیں ہے کسی طرح تقصیر

(۱۹)

غلباء و جناء علكوم مذكرة
في دفها سعة قدامها ميل

بلند اس کی ہے گردن، کلاں ہیں رخسارے
ہے مثل نر کے توانا، اگرچہ مادہ ہے
وہ تیز بیں ہے، حضر ہو کہ ہو سفر، اس کی
حد نگاہ میں ہر اک نشان جادہ ہے

(٢٠)

وجلدها من أطوم مايؤيسه
طلح بضاحية المتنين مهزول

ہے سنگ پشت کی مانند اس کی پشت کی جلد
بہت ہی سخت، چمکدار اور بہت ہموار
کہ جس پہ چچڑی چمٹنے میں کامیاب نہ ہو
اگرچہ بھوک سے چچڑی کی ہو نہ صبر و قرار

(٢١)

حرف أخوها، أبوها من مهجنة
و عمها خالها قوداء شمليل

مثال کوہ بلند اور سخت اس کا بدن
دراز گردن و پشت اور تیز ہے رفتار
کہ اس کا باپ ہے بھائی، تو ہے چچا ماموں
ہے جس سے اس کو بہائم میں اعتبار و وقار

(٢٢)

يمشي القراد عليها ثم يزلقه
منها لبان وأقراب زهاليل

بدن پر اس کے اگر چڑھتی ہے کبھی چچڑی
پھسل کے گرتی ہے فوراً زمین کے اوپر
کہ اس کے سینہ و پہلو ہیں اس قدر چکنے
کہ ٹک سکے نہ کوئی شئے بھی ان پر سر تا سر

(٢٣)

عيرانة قذفت بالنحض عن عرض
مرفقها عن بنات الزور مفتول

ہے چال اس کی کسی جنگلی گورخر کی طرح
پھر اس پہ فربہی کا عجیب عالم ہے
ہے ہر طرف سے وہ پر گوشت اس طرح کہ، جدا
ہمیشہ کہنیاں رہتی ہیں اس کی پہلو سے

(٢٤)

كانما فات عينيها و مذبحها
من خطمها و من اللحيين برطيل

منہ اس کا ناک کے نتھنوں سے دونوں تک
کہ جیسے سانچے میں ڈھالا گیا ہو سنگ دراز
اسی صفت سے ہے موصوف اس کی گردن بھی
مقام خلق سے کلوں تک ایک ہے انداز

(۲۵)

تمر مثل عسيب النخل ذاخصل
في غارز لم تخونه الأحاليل

دم اس کی ہلتی ہے اس طرح سے بوقت خرام
کہ شاخ خرمے کی جیسے ہوا کے جھونکوں سے
تھنوں کے حسن سے کھلواڑ کر رہی ہے وہ
سجی ہوئی ہے جو دل فریب بالوں سے

(۲۶)

قنوا حرتيها للبصير بها
عتق مبين و في الخدين تسهيل

ہے ناک اس کی محدب تو نرم ہیں رخسار
کشش ہے آنکھوں میں بھی چشم دیدہ ور کیلئے
اور اس کے کانوں کے مابین ایک تابش خاص
دلیل اصل ہے ہر صاحب بصر کے لئے

(۲۷)

تخدى على يسرات وهي لاحقة
ذوابل مستهن الأرض تحليل

ہیں ٹانگیں اس کی بہت نازک اور بہت ہی سبک
زمین پر جنہیں رکھتی ہے کم دم رفتار!
مگر وہ ساری نزاکت کے باوجود اپنی
پہنچ ہی جاتی ہے منزل پہ مثل باد بہار

(۲۸)

سمر العجايات يتركن الحصى زيما
لم يقهن رؤس الاكم تنعيل

وہ پاؤں، پنڈلیاں جن کی ہیں سرخ گندم گوں
وہ جب چٹانوں پہ ہوتے ہیں وقف تیز روی
ہٹاتے جاتے ہیں قدموں سے سنگریزوں کو
کہ احتیاج نہیں ان کو نعل کوبی کی

(۲۹)

كأن أوب ذراعيها إذا عرقت
وقد تلفع بالقور العساقيل

کمال پاؤں کی گردش کا اس کے ہو ظاہر
تپش سے مہر کی جس دم پسینہ آتا ہو
پہاڑیاں نظر آئیں سراب کی مانند
پیاسا آدمی گرمی سے بوکھلاتا ہو

(۳۰)

یوما یظل به الحرباء مصطخدا
کأن ضاحیه بالشمس معلول

زمین دھوپ سے جس روز خوب تپتی ہو
مثال آتش سوزاں ہو ریت کی حالت
چلے گر اس پہ، جھلس جائے آفتاب پرست
مجال کیا کسی انسان کو ملے راحت

(۳۱)

و قال للقوم حادیهم وقد جعلت
ورق الجنادب یرکضن الحصی قیلوا

کہے یہ قوم سے ایسے میں سارباں ان کا
ہے دھوپ تیز، بھری دوپہر ہے، کچھ سو لو
کہ ٹڈیاں بھی تمازت میں اڑ نہیں پاتیں
تو سنگریزوں سے ٹکرا رہی ہیں پنجوں کو

(۳۲)

شد النهار ذراعا عیطل نصف
قامت فجاوبها نکد مثاکیل

اسی فضا میں ہیں پاؤں اس کے اس طرح جیسے
کسی ادھیڑ سی عورت کے لمبے لمبے ہاتھ
کہ جس کے بچے کئی مر چکے ہیں، اس غم میں
وہ مل کے روتی ہے ایسی ہی عورتوں کے ساتھ

(۳۳)

نواحة رخوة الضبعین لیس لها
لما نعی بکرها الناعون معقول

کسی نے جب سے سنائی ہے آکے اس کو خبر
کہ تیرا لخت جگر چل بسا ہے دنیا سے
نہیں ہے اس کو کسی حال میں بھی صبر و قرار
سراپا نوحہ و فریاد و آہ و زاری ہے

(۳۴)

تفری اللبان بکفیها و مدرعها
مشق عن تراقیها رعابیل

وہ دونوں ہاتھوں سے مصروف سینہ کوبی ہے
ہوا ہے جس سے گریباں بھی تار تار اس کا
سکون کس طرح ہو سکتا ہے اسے حاصل
کہ لٹ چکا سبھی سرمایۂ قرار اس کا

(۳۵)

تسعى الوشاة جنابيها و قولهم
إنك يا ابن أبى سلمى لمقتول

اس اونٹنی کے دو جانب تھے دشمنوں کے گروہ
جو تیز دوڑتے جاتے تھے اور کہتے تھے
کہ تیرے قتل کا یثرب میں ہوچکا اعلان
خبر ہے کچھ؟ ابو سلمٰی کے خوش نوا پوتے!

(۳۶)

وقال كل خليل كنت آمله
لا ألهينك إنى عنك مشغول

کلام سرورِ عالمؐ کی کیا کہوں تاثیر
کہ دشمنوں کو بھی جس پر یقین کامل تھا
ہر ایک دوست، تھی جس سے مجھے امید وفا
وہ میرے سائے سے بھی دوریوں پہ مائل تھا

(۳۷)

فقلت خلوا سبيلى لا أبا لكم
فكل ماقدر الرحمن مفعول

یہ حال دیکھ کے میں نے کہا یہ لوگوں سے
کہ تم سبھی مرے رستے سے آج ہٹ جاؤ
میں جارہا ہوں بہ سوئے مدینہ بے پروا
جو کچھ خدا نے مقدر کیا ہے ہونے دو

(۳۸)

كل ابن أنثى و إن طالت سلامته
يوما على آلة حدباء محمول

کہ اس جہاں میں پیدا ہوا ہے جو بھی کوئی
ہو اس کی زندگی کچھ روز، یا کہ سالہا سال
ہر اک کا جانا ہے اک دن جنازہ گورستان
یہی ہے سب کا مقدر یہی ہے سب کا مآل

(۳۹)

أنبئت أن رسول الله أوعدنى
والعفو عند رسول الله مأمول

خبر ملی ہے کہ مجھ کو ہلاک کرنے کی
ہوئی ہے عام اجازت، لبِ رسالت سے
مگر، مرا دل امید وار رکھتا ہے
امید عفو و کرم، در گہہ نبوت سے

(۴۰)

فقد أتيت رسول الله معتذرا
والعذر عند رسول الله مقبول

تو بے شک آج رسولؐ خدا کی خدمت میں
میں لے کے آیا ہوں عذر خطا کا عزم صمیم
مجھے یقیں ہے، مری معذرت بھی ہوگی قبول
خدا گواہ کہ سرکارؐ ہیں رؤف و رحیم

(۴۱)

مهلا هداك الذى أعطاك نافلة ال
قرآن فيها مواعيظ و تفصيل

رسول پاک، عطا کیجئے مجھے مہلت
خدا کی خاص ہدایت ہو آپ کو حاصل
کہ جس سے آپ کو قرآن سی کتاب ملی
نصیحت اور بیانات جس کے ہیں کامل

(۴۲)

لاتأخذني بأقوال الوشاة ولم
أذنب و إن كثرت فى الأقاويل

نہ باز پرس کریں مجھ سے آپ شاہ رسل
کسی بھی طرح مرے دشمنوں کے کہنے سے
ہوئی نہ مجھ سے خطا کوئی شان اقدس میں
گڑھے ہیں لوگوں نے سارے یہ جھوٹے افسانے

(۴۳)

لقد أقوم مقاما لو يقوم به
أرى وأسمع مالو يسمع الفيل

کھڑا ہوں آج میں ایسے مقام پر کہ اگر
کھڑا ہو میری جگہ پر یہاں کوئی ہاتھی
میں دیکھتا ہوں جو کچھ اور جو میں سنتا ہوں
وہی اسے بھی نظر آئے اور سنے وہ بھی

(۴۴)

لظل يرعد إلا أن يكون له
من الرسول بإذن الله تنويل

تو وہ بھی مجھ کو یقیں ہے، لرز لرز جائے
رسول پاکؐ کے پاکیزہ رعب و ہیبت سے
مگر کہ حکم خدا سے ملے اماں اس کو
رسول اکرم و اعظم کے لطف و رحمت سے

(۴۵)

حتی وضعت یمینی لاأنازعه
فی کف ذی نقمات قیله القیل

یہ انتہا ہے کہ ادنیٰ منازعت کے بغیر
میں اپنے ہاتھ کو دیتا ہوں، ہاتھ میں انؐ کے
وہ جن کی شان ہے دنیا میں آج سب سے بلند
ہے قول، "قول" جو نکلے لب مبارک سے

(۴۶)

لذك أهیب عندی إذ أكلمه
وقیل إنك منسوب و مسئول

یہ اس لئے کہ ہوئی گفتگو جب آقاؐ سے
تو تھا بہت ہی میں ہیبت سے ان کی خوف زدہ
کہا گیا تھا کہ ہے کعب، تجھ پہ، وہ الزام
بجا ہے حال پہ تیرے اگر کریں گریہ

(۴۷)

من خادر من لیوث الأسد مكنته
من بطن عثر غیل دونه غیل

مری نگاہ میں ہیبت تھی آپ کی بڑھ کر
اک ایسے شیر سے، شیروں کا شیر جس کو کہوں
وہ جس کی جائے سکونت ہو ایسے جنگل میں
گھنیرے پن میں جو ہو سارے جنگلوں سے فزوں

(۴۸)

یغدو فیلحم ضرغامین عیشهما
لحم من القوم معفور خرادیل

وہ شیر جو کہ بوقت سحر شکار کرے
اور اپنے بچوں کو دے ان کی دل پسند غذا
غذا ہے جن کی کہ انسان کا تازہ گوشت
جو ریزہ ریزہ بساط زمین پر ہو پڑا

(۴۹)

أذا یساور قرنا لا یحل له
أن یترك القرن ألاوهو مغلول

وہ شیر نر کہ جو حملہ بھر کے کرتا ہے
خود اپنے جیسے ہی شیر نر و توانا پر
تو چھوڑتا نہیں ہر گز فریق ثانی کو
مگر شکست، شکست اور شکست ہی دے کر

(۵۰)

منه تظل سباع الجو ضامزة
ولا تمشي بواديه الأراجيل

وہ شیر جس کے ہراس اور رعب و دہشت سے
درندے دشت کے سب ہوں نحیف اور لاغر
شکاری کیسے ہی ماہر ہوں صید کرنے میں
ہے کس میں تاب کہ وادی سے اس کی جائے گزر

(۵۱)

ولا يزال بواديه أخو ثقة
مطروح البز والدرسان مأكول

ہمیشہ ملتا ہے وادی میں اس کی کوئی شجاع
پڑا ہوا کسی کھائی ہوئی غذا کی طرح
زمین پر کہیں بکھرے ہیں اسلحہ جس کے
کہیں لباس پڑا ہے پھٹی ردا کی طرح

(۵۲)

إن الرسول لنور يستضاء به
مهند من سيوف الله مسلول

ہے ایک نور بلاشک رسولؐ کی ہستی
جہاں میں جس سے سبھی کر رہے ہیں کسب ضیا
خدا کی تیغوں میں سے ایک تیغ ہندی ہے
نیام سے جو چمکتی ہے اپنی ہو کے جدا

(۵۳)

في عصبة من قريش قال قائلهم
ببطن مكة لما أسلموا زولوا

رسول ماہ ہدایت، قریش تھے ہالہ
ہوئی سعادت اسلام جب نصیب انھیں
کہا تھا ان میں سے یہ ایک کہنے والے نے
کہ مکہ چھوڑ کے ہجرت سوئے مدینہ کریں

(۵۴)

زالوا فمازال أنكاس ولا كشف
عند اللقاء ولا ميل معازيل

تو شہر مکہ سے وہ ٹل گئے، مگر نہ ٹلا
کوئی بھی ان میں کا کفار کے مقابل سے
وہ چاہے کیسا ہی کمزور اور نہتھا ہو
رہا ہے معرکہ آرا ہجوم باطل سے

(۵۵)

شم العرانين أبطال لبوسهم
من نسج داؤد فى الهيجا سرابيل

بلند و بالا ہیں وہ اونچی ناک والے ہیں
نہیں جواب زمانے میں جن کی جرأت کا
ہیں گویا پیرہن جنگ ان کا وہ زرہیں
کہ جن کو حضرت داؤدؑ نے بنایا تھا

(۵۶)

بیض سوابغ قد شكت لها حلق
كأنها حلق القضاء مجدول

وہ صاف زرہیں کہ ہیں رنگ جن کے تیز سفید
جو اپنی خوبیٔ صنعت سے ہیں درخشندہ
اور ان میں حلقے بھی ہیں جس طرح کہ قفعا میں
ہر ایک حلقہ ہے اک دوسرے سے پیوستہ

(۵۷)

لا يفرحون إذا نالت رماحهم
قوما وليسوا مجازعا إذا نيلوا

وہ ایسے لوگ ہیں جن کو نہ فخر ہو نہ خوشی
جب ان کے نیزے کسی قوم پر برستے ہیں
ہو ان پر وار تو فریاد بھی نہیں کرتے
کہ مرگ و زیست کے ختم ان پہ سب سلیقے ہیں

(۵۸)

يمشون مشى الجمال الزهر يعصمهم
ضرب إذا عردالسود التنابيل

سفید اونٹوں کی مانند چلتے ہیں وہ لوگ
اور ان کی ضرب حفاظت کا کام کرتی ہے
فرار کرتے ہیں ان کے مقابلے سے جب
وہ جن کے چھوٹے ہیں قد اور شکل کالی ہے

(۵۹)

لا يقع الطعن إلا فى نحورهم
وما لهم عن حياض الموت تهليل

انہیں کے سینے ہیں آماجگاہ نیزوں کی
کہ موت بھی نہیں کرسکتی ہے انہیں پسپا
وہ پیچھے ہٹتے نہیں موت کے مقابل سے
جری بناتا ہے جذبہ انہیں شہادت کا

حواشی :

۱۔ عرقوب، عرب میں ایک شخص گزرا ہے جو انتہائی وعدہ خلاف تھا اور اس کا نام وعدہ خلافی کے لیے ضرب المثل بن گیا ہے۔

۲۔ یہ مضمون بہت ہی عجیب سا اور انسانوں کے سلسلے میں یقیناً انتہائی شرمناک ہے لیکن جانوروں اور مخصوصاً اونٹ کے سلسلے میں یہ بات اس کی خوبی، قوت اور شرافت سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنی نسل کی قریب ترین اونٹنی سے بارداری کے نتیجے میں وجود پذیر ہوا ہو۔

۳۔ آفتاب پرست : گرگٹ

۴۔ ایسی ہی عورتیں یعنی جن عورتوں کے اسی کی طرح بچے مر چکے ہوں۔

۵۔ اصل عربی شعر میں ابن ابی سلمٰی ہے جس کے معنی ہیں ابو سلمٰی کا بیٹا، یہاں حضرت کعبؓ نے ضرورت شعری کی وجہ سے ابن زہیر کی جگہ ابن ابی سلمٰی نظم کیا ہے مراد خود حضرت کعبؓ ہیں جو ابو سلمٰی کے پوتے تھے، اسی لیے ترجمے میں "پوتے" لکھا گیا ہے۔

۶۔ ایک کہنے والے سے مراد یہاں پر حضرت عمرؓ ہیں ان کے نام اور مشورۂ ہجرت کی صراحت تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے۔

۷۔ ٹل گئے، یعنی مصلحتاً اور حکم خداوندی مکہ سے مدینہ کو ہجرت کر گئے، مگر جہاد پر برابر اٹل رہے اور کفار کے چھکے چھڑاتے رہے۔

۸۔ قفعاء : ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے جس کی ڈنڈیوں میں انگوٹھی کی طرح کے حلقے ہوتے ہیں اور ان حلقوں کے کنارے ایک دوسرے میں پیوست ہوتے ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی

سندھی میں نعتیہ شاعری

عزیزم صبیح رحمانی نے اب تک "نعت رنگ" کے جو صوری و معنوی لحاظ سے بہت ہی خوبصورت اور لائق تحسین شمارے پیش کیے وہ مثالی حیثیت رکھتے ہیں اور ان شماروں کے حوالے سے مجھے بھی یہ سعادت نصیب ہوئی کہ سندھی نعتیہ شاعری کے بارے میں کچھ تعارفی مضامین لکھ سکا جنہیں "نعت رنگ" کے قارئین نے پسند کیا۔ اب یہ معروضات ایک ایسی کتاب کے تعلق سے قارئین کی نذر کر رہا ہوں جو سندھی زبان میں ہے اور اس کا نام ہے "سندھی میں نعتیہ شاعری"

"یہ کتاب ڈاکٹر عبدالجید میمن سندھی کی تحقیق و تحریر سے عبارت ہے۔ اور اسے سندھی ادبی اکیڈمی لاڑکانہ نے قریب قریب بیس برس پہلے شائع کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بعد کی نعتیہ شاعری کے کچھ نقوش جدید اس کی زینت نہ بن سکے خصوصاً شیخ ایاز نے اپنی زندگی کے آخری دور میں جو حمدیہ و نعتیہ نگارشات یادگار چھوڑیں وہ ڈاکٹر میمن کی رحلت کے بعد کی ہیں اور ان پر ایک مضمون راقم الحروف کا تحریر کردہ "نعت رنگ" کے گزشتہ کسی شمارے میں شامل ہو چکا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالجید میمن نے تین سو صفحات سے زیادہ صفحات کی اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب سندھی نعتیہ شاعری کی تاریخ کے حوالے سے نعت کی تعریف اور نعتیہ شاعری کے محرکات پر ہے دوسرے باب میں عربی نعتیہ شاعری اور بلند پایہ نعت گو شعراء کا تذکرہ ہے جس میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا ذکر خیر بھی شامل ہے۔ تیسرا باب فارسی نعت گوئی اور نعت گو شعراء کے سوانحی کوائف نیز نعتیہ کلام کے نمونوں کو یکجا کرتا ہے۔ اس باب میں سندھ کے ان شعراء کا تذکرہ بھی ہے جو فارسی نعت گوئی میں مشہور ہوئے۔ یہ تینوں ابواب اس لیے ضروری تھے کہ سندھی نعتیہ شاعری نے عربی اور فارسی نعتیہ شاعری کا ہمہ گیر اثر قبول کیا ہے۔ بہر کیف چوتھا باب جو سندھی زبان کی نعتیہ شاعری کے لیے مخصوص کیا گیا ہے اس کا ابتدائیہ کچھ یوں ہے کہ "قدیم زمانے سے سندھی شاعروں کی یہ روایت رہی ہے کہ انہوں نے کسی حاکم یا کسی امیر کبیر کی قصیدہ خوانی نہیں کی ہے لیکن ہر شاعر نے دونوں جہانوں کے سردار، انبیائے کرام کے تاجدار محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثناو صفات کا بیان کیا ہے۔ سندھی شاعری کی ہر صنف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اشعار موجود ہیں اور کلام اتنا زیادہ ہے کہ اس کے لیے کئی ضخیم جلدیں درکار ہیں۔"

ڈاکٹر عبدالجید میمن سندھی کی تحقیق کے مطابق سندھی کی قدیم نعتیہ شاعری کا جو ذخیرہ دستیاب

ہو سکا ہے اس میں اوّلیت کا درجہ اس نظم کو حاصل ہے۔ جو مخدوم پیر محمد لکھنوی کی تصنیف ہے اور اس کا تعلق سولھویں صدی کی سندھی شاعری سے ہے۔ مخدوم صاحب ضلع سکھر کے لکھی تعلقہ کے رہنے والے تھے۔ نظم میں صبا کو مخاطب کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے حضور سلام و پیام پہنچانے کی باتیں ہیں۔ یہ نظم الف اشباع کے انداز میں لکھی گئی یعنی نظم کے ہر مصرعے کا اختتام "الف" پر ہوتا ہے گویا الف کے اضافے سے قافیہ پیمائی کا کام لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر چند ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں۔

ای صبا! واء صبح جا خاطی خیر ھتاء
تون ریبارو رحمان جو ء قاصد قربا
تون مانجی محبوبن جو پیک سندو پریا
تون باندی پیارن جو اولی اکثریا
توں ساتی سکا ین جو ماھر مشتاقا
آئی عجین جو خبرون خوشحالا
تکی ٹوڑ این جی توکی آھ ادا
تکی توڑ این جی تو کی آھ آرا

ترجمہ: "اے صبا اے نسیم سحر! تو اللہ کی پیامبر ہے اور محبوب کی قاصد ہے اور تجھے محبوب کا قرب حاصل ہے۔ تو محبوب کے پاس جانے آنے والی ہے۔ تو محبت کرنے والوں کی رفیق اور عاشقوں کی محرم راز ہے۔ تو محبوب کی جانب سے اچھی خبریں لانے والی ہے۔ فراق کے دردام مندوں کے پیغام لے جا۔ درد فراق کے مارے ہوؤں کی دوا تیرے پاس ہے"

الف اشباع کی اس نعتیہ نظم میں وہ اشعار بڑے پر اثر ہیں جن میں مخدم پیر محمد لکھوی نے اظہار مدعا کیا ہے۔ اشعار کا ترجمہ کچھ یوں ہے

"اے صبا! تو نے حضور ﷺ کے روضہ اقدس کے سامنے عجز کے ساتھ جا کر حاضر ہو اور عرض کر کہ پیر دہا عرون کا بیٹا اور الیاس کا پوتا سندھی ہے اور سندھ کا باشندہ ایک رقیق القلب عاشق جسے قسمت نے لکھی میں قید کر دیا ہے"

میں سرتاپا عشق میں ڈوبا ہوا ہوں۔ اے مہربان ساتھی! جلدی تیار ہو اور راہ میں کہیں منزل نہ کر۔ پیرو کو سلامتی کے ساتھ روضہ رسول ﷺ تک پہنچا دے "مخدوم پیر لکھوی کے بعد کتنے ہی عالموں اور

شاعروں نے اسی قسم کی طویل منظومات سندھی میں لکھیں۔ مخدوم ابوالحسن، شاہ لطف اللہ قادری، مخدوم ضیاء الدین اور مخدوم ہاشم ٹھٹوی اٹھارویں صدی کے شعرا میں نعتیہ شاعری کے حوالے سے بھی ممتاز ہیں۔
دراصل مذکورہ عالم و شاعر سندھ میں کلہوڑہ دور حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اس دور میں فارسی کا بول بالا تھا مگر فارسی کے عالم و شاعر سندھی میں بھی شعر کہتے تھے خصوصاً نعتیہ کلام کو الف اشباع اور سندھی کے روایتی بیتوں میں یا گیت کی صورت میں مخدوم محمد ہگائی اور مخدوم عبداللہ جیسے باکمالوں نے عروج بخشا۔
کلہوڑہ دور حکومت کے بعد تالپور حکمرانوں کے دور میں بھی فارسی کا اثر و نفوذ برقرار رہا تاہم سندھی اور اردو شاعری نے بھی بڑی مقبولیت پائی جس کی روشن مثال شاعر ہفت زبان حضرت بچل سرمست کے کلام سے ملتی ہے انہوں نے سندھی میں نعتیہ ڈوھیڑوں اور کافیوں کو رواج دیا۔

مصنف نے چوتھے باب کی فصلِ دوم میں شعراء اور ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیتے ہوئے چند کتابوں کا تذکرہ بھی کیا ہے مثلاً مخدوم عبداللہ جو باکمال عالم و شاعر تھے انہوں نے چودہ کتابیں لکھیں اور یہ تمام کتابیں منظوم ہیں جو اسلامی تعلیم و تاریخ کی آئینہ دار ہیں مگر موضوعاتی لحاظ سے متنوع ہوتے ہوئے بھی ان میں نعتیہ شاعری کی جھلکیاں موجود ہیں مثلاً کنز العبرت، بدرِ منیر، قمر المنیر، غزوات، خزانۂ اعظم، نور الابصار اور ہفت بہشت وغیرہ۔

کتابوں کے نام عربی و فارسی معلوم ہوتے ہیں حالانکہ ذریعۂ اظہار سبھی کا سندھی زبان ہے۔
انیسویں صدی کے سندھی شعراء میں مولوی محمد حسین، قاضی عبدالکریم اور مخدوم فضل اللہ جیسے کئی اہل سخن نے نعتیہ کلام کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے متفنی اصناف کے علاوہ سندھی بیتوں کی صورت میں ان بیتوں کو عروج بخشا جو "شاہ جو رسالو" میں ہیں۔

اسی عہد میں الف اشباع، کی ہیئت کو ایک بلند پایہ سندھی عالم عبدالرحمن نے "نورنامو" میں بڑی عمدگی سے برتا۔ یہ مشہور و مقبول کتاب پورے سندھ کے مکتبوں میں قرآن شریف پڑھنے کے بعد بچوں کو خصوصی طور پر پڑھائی جاتی تھی۔

"نورنامو" کے علاوہ عہد نامو، چوء علمی، معراج نامو، سراج الاسلام اور کئی دوسری کتابوں میں جو نعتیہ کلام ملتا ہے اس کی خصوصیات میں بھی زبان و بیان کی وہی کیفیات ہیں جن کا ذکر پہلے کیا گیا۔
چوتھے باب کی تیسری فصل میں ڈاکٹر عبدالمجید میمن نے مدح، مناجات اور معجزات جیسے عنوانات کے تحت مخدوم عبداللہ واعظ، میاں سرفراز کلہوڑو اور کئی دوسرے شعراء کا ذکر کیا ہے جنھوں نے مدح اور

مناجات کے انداز میں سندھی کی نعتیہ شاعری کو وسعت دی۔ یہ سلسلہ قدیم شعراء سے لے کر تالپور دور تک اور پھر برطانوی دور حکومت میں بھی قائم رہا۔ حمل خان لغاری، شاہ محمد دیدڑ، اللہ بخش لغاری، یوسف عطار، کمال فقیر، محمد مداحی، مولوی محمد ملاح، خیر شاہ، مولوی احمد ملاح نواب اللہ داد خاں لغاری اور اسد اللہ شاہ فدا کا نام اس سلسلے میں نمایاں رہا ہے۔

چوتھی فصل میں سہ حرفی، لولی اور سہرو جیسی اصناف شعری کا جائزہ ہے اور ان اصناف میں جن شعراء کا نعتیہ کلام پیش کیا گیا ان میں آخوند محمد بچل انور، گل محمد بھادن علی شاہ ساقی، علی مراد عاصی اور کئی دوسرے اہل سخن شامل ہیں۔

پانچویں فصل میں مولود شریف کا تذکرہ ہے جو کلہوڑہ دور سے دورِ حاضر تک سندھ کے کونے کونے میں مقبول ہے۔ پھر چھٹی فصل میں اس نعتیہ کلام کا جائزہ لیا گیا ہے جو عربی اور فارسی کی عروضی اصناف شعری مثلاً قصیدہ، غزل، رباعی، مخمس، مسدس اور مثنوی کی شکل میں ہے جن شعراء نے ان اصناف میں نام پایا وہ تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ ہیں اس لیے چند نمایاں ناموں میں غلام محمد نظامانی، علی محمد قادری، سید غلام مہدی شاہ، میر عبدالحسن سائگی، مولانا تاج محمود امروٹی اور مولوی غلام اللہ کا نام شامل ہے۔ ساتویں فصل میں مولود خوانی کا تذکرہ ہے اور آٹھویں فصل میں سندھی نعتیہ شاعری کا جائزہ لیا گیا ہے جو اجمالی طور پر سندھی کی کلاسیکی اور عروضی ہیئتوں (Forms) میں نعتیہ کلام کے بارے میں بہت ہی مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔

کتاب کے آخری دو ابواب نعتیہ کلام کی مثالوں اور منتخبہ نعتوں پر مشتمل ہیں ان میں وائی، بیت، کبت، الف اشباع، مداحوں، مناجاتوں، مسدس، مثنوی، قطعات اور قصیدہ بردہ شریف کے سندھی منظوم تراجم کے نمونے ہیں علاوہ ازیں قرآن حکیم کی چند سورتوں کو بھی منظوم صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ کچھ شکلیں شیخ سعدیؒ اور دوسرے فارسی شعراء کی نعتوں پر تضمین کا سماں دکھاتی ہیں۔

آخری چند صفحات میں شعراء کا تعارف اور دو سو کے قریب ان نادر و نایاب کتابوں اور مخطوطات وغیرہ کی فہرست ہے جن سے فاضل مصنف نے کسب فیض کیا۔

سندھی نعتیہ شاعری پر یہ بہت ہی وقیع تحقیقی کتاب ہے جس سے خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ صدیوں کی علمی و ادبی پیش رفت میں سندھی زبان نے کتنی جامعیت کے ساتھ آقائے نامدار حضور نبی کریم ﷺ کی مدحت و ثنا خوانی کو نعتیہ کلام کی متنوع صورتوں میں پیش کیا ہے۔

عزیز احسن

"نسبت" احساس اور لطافت کا مرقع

روح لطیف ہے۔ جسم کثیف، انسان اسی لیے لطافت اور کثافت کا امتزاج ہے کہ :۔

؎ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

انسانی مزاج پر کثافت غالب آجائے تو وہ جوہر انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے لیکن جب اس پر لطافت کا غلبہ ہو تو یہی انسان ملکوتیت سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اپنے احساس، اپنے جذبے اور اپنی کیفیات کے اظہار کے لیے لفظ کا استعمال کرتے ہوئے بھی کتراتا ہے کہ لفظ اسے کثیف لگتے ہیں اور احساسِ لطافت کی شدت کے زیرِ اثر وہ لفظوں کے ڈھیر میں خود کو محبوس پاتا ہے۔

احساس کی دنیا میں یہ کیفیات جب صورتِ اظہار پاتی ہیں تو کثیف لفظوں میں بھی لطیف جذبوں اور احساس کا کومل پن محسوس ہونے لگتا ہے۔ لفظ جذبوں اور احساس کی لطافتوں کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں تو شاعر اُن جذبوں اور احساسات کی صرف شبیہیں (Images) بنا دیتا ہے ؎

الفاظ کے محبس میں خموشی رہی کتنی
کی اُن کی ثناء ہم نے مگر دیدۂ نم سے

احساس کی قندیل روشن ہوتی ہے تو مادی دنیا میں گزرنے والے لمحے انسان کو بکھرے ہوئے، بے ترتیب اور بے ہنگم لگنے لگتے ہیں اور انہی لمحوں میں وہ اپنے احساس کو انتشار کا شکار پاتا ہے۔ کثافت روحانی اطمینان برقرار نہیں رہنے دیتی۔ غلبۂ مادیت کے مظاہر احساس کو زخمی کر دیتے ہیں لیکن روحِ شاعر کا روحِ محمدی علیٰ صاحبہا سے انسلاک شاعر کو سلامت رکھتا ہے ؎

بکھرے ہوئے لمحوں میں سلامت ہیں دل و جاں
یہ تیری عطا ہے مرے مولا، مرے آقا ﷺ

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھا ہے: "جدید عہد کی بیماری یہ ہے کہ خدا اور بندے کے بارے میں محسوس کرنے کی صلاحیت مفقود ہو گئی ہے"...... اسلامی معاشروں میں اس بیماری کے مظاہر الحادی فکر کے فروغ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ پاکستانی ادب بھی برسوں لادینی تحریکوں کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ صد شکر کہ ہماری شاعری میں ایک توانا رجحان حبِ رسول ﷺ کے اظہار کا ہر عہد میں موجود رہا ہے جس نے ہر عہد کی

شاعری میں اپنے نقش قائم کیے ہیں۔ تاہم احساس کے تار اس طرح چھیڑنا کہ خدا اور بندے کو بوسیلۂ رسالت محسوس کیا جا سکے...... صرف اچھی شاعری کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کیونکہ بقول ورڈزورتھ "تمام اچھی شاعری شدید احساسات کا برجستہ اظہار ہے"...... میرے خیال میں ابوالخیر کشفی کی شاعری اس کمی کو پورا کر سکتی ہے۔ ایسی ہی شاعری کے ذریعے مذہبی احساس کے فقدان کا علاج ممکن ہے۔

مدینہ ایک شہر ہے۔ شہر اپنی حدود و ثغور، مادّی ثروت مندی اور ثقافتی مظاہر سے پہچانا جاتا ہے۔ بلند و بالا عمارات، کاروباری مراکز، وسیع سڑکیں اور کشادہ گزرگاہیں۔ لیکن یہ خصوصیات تو دنیا کے کسی بھی شہر کی ہو سکتی ہیں۔ مدینے کی حیثیت، قلبِ مومن اور ہجر زدہ مسلمان کے لیے کیا ہے؟ اس کا بیان گلاب کی سی لطافت اور خرام نسیم کی سی صباحت چاہتا ہے۔ لیکن مادّی لفظ احساس کی روح قائم نہیں رکھ سکتے۔ اظہار کے مراحل طے کرتے ہوئے آبگینۂ احساس کی چمک دمک برقرار نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ شاعر مدینے کا بیان نہیں کرتا...... صرف ایک تاثر کو زبان دینے کی کوشش کرتا ہے۔

مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسنِ کلام
مدینہ حسنِ سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

مدینے کی فضاؤں میں شاعر کی احساساتی دنیا وسیع اور تاریخی حوالے ذہن و دل پر وسیع تر منظر پیش کرتے ہیں۔ شاعر اپنے عہد کی آگاہی سے رنجور اور اپنی شناخت کی گمشدگی پر پشیمان ہے۔ سو اپنے ملجا و ماویٰ سے یہ التجا کرتا دکھائی دیتا ہے۔

عثمانؓ و ابوبکرؓ و علیؓ کی تجھے سوگند
مل جائے مجھے میری خبر سیدِ عالم ﷺ

اُس التجا کے طفیل میں جب اُسے خود آگاہی کا لمحہ میسر آجاتا ہے تو اُس کا یہ احساس جاگتا ہے کہ انسانیت بڑی دُکھی ہے اور اُس کو کوئی مامنِ سکون اور مرکزِ شفقت درکار ہے لہٰذا وہ اپنی آواز قدرے بلند کرتا ہے اور پوری انسانیت سے مخاطب ہو کر، خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے۔

اس رحمتِ عالم کی عطا سب کے لیے ہے
سرکار ﷺ کی شفقت کی رِدا سب کے لیے ہے

شاعر کا وادیٔ نعت میں قدم رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے فکر و خیال کو حسن بون حب کے تابع کرنے اور لفظ کو اس عشق کی روداد رقم کرنے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ "نسبت" کی شاعری احساس کی شدت کی غماز ہے اور اس حقیقت کی آئینہ دار بھی کہ شاعر نے قلبی واردات کے اظہار کے مرحلے پر بر جستگی کا خاص خیال رکھا ہے۔ شعر لطافتِ اظہار کے ساتھ سچائی کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ شعر تخلیقی لمحات میں شعور کی براہِ راست مداخلت سے شعر نہیں رہتا بلکہ بیان یا نعرہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جس جذبے کا اظہار مطلوب ہو اس جذبے کو خود پر طاری کرنے کی شعوری کوشش بھی شعر کو غیر شعر بنا دیتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں جذبے، کیفیت اور احساس کے بیان میں کذب کی ذرا سی شرکت بھی شاعری کے لیے سم قاتل ہے۔ سید الخیر کشفی اس نازک ذمہ داری سے آگاہ ہیں اس لیے ان کے اشعار میں بر جستگی (Spontaneity) کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے اور اشعار کے متن (Text) میں صداقتوں کی روشنی بھی۔ دیکھئے انھوں نے کتنی سچی بات کس قدر خوبصورتی سے کہی ہے ؂

حُسنِ تقدیرِ بشر آپ ﷺ سے وابستہ ہے

ایک شعر میں اس صداقت کو ایک وسیع تناظر میں متن شعر بنایا ہے ؂

تاریخ محمد ﷺ کا نشانِ کفِ پا ہے
انسان کو معراج ملی اُن کے قدم سے

شعر اپنے خالق کی فکری روش کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنے نظریۂ فن اور شعری آدرش کے مطابق شاعری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کوشش میں کامیابی کسی کسی کو ہی میسر آتی ہے۔ کشفی صاحب کی شاعری کی قرأت کے لمحوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کے نظریۂ فن کی بھرپور عکاسی کرتی ہے کیونکہ ان کا شعری نظریہ ان کی تخلیقی دانش کا جزو بن چکا ہے۔ نسبت میں "پیش گفتار" کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل شاعری اس تحریر کے مافیہ (Content) کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ کشفی صاحب لکھتے ہیں:

"نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان (ﷺ) کی خدمتِ عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف و صوت کی دنیا میں کبھی مل جائے!"

اس بیان کی روشنی میں یہ اشعار ملاحظہ ہو ؂

مرا وجود محمد ﷺ کے نام سے قائم

چراغِ کعبہ سے روشن ہیں سب ہنر میرے

میرے اشکوں سے بنے گنبد خضریٰ کی شبیہ

تیری رحمت ہو عطا دیدۂ نم کی صورت

اُن ﷺ کی امت کا فرد ہے کشفی

ایک اذنِ عطا ہے آنکھوں میں

نعت میں مخاطبہ، اہلِ فکر و نظر کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور حضور اکرم ﷺ سے براہِ راست تخاطب تو ذرا سی بھی دراز نفسی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی مواقع پر شعراء کو پرکھا اور قادر الکلامی کا غرہ رکھنے والے مدّعی اساتذہ کو جانچا جاتا ہے۔ کشفی صاحب نے اس مرحلے پر وہ شبیہ (Image) بنائی ہے کہ اس لفظی تصویر کشی پر مصوّر کو بھی رشک آنے لگے۔ نوا، غیر مجسم اور مجرد (Abstract) ہے اسے گنبد خضریٰ کے گرد تنہا اُڑنے والے پرندے سے تشبیہ دے کر انھوں نے پورا منظر بھی Visualize کروادیا ہے اور اپنے احساس کو نوا دے کر اپنے آقا و مولا ﷺ سے مخاطبے کے ضمن میں درکار ادب و احترام بھی برقرار رکھا ہے۔ شاعری کی مصوری پر فوقیت ثابت کرنے کے لیے ایسے ہی اشعار کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

وہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائر تنہا

کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقا

مخاطبہ کا حسن مزید ملاحظہ ہو۔

حضور ﷺ! حجرۂ تاریک میں مری آنکھیں

قلم کو صفحۂ کاغذ پہ دیکھ کر رقصاں

نئی بصارت و توفیق کی شہادت ہیں

بعض مصرعے فنی پختگی اور شعری سلیقہ مندی کی وجہ سے پورے پورے اشعار بلکہ نظموں پر بھاری دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً

حُسنِ تقدیرِ بشر آپ ﷺ سے وابستہ ہے

اس مصرعے کی قرأت دو طرح سے کی جاسکتی ہے۔ حضور ﷺ سے مخاطبے کے انداز میں اور نبی نوع انسان سے تخاطب کی صورت میں۔ اول الذکر قرأت میں التجا پوشیدہ ہے اور استمداد کا کنایہ موجود ہے۔

☆...... حضور ﷺ! بشر کی تقدیر کا سنورنا آپ ہی کی نگاہِ عنایت پر موقوف ہے۔

ثانی الذکر قرأت میں ایک نعرہ مستانہ مضمر ہے

☆ یاایہاالناس ـــ اے گروہ انسان امن رکھو کہ تمہاری تقدیروں کا سنورنا حضورِ اکرم ﷺ کے دامنِ عاطفت میں آنے پر موقوف ہے۔

اس طرح ایک ہی مصرعے کی خطابیہ اور خبریہ دونوں شکلوں میں قرأت کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح درج ذیل مصرعے اپنے ابلاغ کے لیے دوسرے مصرعوں کے محتاج نہیں ہیں۔

اس چہرۂ اقدس کی ضیاء سب کے لیے ہے

یا

دامانِ رسالت کی ہوا سب کے لیے ہے

قرأتوں کی تبدیلی کے حسن، مصرعوں کی جامعیت اور اعجازِ بیان کے علاوہ ان مصرعوں کے مافیہ (Content) کو پرکھا جائے تو سارے زمانوں کی گواہی ملتی ہے کہ بات حق و صداقت پر مبنی ہے۔ عہد حاضر میں بنی نوع آدم کی توجہ اس سچائی کی طرف مبذول کروانے سے بہتر کوئی اور عمل ہو بھی نہیں سکتا۔ تبلیغ دین متین کے لیے ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو نعرہ بازی کی بلند آہنگی اور اس کی کم اثری سے محفوظ ہو۔ اس طرح شعر کا ادبی حسن اور شعری جمال نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ مذہبی تقدس بھی برقرار رہتا ہے۔ اب ذرا دیکھئے اس خطابیے میں کس قدر زندہ حقیقت جزوِ ہنر بنی ہے۔

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشتِ خاک تری جستجو میں زندہ ہے

بات اگر استفہامیہ انداز سے کہی جائے اور ایسی حقیقتیں پیش کی جائیں جن کا ادراک ایک طرف کشفِ حجاب کا باعث ہو سکے اور دوسری طرف بلا اشتباہ حقیقت تک رسائی بھی ممکن ہو تو اس اندازِ تخاطب کو مناظرانہ بلند آہنگی کے سقم سے اُسی صورت میں بچایا جا سکتا ہے جب شعری جمالیات کا بھرپور احساس قائم رہ سکے اور لہجہ ملیح اور دھیمہ ہو۔ استفہام اقراری کا ایسا ہی نمونہ درجِ ذیل اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟
افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟
کس نام سے ملتی ہے شفا اہلِ جہاں کو
کونین کو یہ حرفِ دعا کس سے ملا ہے؟

ہر نقش میں اک شانِ کریمی ہے خدا کی
یہ پردۂ انوار و ضیاء کس سے ملا ہے؟
یہ دولتِ انداز۔ نظر کس کا کرم ہے؟
یہ سلسلۂ فکرِ رسا کس سے ملا ہے؟
جز احمد مختار ﷺ کے نقشِ کفِ پا کے
انسان کو یہ نورِ خدا کس سے ملا ہے؟

اِس استفہام اقراری میں یہ شعری صباحت اور یہ فنی نفاست اس لیے پیدا ہو سکی کہ شاعر نے اس میں لوگو! بھائیو! دوستو! تم ہی کہو جیسے خطابیہ ضمائر استعمال نہیں کیے ہیں۔ شاعر کا استفہامیہ لہجہ تاثراتی ہے اور فکری استغراق کی نشاندہی کر رہا ہے۔

مزید برآں اس میں صدق و صفا، حیا، دعا، ضیا اور فکرِ رسا جیسی لطیف علامتوں کے نقوش بنے ہیں جن میں لہجے کی نرمی، اظہار کے شاعرانہ پن اور احساس کی لطافت کی عکاسی ہے۔

انسانیت سیرتِ سرکارِ دو عالم ﷺ کے دائمی استمرار (Perpetuality) سے فیضیاب ہوتی رہے، یہی منشائے رب العالمین ہے۔ اسی منشا کو پورا کرنے کی غرض سے قرآنِ کریم میں فرمایا گیا "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ" تحقیق اللہ کے رسول اللہ ﷺ (کی حیاتِ طیبہ) میں تمہارے لیے بہترین نمونۂ (عمل) موجود ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی ارشادِ ربانی کے تحت اس بات کا مکلف ہے کہ اس میں ہر لمحہ ہر ساعت، ہر عہد اور ہر منطقے میں ایسے لوگ موجود رہیں جن کی سیرت، اسوۂ ختم الرسل ﷺ کی جھلک رکھتی ہو تاکہ ہر عہد میں سعید روحیں ان کے عمل سے متاثر ہو کر صراطِ مستقیم پر چلنے کا فیصلہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ سے آج تک ہر عہد میں مردانِ کار موجود رہے ہیں جن سے انسانیت نے عمل کی راہیں اور حسنِ کردار کی ادائیں سیکھی ہیں۔ اسلامی ادب میں منقبت نگاری کا رجحان بھی اسی تاثر پذیری کے تحت پیدا ہوا ہے۔ نعت گوئی کے ہنگام جب رجال الملت کا تصور قائم ہو جائے اور طبیعت ان کے کردار کی اس لیے تعریف کرنے پر مائل ہو کہ انھوں نے اپنی سیرتوں کو جگمگانے کے لیے سراجِ منیر ﷺ سے روشنی کی خیرات مانگی تھی جو انھیں عطا ہو گئی، تو منقبت کے ایسے اشعار وجود میں آجاتے ہیں جن سے اسوۂ رسول ﷺ کا دائمی استمرار مترشح ہوتا ہے۔

میرے سید، مرے حامد پہ کرم ہو یا رب

فیضِ احمد ﷺ سے جو قرآں پہ نظر رکھتے ہیں

(سید حامد حسن، بلگرامی مدظلہ)

شہرِ طیبہ میں ملے حضرتِ شرقی ہم کو

وہ جو سرکار کی مدحت کا ہنر رکھتے ہیں

(سید عبدالعزیز، شرقی مرحوم)

تم غلامانِ محمد ﷺ سے ملو تو کشفی

وہ تو احوالِ دو عالم کی خبر رکھتے ہیں

حضورِ پر نور سید عالم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات سے محبت اور حسنِ سلوک کا جو عملی مظاہرہ فرمایا ہے اس میں امت کے لیے یہ پیغام ہے کہ عائلی زندگی خوشگوار بنانے اور معاشرے میں راست اقدار کی ترویج کے لیے زوجین میں باہمی محبت پروان چڑھتی رہے۔ ''نسبت'' میں ایسی شاعری کے نمونے بھی موجود ہیں جو ایک پاکیزہ خیال اور انسانی رشتوں کی اہمیت کا دینی سطح پر ادراک رکھنے والے شوہر کی فکری راست سمتی کے آئینہ دار ہیں۔ نعت گوئی کے الہامی لمحوں میں جہاں جہاں کشفی صاحب کو اپنی اہلیہ کا خیال آیا ہے انھوں نے اپنی التماس میں اپنی شریک زندگی کا نام ضرور شامل کیا ہے۔ موصوف کی شاعری کی یہ ایک منفرد جہت ہے۔

بلقیس کے ہونٹوں پہ ترے نام کا نغمہ

اس پر بھی عنایت کی نظر سیدِ عالم

کعبہ کے مقابل تجھے دیکھا ہے نظر نے

ہاں ربِ محمد ﷺ کی عطا تیرے لیے ہے

ماؤں کی ردا سایۂ الطافِ الٰہی

صدیق؄ کی بیٹی کی حیا تیرے لیے ہے

ہر لحہ ترے لب پہ درود اور ثنا ہے

خاصانِ محمد ﷺ کی دعا تیرے لیے ہے

بلقیس بھی کشفی بھی پریشان ہیں دونوں

اب ربِ محمد ﷺ کی عنایت پہ نظر ہے

اس کے علاوہ، ایک دعا، ایک نعت کشفی اور بلقیس کی طرف سے، ایک گواہی بلقیس کے لیے...... ایسی تخلیقات ہیں جن میں انسانی رشتوں کے پاکیزہ جذبات کی عکس گری کی گئی ہے۔ اس حوالے کی وجہ سے نعت کو عملی زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کرنے والے شعراء میں کشفی صاحب کو اوّلیت حاصل ہے۔

تلمیح سے حسنِ شعر میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کی تفہیم کے لیے تاریخ سے آگاہی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے تلمیح کی شعر میں اس طرح کی بُنت کو پسند کیا جاتا ہے کہ اگر تلمیحی اشارہ نہ بھی سمجھا جائے تب بھی شعر کا ابلاغ بھرپور ہو سکے۔ مثلاً

چوڑی بجتی ہے تو برکت کی صدا آتی ہے
مرضیٔ شاہِ ہدیٰ رنگِ حنا میں شامل

اس شعر میں تلمیحی اشارہ بھی ہے اور اسلامی ثقافت کا نسائی عنصر بھی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے...... لیکن شعر کا ابلاغ تفہیم تلمیح کا محتاج نہیں ہے۔

نسائی جذبات کی نقش گری کے لحاظ سے جو اختصاص شاعر نسبت کو حاصل ہے اس کا مظاہرہ جا بجا ہوا ہے۔ شاعر نے مواجہ شریف پر ایک آواز سنی اور اسے غالب کے مشہور مصرعے

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

کے قالب میں ڈھلتے دیکھا چنانچہ اس موقع پر بھی اس نے نسائی احساسات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔

کسی نقاب کے دامن میں جگنوؤں کی چمک
حیا و عفت، و ایماں کی ترجمان بن کر
فضائے صحنِ حرم میں دکھائی دیتی ہے
ان آنسوؤں کی چمک کو یہی پیام ملا
"ہزار بار برو صد ہزار بار بیا"

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے...... "عظیم ترین شعراء کے ہاں ایسے پہلو ہوتے ہیں جو فوراً سامنے نہیں آتے بلکہ صدیوں بعد بھی وہ دوسرے شعراء کو متاثر کر کے زندہ زبان پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔" ...... مواجہ شریف پر بظاہر بے محل غالب کا ایک مصرعہ شاعر کو یاد آکر کتنی سچائیاں منکشف کر گیا۔ کشفی کی شاعری کا یہ رُخ بھی بڑا جاندار ہے۔ درج ذیل اشعار بھی غالب کی شعری اثر سمت کے آئینہ دار ہیں۔

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے
تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہِ شاہِ مدینہ مرے آگے

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا تذکرہ اکثر نعت نگاروں نے کیا ہے اور کیوں نہ ہو جب خود رسول اللہ ﷺ نے اس ذکر کو پسند فرمایا ہے۔ ایک شادی کے موقع پر کچھ لڑکیاں دف جا کر شہدائے بدر کی شجاعت کا نغمہ گا رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے گرہ لگائی۔ ہم میں ایسا نبی ﷺ موجود ہے جو کل کو ہونے والی بات کی خبر دیتا ہے۔ رسول گرامی ﷺ نے فرمایا: "یہ بات مت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ۔"

اس روایت سے جہاں بعض شرعی نکات مستنبط ہوئے ہیں وہیں صحابہ کرامؓ کے تذکرے سے آپ کی خوشنودی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راست فکر رکھنے والے تمام نعت گو شعراء نے مدحِ مصطفےٰ ﷺ میں مناقبِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو بھی شامل رکھا ہے۔ کشفی صاحب کے ہاں بھی نعت کی یہی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہے ان کی نظر نقش گرِ عہدِ رسالت
میزانِ جہاں، حلقۂ یارانِ محمد ﷺ
اپنے صاحب کی رفاقت کا نشاں ہیں صدیقؓ
ہر نفس صاحبِ ایثار کی یاد آتی ہے
حق و باطل کو جدا کر دیا جس نے کشفی
شاہِ لولاک کی تلوارؓ کی یاد آتی ہے
جس نے قرآن کے اوراق کو سرخی بخشی
آج اس دیدۂ گل بار کی یاد آتی ہے
اپنے دشمن کے جو سینے سے اتر آیا تھا
اس جری حیدرِ کرار کی یاد آتی ہے

تاریخ و تمدن کی میزان وہی ٹھہرے
اصحابِ محمد ﷺ ہی معیار نظر آئے

صداقتِ دل صدیقؓ ہے چراغِ وجود
ادائے عشقِ بلالیؓ لہو میں زندہ ہے

اس مجموعے میں صحابہ کرامؓ کی محبت کے جواہر جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ مناقب صحابہؓ کے ان شعری مرقعوں میں حسن صداقت بیان، تاریخِ انسانیت کے تابناک لمحوں کی جھلک، تنویرِ سیرت صحابہؓ سے کسبِ نور کرنے کی تڑپ۔ اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کے زمانی پھیلاؤ کی عکاسی اور شعری جمال سب ہی کچھ تو مل جاتا ہے۔

مرے اشکوں میں تصویرِ بلالیؓ
محبت کا ہنر ہے اور میں ہوں

شاعر کی تخلیقی اپج اور ایجاد پسندی نے اظہار کی ایک جداگانہ راہ بھی نکالی ہے اور شعر کی اس ہیئت (Form) کو "یک مصرعی نظم" کا نام دیا ہے۔ ایجاز و اختصار۔ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ عربی کہاوت ہے "خیر الکلام ماقل و دل" بہترین کلام مختصر اور مراد کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ ان معروضات کی روشنی میں یک مصرعی شبیہیں (Images) ملاحظہ فرمایئے۔

دیباچۂ نشاطِ ابد اس کی ہر گلی
(مدینۃ النبی ﷺ)

خال رخِ ایام یہی بیتِ خدا ہے
(کعبۃ اللہ)

"نسبت" میں شامل کلام میں اصنافِ سخن کا تنوع بھی ہے۔ اور جدید و قدیم اصنافِ سخن کا امتزاج بھی مثلاً اس میں نعتیہ ہائیک، نعتیہ واکا، آزاد اور معریٰ نظمیں اور عربی نظموں کے تراجم تب و تابِ سخن کا مظہر ہیں۔
کشفی صاحب کے لہجے کی متانت، کربِ دروں، شدتِ احساس اور سوزِ عشقِ نبوی کی علامت ہے۔ اس شاعری سے عظمتِ رسالت، مقصدِ نبوت اور وحیِ ربانی کی اہمیت کا تاثر ابھرتا ہے۔ شخصی تداخل (Personal Involvement) کی ایسی مثالیں اردو نعتیہ شاعری میں کم کم دیکھنے میں آتی ہیں جیسی "نسبت" کے اوراق میں ضوریز ہیں۔
یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ شاعری کے بازارِ ہوس میں کہ ہر شخص کے سر میں اشعار کی کثرت اور کتابوں کی تعداد بڑھانے کا سودا سمایا ہوا ہے (معیار تو کسی کسی ہی کے پیشِ نظر رہتا ہے) کشفی

صاحب نے 1999ء کے اختتام پر صرف 92 صفحات پر مشتمل نعتیہ مجموعہ چھپوایا ہے جس میں کل 61 شعری مرقعے ہیں جبکہ اس شاعری کا دورانیہ (Span Of -time) 1955ء سے 1999ء تک 44 سال کو محیط ہے۔ کمال یہ ہے کہ شاعر نے جس اسلوب (Style) تک 1955ء میں رسائی حاصل کر لی تھی بقیہ مدت اس اسلوب کے معیار کو بر قرار رکھنے میں صرف کی۔ طبیعت کا یہ ٹھہراؤ، احساس کی یہ پختگی، اسلوب کی اس درجہ نگہداشت اور معیار کی اتنی نگہبانی...... پھر احوال و کیفیات کا یہ تسلسل بہت کم شعری مجموعوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ شاعری اپنی ادبی خوبیوں، طرزِ احساس، اسلوب کی دلکشی، بیان کی متانت اور مقام رسالت کی عظمتوں کے خاص شعور کے باعث وحدتِ تاثر (Unity of Impression) کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اچھے شاعر کی کچھ خصوصیات گنائی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ "وہ انھیں (لوگوں کو) ان احساسات سے جو وہ پہلے سے محسوس کر رہے ہیں اور زیادہ باخبر کر دیتا ہے اور اس طرح انھیں اپنی ذات سے بھی زیادہ باخبر کر دیتا ہے وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے روشناس کرا دیتا ہے جو اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے تھے"...... نسبت کے مطالعے سے بھی ایک باشعور قاری پر یہ منکشف ہو گا کہ اس نے احساس کی دنیا میں اپنی دریافت کی ایک نئی جہت (New Dimention) کو پا لیا ہے یا ایک بلند زینہ طے کر لیا ہے۔

ایک تعریف کی رو سے "شعر اس کلام کو کہتے ہیں جو بالقصد موزوں کیا گیا ہو"...... نسبت کی شاعری پڑھ کر ایک تمنا جنم لیتی ہے کہ کاش شاعر بالقصد شعر کہنے کی طرف مائل ہوتا! ایسا کرنے سے وہ شاعری کی دنیا میں اس سے کہیں زیاد معروف ہوتا جتنا معروف وہ اپنی مختلف الجہات ادبی خدمات کے حوالے سے آج ہے......

بہر حال وجدان اب بھی اس شاعری پر دوام کے روزن، مقبولیت کے دریچے اور ادبی سطح پر پذیرائی کے در کھلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط (بھارت)

حرا کی روشنی ـــــ ایک مطالعہ

اللہ رب العزت نے حضرت محمد ﷺ کی عظمت کی گواہی دینے کے لئے "انك لعلى خلق العظيم" کے مژدہ جاں فزا کو "ورفعنالك ذكرك" کے ذریعہ سارے عالم میں پھیلادیا۔ تب سے آج تک اور آئندہ قیامت تک آپ کی بڑائی اور رفعت اور رافت کے ترانے ہر زبان میں پیش کئے جاتے رہیں گے۔ روئے زمین پر سوائے رسول مقبول ﷺ کے کوئی بشر نہیں آیا جس کی مدح و توصیف کا غلغلہ اس کے پیدا ہونے سے قبل بھی رہا ہو اور اس کے بعد بھی۔ یہ صرف شان احمدی ہے کہ ارض و سما اور عرش و فرش پر جس کی مدح سرائی عبادت گردانی گئی ہے۔ عرش اور آسمانوں کے احوال تو پردہ غیب میں ہیں لیکن ثناگستری کے یہ روح پرور پاکیزہ نظارے ہم سر کی آنکھوں سے روئے زمین کے فرش بسیط پر دیکھ سکتے ہیں۔ جو ہمارے کمزور ایمان کی بالیدگی کے لئے کافی ہیں۔

ادب العالیہ میں آپ کی مدح سرائی مختلف طریقوں سے کی گی ہے۔ عربی ادب میں تو ایک مستقل صنف ہی "المدائح النبويه" کے عنوان سے آپ کی مدحت طرازی کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ فارسی ادب کا دامن بھی گلہائے ادب عقیدت رسول ﷺ سے بھرا پڑا ہے۔ اردو ادب نے اسی کی تقلید میں نعتیہ سرمایہ کو بڑھایا۔ لیکن اپنے خلاق تخیل سے اردو شعراء نے آپ ﷺ کی ثناگستری میں مقامی رنگ کی بڑی مقدار میں آمیزش کی۔ اردو ادب میں یہ روایت ابتداء ہی سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہاں! کچھ شعراء ایسے ضرور مل جاتے ہیں جنھوں نے نعت گوئی کو "رہ بر دم تیغ" سمجھ کر نہایت ہوشیاری سے اس وادی ایمن میں قدم رکھا ہے۔

اردو کا نعتیہ ادب نظم و نثر پر مشتمل ہے۔ "سیرۃ رسول" تو نثری اردو ادب کا ایک مستقل شعبہ بن گیا ہے جس کی داغ بیل شبلی مرحوم نے ڈالی تھی۔ بلکہ یہ کہنے میں مبالغہ نہیں ہے کہ حالیؔ کی سوانحی کتابوں

کو چھوڑ دیا جائے تو اردو ادب میں "فن سیر" کی ابتدا سیرت رسول ﷺ ہی سے ہوتی ہے۔ نثر میں اس کے علاوہ مغازی، استغراقیات، فقہیات، فن اسماء الرجال اور فن حدیث وغیرہ اصناف بھی "ذکر رسول" ہی کے زمرے میں آتی ہیں۔ رہی نظم، تو اس میدان کو شعراء کرام نے دشت رم آہو کے مانند بنالیا ہے۔ اپنی عقیدت اور فراوانی جذبات و شوق میں ہمارے شعراء نے ایسی چوکڑیاں بھری ہیں کہ دل مسرور ہو جاتا ہے اور فرط شوق میں جھومنے لگتا ہے۔ ان شعراء نے نعت گوئی کی قدیم روش لے کر جدید طرز تک کو اپنایا ہے۔ چنانچہ نور ناموں، میلاد ناموں، معراج ناموں اور وفات ناموں کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں جاپانی صنف ہائیکو، انگریزی صنف، سانیٹ اور فرانسیسی صنف "ترائیلے" تک میں نعت کے لئے طبع آزمائی کی گئی ہے۔

ادھر چند برسوں سے نعتیہ شاعری میں آپ ﷺ کے سوانحی واقعات کو مورخانہ طرز میں فنِ تاریخ و سیر کے مطابق منظوم کرنے کا رجحان ترقی پا رہا ہے اور چند واقعی اچھی کتابیں اس نوع کی طبع بھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف حالی کی مسدس کے چند ابواب، شبلی کی نعتیہ منظومات اور نظم طباطبائی کی نعتیہ تخلیقات میں فن تاریخ کے مطابق ہی سیرۃ النبی کے سوانحی واقعات منظوم ہوئے ہیں، تو حفیظ جالندھری کی شاہ نامہ اسلام، عامر عثمانی کی شاہنامہ اسلام جدید اور محمد علی کی شاہنامہ اسلام مستقل تصانیف ہیں۔ ان میں واقعات رسول ﷺ کو فردوسی کے شاہنامہ کی طرز میں قلمبند کیا گیا ہے۔ دوسری طرف تقسیم ہند کے بعد اردو کے نعتیہ ادب میں پھر ایک انقلاب آیا۔ اس کے موضوعات اور اسلوب میں تجربے کئے گئے۔ اس کی بدولت جو نعتیہ ادب وجود میں آیا وہ اپنی نوع کا طرز قدیم و جدید سے ایک علیحدہ پہچان لئے ہوئے تھا۔ پاکستان میں "حلقہ ادب" کے موئدین میں عبد العزیز خالد نے اپنی "چونکا دینے والی شاعری" کے ذریعہ نعتیہ شاعری میں "فارقلیط و منحمنا" کا اضافہ کیا، جن میں عقیدت سے زیادہ علمیت اور روایت سے زیادہ اساطیریت کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی حال جعفر طاہر کی "ہفت کشور" کے نعتیہ حصہ کا ہے۔ لیکن اس کا ڈرامائی عنصر بڑا جاذب نظر ہے جو دل کو براہ راست متاثر کرتا ہے۔ اثر آفرینی کے لحاظ سے یہ تینوں کتابیں نعتیہ ادب میں اچھا اضافہ ہیں۔

اس صدی کے آٹھویں دہے کی ابتداء میں جدیدیت کے ہمنوا شاعر عمیق حنفی کی "صلصلۃ الجرس" اردو کے نعتیہ ادب میں پھر ایک نیا باب کھولتی ہے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی ثناگستری میں اردو شاعری کے جدید تر اسلوب کو اپنا کر نعت کے ہیئت میں تجربے کئے اور اپنی نعتیہ تخلیق کو حدیث نبوی ﷺ کے ٹکڑے "صلصلۃ الجرس" کا عنوان دے کر اس میں حضور ﷺ کے سوانحی واقعات سلسلہ در سلسلہ بیان کئے ہیں۔ اس کتاب کا اثر قلب و ذہن سے محو ہوا بھی نہیں تھا کہ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے بھی نعتیہ سوغات پیش کی۔ "حرا کی روشنی" ایک مستقل کتاب کی صورت میں انہوں نے اردو کے نعتیہ ادب کو دی۔

جس میں صلصلۃ الجرس کے طرز اسلوب کے علاوہ شاعر نے اپنے خلاق تخیل سے بھی اضافہ کیا ہے اور حضور ﷺ کی سیرۃ مبارکہ کے ضعف و غرابت سے پاک اہم ترین واقعات کو صحت کے ساتھ پیش کیا۔
ساحل کا یہ کمال ہے کہ وہ عقیدت کی شاعری میں روایت کو درایت کی میزان میں تولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عقیدت دل کے طابع ہوتی ہے اور درایت عقل کے زیر نگیں۔ شاعری میں شاعر کا دل کار فرما ہوتا ہے۔ لیکن ساحل کی نعتیہ شاعری میں دل و دماغ بیک وقت متحرک نظر آتے ہیں۔

نعتیہ شاعری میں منظوم سیرۃ بالعموم آپ ﷺ کی ولادت سے لے کر وفات تک لکھی جاتی ہے۔ لیکن ساحل کے یہاں اس میں بھی نیا پن ہے کہ انہوں نے واقعہ "اقراء" سے لے کر "تکمیل دین و تمم نعمۃ" کے واقعہ تک ہی سیرۃ کو محدود نہیں رکھا بلکہ ان دونوں آیات کے درمیان جو پورا دستور حیات نازل ہوتا رہا تھا۔ آپ ﷺ کے بعد اس کی کتنی ضرورت ہے اور اس سے تغافل کے نتیجہ میں دوبارہ دور جاہلیت کے عود کر آنے سے نبی نوع انسان کو جو خسارہ بھگتنا پڑ رہا ہے اس کی حقیقی تصویر بھی قارئین کی نظروں کے سامنے لا کر رکھ دی ہے۔

شرف الدین ساحل کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ "حرا کی روشنی" میں انہوں نے سیرۃ نبوی کے اطراف صرف صحیح روایات کا حالہ سجایا ہے۔ دور از کار تشبیہات اور بعید از فہم اصطلاحات سے انہوں نے قصداً اجتناب کیا اور آپ ﷺ کی ایسی سیرت پیش کی جو بشری تقاضوں کو کلیتاً برتتی دکھائی دیتی ہے۔ جس پر فوق البشر کا گمان نہیں ہوتا۔ آپ ﷺ کی شان رسالت میں عبدیت کی رنگ آمیزیاں اتنی گہری ہیں کہ الوہیت کی پرچھائی تک کا اس میں شائبہ نہیں ہوتا۔ فرق مراتب کا ساحل نے اتنا خیال رکھا کہ ان کے نعتیہ اشعار کے لفظ لفظ میں "باخدا دیوانہ باش و بامحمد ہوشیار" کی کیفیات جھلکتی ہیں۔

حرا کی روشنی کا عروضی تجزیہ کرنے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ساحل عروضی اوزان کو زندگی کے مضطربانہ و پرسکون اور ادق و سہل حالات کے مطابق ڈھالنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ مثلاً حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے زمانہ جاہلیت کے حالات سے نعت خواں کو کیا لینا دینا۔ ایک تصویر بس نظروں کے سامنے سرسری طور پر لا کر آگے بڑھنا ہے۔ پھر ایسے پر آشوب دور میں پیدا ہونے والے بچہ کو (جو آگے چل کر نبی بننے والا ہے) اس دور کی پیچیدگی اور دشواری سے کیا واسطہ۔ اس لئے ساحل نے نہایت تیزی سے قارئین کی نظروں کے سامنے سے جاہلیت کی تصویر گزارنے کے لئے "فاعلن" اس رکن کا استعمال کیا جو ایک سبب اور ایک وتد سے مربوط ہے۔ لیکن جیسے ہی آپ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تو سارے عالم میں سکون و طمانیت کی فضا چھا گئی ایسے پرسکون ماحول میں عکاسی کرنے کے لئے آپ نے سہ رکنی اوزان کا استعمال کیا جو وتد + سبب + سبب، وتد + سبب + سبب + وتد + سبب سے مل کر بنے ہیں یعنی مفاعیلن مفاعیلن فعولن۔ ا

اوزان کی حامل بحر کی لے و آہنگ میں طوالت ہونے کی وجہ سے سکون کی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ پھر جب آپ ﷺ تلاش حق کے لئے دوڑ دھوپ کرنے لگے تو اضطراری کیفیت کی عکاسی کے لئے ساحل نے پنج حرفی رکن (مفاعلن مفاعلن) کا استعمال کیا۔ پھر جب آپ کی بعثت ہوئی اور آپ ﷺ نبی بنا دیئے گئے تو کار نبوت کا لمبا راستہ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔ آپ ﷺ نے شروع میں نہایت آہستہ روی سے اس راستہ کو پار کیا۔ اس لئے ساحل نے بھی ان واقعات کو منظوم کرتے وقت "مفاعیلن مفاعیلن" جیسے طویل الصوت سات حرفی ارکان کا چار چار بار استعمال کیا۔ آپ ﷺ کی متواتر لیکن پر سکوت کوششوں سے جب آوازۂ حق چہار سو بلند ہونے لگا تو مخالفین نے بھی اپنا سر اٹھایا۔ مخالفت کی اس گرم بازاری کے بیان میں شاعر نے مفاعلاتن مفاعلاتن جیسی سخت آہنگ ترکیبوں کا استعمال کیا۔ لیکن سختیاں برتی جانے کے بعد بھی آپ ﷺ کے بحر رحمت میں کوئی تلاطم رونما نہیں ہوا اور اللہ کے حکم سے آپ ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت کر لی۔ اس واقعہ بیانی میں ساحل مسدس بحر کا استعمال کرتے ہیں۔ جس کے آہنگ ہی میں بجائے ارتعاش کے سکوت ہے۔ بیعت عقبہ کے بعد شمع رسالت پر مر مٹنے والوں کا جوش بڑھنے لگا تو ساحل نے جذبات کی مناسبت سے طویل الصوت ارکان کے استعمال میں تخفیف کر کے اس میں جوش و ولولہ والی صوتی لے پیدا کی۔ یعنی مفاعیلن کی آٹھ رکنی بحر کو مربع میں بدل دیا۔ اہل قریش نے جب مدینہ میں بھی آپ ﷺ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور جنگ کی طرف آمادہ ہوئے تو شاعر نے ان کی پراگندہ ذہنیت کی عکاسی کرنے کے لئے مخلوط الارکان بحر کا استعمال کیا۔ جو باہم ایک دوسرے کے متناقض ہیں یعنی "مفعول فاع لات مفاعیل فاعلن" اس طرح بدر سے احزاب تک کے واقعات کو بیان کرنے کے لئے شاعر نے مختلف ہی نہیں ایک ہی بند میں مختلف ارکان کا استعمال کر لیا ہے جو انتشار اور ابتری کے حالات بیانی کے لئے نہایت عمدہ استعمال ہے۔ مثلاً انہوں نے فعلن فعلن کی تکرار کو بڑھا کر فاعلاتن فاعلاتن اور پھر آگے فاعلاتن فاعلن اور فاعلاتن فاعلان جیسی ترکیبوں کے حامل ارکان استعمال کئے ہیں۔ ان ارکان کی پراگندی سے ہی حالات کی ابتری واضح ہو جاتی ہے۔ فتح مکہ کے وقت آپ ﷺ کا عجز و انکسار بہت بڑھا ہوا تھا۔ شاعر اس انکسار کو بیان کرنے کے لئے بتدریج پہلے یک رکنی "فاعلاتن" کا استعمال کرتے ہیں پھر دو ارکان کا پھر سہ ارکان کا اور آخر میں چار ارکان کو شامل مصرع کر لیتے ہیں۔

آپ ﷺ کی عمر شریف کے اب آخری ایام ہیں امت کو بعجلت تمام ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا ہے۔ ان حالات کے بیان کے لئے شاعر بھی ارتعاشی آہنگ والے ارکان مفاعیلن مفاعیلن کا استعمال کرتا ہے۔ ان ارکان کے استعمال میں تعدادی فرق سے جو آہنگی نشیب و فراز بنتا ہے وہ صحابہ کرام کے جذبات کی تصویر کشی کرتا ہے۔

اب حضور ﷺ اس دارِ فانی سے کوچ کرنے والے ہیں۔ بیماری کا غلبہ ہے اضمحلال اور بیماری کی کیفیت ہے۔ شمع رسالت کی روشنی دھیرے دھیرے کم ہوتی چلی جارہی ہے۔ جوش وولولہ ہے کہ لخت لخت ہورہا ہے۔ جذبات ٹکڑے ٹکڑے ہورہے ہیں۔ ان کیفیات کی عکاسی کے لئے ساحلؔ نے یہاں بھی ارتعاشی آہنگ والے رکن مفاعیلن کو استعمال کیا ہے لیکن اس کے ساتھ فعولن / فعل بھی جوڑے گئے ہیں۔ جس سے ارکان کی ارتعاشی لے فرطِ غم کی کپکپاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

جب آیا وقت آخر / تو نکلے نطق ہادی سے وہ جملے مثل گوہر /

جو خط اک امیازی کھینچتے ہیں عبد اور معبود کے بیچ / دھک اٹھی ہے آتش

آخر حضرت ابو بکرؓ کی آواز اس خاموشی میں ابھرتی ہے۔ لیکن غم میں نڈھال، دل رنجور۔

جو کرتے ہیں محمد ﷺ کی عبادت / انہیں معلوم ہو وہ جاچکے ہیں

مگر کرتے ہیں جو رب کی عبادت / وہ اب زندہ ہے اس پر موت وارد ہو نہیں سکتی

یہ وہ الفاظ ہیں جن کی وحی تصدیق کرتی ہے۔

نہیں ہیں کچھ محمد ﷺ / فقط وہ تو پیمبر ہیں خدا کے / _____ اگر ہو جائے ان کی موت واقع

/ تو کیا پھر جاؤ گے تم راہ حق سے / _____

غرضکہ ڈاکٹر شرف الدین ساحلؔ کی یہ نعتیہ آزاد نظم ارکان واوزان کی لے و آہنگ اپنے جلو میں لئے ختم ہوتی ہے۔

شاعر نے آخر میں آپ ﷺ کے بعد زمانے میں پھیلے جہالت اور شرک کی بڑی پر درد انداز میں عکاسی کی ہے۔ آج پھر حضور ﷺ سے پہلے کی برائیاں جوں کا توں اپنا چولا بدل کر آگئی ہیں۔ اس ظلمت کدہ جہاں میں آج "حرا کی روشنی" کی ضرورت ہے ورنہ یہ دنیا جہالت کدہ بن کر تباہ ہو جائے گی۔ شاعر نے نہایت مایوس کن انداز میں آج کی غیر متمدن تہذیب کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس لئے اس میں اسی لے و آہنگ والے ارکان قصداً استعمال کئے گئے ہیں۔ جو آپ ﷺ کے سانحہ ارتحال کے بیان میں استعمال کئے گئے تھے۔

اس پوری نظم میں شاعر نے واوین جو مصارع درج کئے ہیں وہ یا تو قرآن حکیم کی آیات ہیں یا احادیث کے ٹکڑے۔ اس مسلسل نظم کے بعد حرا کی روشنی میں چند نعتیں ہیں جو روایتی انداز کی ہیں لیکن شاعر نے اپنے خلاق تخیل سے کچھ نئے رنگ بھی بھرے ہیں۔ صفحہ ۷۹ پر ایک شعر درج ہے۔

ڈوبتے سورج کو لوٹایا علی کے واسطے
اس قدر اعلیٰ تھا معیار دعائے مصطفیٰ

سیرہ کی کتابوں اور احادیث میں یہ واقعہ کثرت سے درج ہوا ہے۔ لیکن ثقہ علماء اور محققین علم

دین اس حدیث کے موضوع ہونے کے قائل ہیں۔ ابن تیمیہ نے اسے موضوع حدیث کہا ہے۔ مولانا ادریس کاندھلوی اس "رد شمس" کے واقعہ کے ضعف کے قائل ہیں اور سید سلیمان ندوی نے بھی "سیرۃ النبی" جلد سوم میں اس واقعہ کی صحت پر انگلی رکھی ہے۔ بہر حال! تواتر سے یہ واقعہ نقل ہوا ہے اس لئے شاعر اسے منظوم کرنے میں قصوروار نہیں ٹھہرتا اور ڈاکٹر شرف الدین ساحل یونیورسٹی کے سندیافتہ ہیں، دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں۔

ڈاکٹر جمیل راٹھوی (بھارت)

بیکل اتساہی کی نعتیہ شاعری

اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ اردو شاعری کا آغاز احکامات ربانی اور پیغامات نبوی ﷺ کی تشہیر و تبلیغ کے ساتھ ہوا ہے اور انسانی زندگی کا ہر بلند پہلو اور ستھرا رخ نعت کے توسل سے بھی بنایا اور سنوارا جاتا رہا ہے۔ ستم ظریفی یہ رہی کہ اردو شاعری اپنی ارتقائی منزل سے گزرتے ہوئے حمد و نعت کی لے سے دور ہٹنے لگی اور آگے چل کر جسے اردو ادب تصور کیا گیا وہ روحانی شاعری کے فیوض و برکات سے خالی نظر آنے لگا اور کچھ شعرا نے وہ طریق بھی اختیار کر لیا جس کی قرآن پاک مذمت کرتا ہے۔ نتیجہ میں حمدیہ و نعتیہ شاعری رسمی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آنے لگی اور شعرا نے تخلیق کی کامیابی یا مغفرت کی خاطر کچھ حمدیہ و نعتیہ اشعار کہہ لینا کافی سمجھا۔ تاہم اردو نعتیہ شاعری بھی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ جس پر اردو ادب فخر کر سکتا ہے یہ بات اور ہے کہ ادبی رسائل و جرائد اس کے تذکروں سے یکسر خالی رہے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی ہندوستان کے ہر شعبے میں تبدیلی کا پیغام لائی ادب پر بھی اس کے نمایاں اثرات نظر آئے شاعری میں حقیقت پسندی کا رجحان اور جدید نعت گوئی کا آغاز اس دور سے منسلک ہے۔ یہی وہ دور ہے جب قدیم و جدید رنگ کے حسین امتزاج نے اردو نعت کو کمال عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا اور قابل احترام نعت گو شعرا کی ایک بڑی تعداد اردو ادب کو عطا کی اور جنھوں نے انفرادیت قائم کرتے ہوئے جذبات کے پہلو بہ پہلو حقیقت پسندی کے ساتھ اصلاحی مضامین پیش کر کے اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت طیبہ کے توسل سے قوم کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس دور کی نعتیہ شاعری میں ایک اور تحریک نظر آتی ہے۔ جس کے تحت اللہ کے رسول ﷺ اور دوسرے بندوں کے فرق کو اس حد تک کم کرنے کی سعی کی گئی کہ اہانت رسول ﷺ کا گمان ہونے لگتا ہے۔ نتیجتاً بیشتر مذہبی حلقوں میں اس امر کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا اور ایسا مذہبی ادب (جس میں نعتیہ شاعری شامل ہے) تخلیق ہوا جس میں اللہ کے رسول ﷺ کا مقام رسالت فضیات کے ساتھ بیان ہوا اور نعت (قرآن و حدیث کی روشنی میں) عشق

رسول ﷺ کا گنجینہ بنا کر پیش کی گئی اللہ کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی رسالت کے فرق کے ساتھ اشرف البشر اور بشر کے فرق کو بھی نمایاں طور پر پیش کیا گیا اور یہ سلسلہ دور حاضر تک جاری ہے۔

اردو والوں کا یہ رخ کہ مذہبی رجحانات سے ہٹ کر ادبی معیار قائم کیا جائے ہر اعتبار سے زبان کو خسارے میں لے گیا ہے دنیا کی بیشتر اہم زبانوں کی ادبی حیثیت ان کی مذہبی تخلیقات پر مبنی ہے۔ مثلاً لیٹن میں دانتے، گریک میں ورجل، انگلش میں ملٹن، عربی میں حسانؓ و بوصیریؒ، فارسی میں مولانا روم اور سوری اور ہندی میں سور تلسی وغیرہ۔ ہر ادب میں ایسے شاعر ہیں جنھیں ان کی مذہبی کاوشوں کی بنا پر آنکھوں پر بٹھایا گیا مگر اردو ادب میں شاید یہ پاکیزہ عمل ایک جرم تصور کیا جاتا رہا ہے اس لئے ان شعرا کی شاعرانہ عظمتوں کا تذکرہ ادبی رسائل و جرائد میں نہیں کے برابر ہوتا رہا ہے یا ہوا ہی نہیں ہے۔ شاعر کا اصل مقصد مذہبی شاعری کے بغیر پورا ہی نہیں ہوتا کہ مذہب انسانی سماج کا لافانی حصہ ہے۔ دور حاضر میں اردو شاعری نے جو نئے تیور اختیار کئے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مذہبی سمجھی جانے والی شاعری میں مذہبی مضامین کی شرکت عام ہو رہی ہے۔ خالص غزلوں میں نعت کے شعرا اکثر و بیشتر اپنا رنگ بکھیرتے دکھائی دیتے ہیں پھر بھی نعتیہ شاعری کو اس کا جائز حق دلانے میں جو ادیب و معتبر شخصیتیں مصروف جہاد ہیں ان میں بیکل اتساہی پیش پیش ہیں۔ یہاں پر ڈاکٹر محمد شفیع مہوبوی (صدر شعبہ فارسی سیلو اسدن کالج برہانپور) اور ان کے ساتھیوں کی ان کاوشوں کا تذکرہ ضروری ہے جن کے نتیجہ میں ساگر یونیورسٹی مدھیہ پردیش میں صنف نعت کو ایم۔ اے کے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد شفیع اور بیکل اتساہی کی اس تحریک سے رابطہ قائم کر کے اسے اور آگے بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ دوسری یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں نعت کو نصاب میں شامل کرنے کا رجحان پیدا ہو اور ادب میں نعتیہ شاعری کو اس کا مقام دومل سکے جس کی وہ مستحق ہے۔ بیکل اتساہی اس طرح کے کام میں پیش پیش رہتے ہیں اور ہر طرح سے مدد کرتے ہیں۔

اصل میں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں اردو پر جو پہاڑ ٹوٹے وہ کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں ایسے ماحول میں جب اردو کو مٹانے کے لاکھ جتن کئے جا رہے ہوں جن حلقوں نے اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کی ان میں ہندوستان کے مذہبی حلقے بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان حلقوں میں اردو کا جو سرمایہ تخلیق ہوا اس میں نعتیہ ادب کی ضخامت کم نہیں ہے۔ اردو کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ نعت کا لفظ اردو والوں کو بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں ہی لے جاتا ہے۔ لیکن اردو کا تمام نعتیہ ادب نعت کے زمرے میں نہیں آتا یعنی دانستہ یا غیر دانستہ ایسا نعتیہ ادب بھی تخلیق ہوا جس کا عام تاثر یا تو الوہیت میں داخل کر دیتا ہے یا اللہ کے رسول ﷺ کی بارگاہ میں تنقیص کا پہلو پیدا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ناقدین و محققین نے نعت کے فن کو مشکل بتایا ہے مثلاً ____ "نعت کا موضوع ہماری زندگی کا ایک نہایت عظیم و وسیع موضوع ہے اس

کی عظمت و وسعت ایک طرف عبد سے اور دوسری طرف معبود سے ملتی ہے۔ شاعر کے پائے فکر میں ذرا سی لغزش ہوئی اور وہ نعت کے جائے گیا حمد و منقبت کی سرحدوں میں۔ "(ڈاکٹر فرمان فتح پوری)"حقیقتاً نعت شریف لکھنا بہت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہو جاتی ہے۔ "(مولانا احمد رضا خاں بریلوی) اس لئے ایسے شعرا کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جنھوں نے نعت کی نازک حدود میں رہ کر اپنی آفاقیت کو قائم رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

دور حاضر کی اردو شاعری نے جو روپ دھارا ہے اس کے پیچھے اردو حلقوں میں چلنے والی مختلف تحریکات اور رجحانات کے اثرات کار فرما ہیں جن کے تحت اردو شاعری دور حاضر تک پہنچتے پہنچتے اپنے منفرد خدوخال کے ساتھ ابھری ہے۔ روایت و جدت کی خصوصیات کی ہم آہنگی نے اردو شاعری کا ایک نیا باب تعمیر کر کے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اردو کے اس فخریہ ادب میں نعت کا وہ حصہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے جس میں روایت و جدت کا حسین امتزاج، لہجہ کی خنک، مضامین کی وسعت اور جذبہ عشق رسول ﷺ کی پاکیزہ لطافتیں اپنی مخصوص مہک کے ساتھ موجود ہیں۔ دور حاضر کے ایسے شعرا میں میکلؔ اتساہی کا نام امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ "دور حاضر میں نعتیہ شاعری کا باب میکلؔ اتساہی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا" یہ جملہ رسمی و روایتی نہ ہو کر انصاف کی رو سے یوں صادق آتا ہے کہ میکلؔ نے رسم و روایت سے آگے بڑھ کر نعت کے مفہوم کو سمجھا ہے اور نعت کی روح کو شاعری میں اتارنے کا ایک منفرد کارنامہ انجام دیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے میکلؔ کا لب و لہجہ اپنی پہچان آپ ہے۔ ہندی کے ساتھ ساتھ علاقائی زبان پوربی پر میکلؔ کی گرفت مضبوط ہے۔ نتیجتاً مضامین و مفاہیم کو الفاظ کا شعری جامہ پہنانے میں انھیں آسانیاں میسر ہیں۔ نعتیہ مضامین و مفاہیم کے نئے افق تلاش کرنا ان کا خاصہ ہے اور نعت کی نازک حدود میں لامحدود وسعتوں کا بحر بیکراں ان کی نعتیہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے یعنی "جہاں جہاں خدائی ہے وہاں وہاں مصطفیٰ کی مصطفائی ہے۔" میکلؔ اتساہی کا مستند نعتیہ کلام ان کی شاعرانہ عظمتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ مستند لفظ کا استعمال یوں کرنا پڑا کہ حصول رزق کی خاطر اکثر و بیشتر لوگ شاعر کو دکھائے بغیر بھی نعتیہ کتابچے چھپا کر شائع کرتے رہتے ہیں۔ میکلؔ اتساہی کے نام سے چھپا ہوا وہ کلام جس کی تصدیق انھوں نے کی ہو یا ان سے ہوتی ہو مستند ہوگا۔ بہر حال میکلؔ کا کلام بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں اپنی محبت کی مہک اور عقیدتوں کی چمک کے ساتھ کس انداز میں حاضری کا شرف حاصل کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

سخن میں کوچہ خیر البشر مہکنے لگا	پڑھی جو نعت مرا گھر کا گھر مہکنے لگا
تصورات میں تھا عکس گنبد خضریٰ	کھلی جو آنکھ شعور نظر مہکنے لگا

سلام سرورِ کونین مانگ کی میں نے　　　　مری دعاؤں میں لطف اثر مہکنے لگا
میں پائے ناز کی ٹھوکر میں آگیا مکیؔل　　　　گلاب بن کر سرِ رہ گزر مہکنے لگا

نعت کا سب سے مضبوط اور دلکش پہلو عقیدت و محبت کا مہکتا ہوا جذبۂ صادق ہے۔ ویسے تو ہر نعت گو کے یہاں عقیدت و محبت کی مہک ہوتی ہے لیکن ہر ایک کا جذبہ جدا جدا کیفیات اور مراتب پر فائز ہوتا ہے انہیں کیفیات و مراتب کی بنا پر نعت کی اقسام کی جاتی ہیں اور مقام عطا ہوتا ہے مثلاً نعت برائے رسم و برائے برکت' نعت برائے مقصد برائے سیرت اور نعت برائے عقیدت برائے محبت۔ ہر قسم میں مراتب جدا جدا ہوتے ہیں (جو چیز ایک نعت کو دوسری سے ممتاز کرتی ہے وہ شاعر کے دل کا سوز و گداز اور عشقِ رسول ﷺ میں سرشاری کا مرتبہ ہے۔" فضل حق)

مکیؔل اتساہی کی نعتیہ شاعری میں عقیدت و محبت کا ایک سیل ناتمام ہے جو دل کی گہرائیوں میں اتر کر قلبی سکون کا باعث بن جاتا ہے۔ کوزہ میں دریا سمونے کی کہاوت کو سچ کرنے کا فن مکیؔل کو خوب آتا ہے۔ ان کی اس نعت میں کیسی کیسی لطافتیں اور جوہر موجود ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

ان کے جو غلام ہو گئے ___ واجب السلام ہو گئے
عاشق نبی کی راہ میں ___ حادثے حرام ہو گئے
چھو گئے جو پائے ناز سے ___ وہ فلک مقام ہو گئے
ان کے نقشِ پا پہ جو جھکے ___ وقت کے امام ہو گئے

چھوٹی بحر میں مضامین کو وسعت دینا ایک مشکل فن ہے جو ہر ایک شاعر کے حصہ میں نہیں آتا۔ مکیؔل کو اس فن میں مہارت حاصل ہے یہی نہیں ان کی چھوٹی بحروں میں مصرعے عام گفتگو کے جملوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں چند شعر اور ذیل میں درج ہیں۔

در پہ باریاب ہو گئے　　اشک ماہتاب ہو گئے
ہم کو لوگ چاہنے لگے　　ہم جو فیض یاب ہو گئے
لاغر و ضعیف بدر میں　　پیکر شباب ہو گئے
ان کا نام لے کے حشر میں　　لوگ بے حساب ہو گئے

اردو ادب میں غزل کی مقبولیت تذکروں کی محتاج نہیں ہے اختصار میں جامعیت کی روح پھونکنا غزل کا خاصہ ہے اور وسعتوں کے جو دریا غزل نے بہائے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے یہی وجہ ہے کہ دیگر زبانوں کے دلدادہ بھی غزل کو آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔ اردو غزل میں نعتیہ مضامین کے عام چلن نے یقیناً غزل کا ایک امتیازی باب تخلیق کیا ہے۔ مکیؔل اتساہی کی نعتیہ غزلیں اسی امتیازی ادب کا ایک حصہ ہیں۔ مکیؔل نے منفرد اسلوب

بیان، لہجہ کا بانکپن اور نازک خیالی کے ساتھ نعت کی حدود میں رہ کر شگفتگی اور معنی آفرینی کس انداز سے پیدا کی ہے ایک نعتیہ غزل میں ملاحظہ فرمائیں۔

تمام پھول شگفتہ چمن میں رہتے ہیں — مرے حضور گلوں کے بدن میں رہتے ہیں
بساط کون و مکاں ان کی ضو سے روشن ہے — وہ آفتاب ہیں پھر بھی کرن میں رہتے ہیں
ملی نہ لذتِ یادِ نبی کبھی ان کو — جو لوگ نشہ شعر و سخن میں رہتے ہیں

یہ سچ ہے کہ غزل "اردو ادب کا آئینہ ہے" انقلابات زمانہ کے تحت سماج کے بیشتر حلقوں میں تغیرات کا سلسلہ جاری رہا۔ ادب میں بھی اس کے ثبوت موجود ہیں ایک زمانہ تھا کہ اردو ادب میں قصیدہ اور مثنوی کی مقبولیت عروج پر تھی، لیکن بدلے ہوئے ماحول میں ادب نے کچھ یوں کروٹ لی کہ ان اصناف کا زوال عمل میں آیا اور غزل نے ترقی کی نئی راہیں تلاش کیں ساتھ ہی گیت کا چلن عام ہوا۔ نعت میں گیت کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ اس میں علاقائی الفاظ کی شمولیت بے روک ٹوک ہوتی ہے اور خاص و عام آسانی سے قبول کر لیتے ہیں یعنی گیت اظہار خیال کا ایک اور آسان طریقہ ہے اس کے توسل سے اسلامی تعلیم نیز رحمتِ عالم ﷺ کی سیرتِ طیبہ غیر مسلموں تک آسانی سے پہنچائی جا سکتی ہے یعنی دورِ حاضر میں تبلیغ اسلام کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔ نعتیہ گیتوں کو عوام میں مقبولیت دلانے کا سہرا بیکل اتساہی کے سر ہے۔ پوربی، اودھی، بندیلی اور ہندی کے الفاظ استعمال کرنے میں آپ کو مہارت حاصل ہے خالص علاقائی زبانوں میں آپ کے نعتیہ گیت دھوم مچاتے رہتے ہیں۔ اس دور میں جب کہ نعتیہ مشاعروں کا عام چلن ہے اور ہر قوم کے لوگ عالم و جاہل سب شرکت کرتے ہیں اور سنتے بھی ہیں۔ نعتیہ گیت کے ذریعہ بات کہیں زیادہ مؤثر طریقے سے لوگوں تک پہنچ رہی ہے۔ بیکل کے نعتیہ گیت کے چند نمونے ذیل میں درج ہیں:

نعتیہ گیت

کونے کرنی اپے تمری دوریا

سیدنا ہمری لاج رکھو

کاگد کے پھلون پر لو بھی کدم کدم جگانی
جب جُگے کا سے کا تو نیند کی چادر تانی
لوگوے لوٹت رہے نور کی اجریا

سیدنا ہمری لاج رکھو

بادر گرجے بجری ترپے چاند اگلے انگارے
بھویاں بیتے اکاس جراوے جر تھکیں اندھیار

تمہرے دکھیا جیہیں بولو کونی اوریا

سیدنا ہمری لاج رکھو

روٹھ جائے سب دنیا چاہے چھوٹ جائے گھر باری

تم جو چھینہو ہمرے آقا رہے کیکری دوا ری

سیدنا ہمری لاج رکھو

گیت اور غزل بزبانِ پوربی :

پوربی بھاشا تو بیکل کی اپنی علاقائی زبان ہے اس پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے ویسے ہی یہ زبان ملک کے طول و عرض میں بے حد مقبول ہے۔ پر بیکل کے گلے سے لگ کر اس زبان کو کچھ اور ہی فروغ حاصل ہوا ہے۔ غزل میں گیت کا رنگ بھرنا کوئی بیکل سے سیکھے۔ ان کی ایک پوربی زبان کی نعتیہ غزل ملاحظہ فرمائیں اور غزل میں گیت کے آہنگ کا مزہ لیں۔

ان کے پیاں پرب اور مر جیبے ہم — زندگی تو کا انمول کر جیبے ہم

عمر ان کے مناوے ماہمری کٹے — وہ نہ مان جیہیں تو تر جیبے ہم

کونو آندھی بونڈر کا کھٹکا نہیں — وہ جو چھیہیں تو ندیا اتر جیبے ہم

خلد کہہ کا کہت اے حبیب خدا — آپ چھیہیو چر لس اوپر جیبے ہم

روپ آئینے ماسب نکھارت رہیں — اپنے آقا کا دکھتے سنور جیبے ہم

ان کے پھلون کے چرنن ما کھولنت — ان کے کن گینگبے جر جیبے ہم

جو نے دن کہہ کے بیکل پکریں پیا

ذرے ذرے ما اودِ دن پسر جیبے ہم

جدید نظم نے اظہارِ خیال کی جو آسانیاں پیدا کی ہیں اس کی مثال کسی اور صنف میں نہیں ملتی ادبی حلقے اس کی افادیت کو سنجیدگی سے لیتے ہیں۔ بیکل اتساہی نے اس میدان میں بھی اپنا پرچم بلند کیا ہے ان کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیں جس سے ان کی ہمہ پہلو شخصیت عیاں ہوتی ہے۔

یا جانِ رحمت مصطفےٰ

شب قدر کی زلفیں تری

دن عید کا چہرہ تیرا

پوشاک فصلِ گلستاں

عرق بدن مہکا تیرا

مژگاں ہیں محراب حرم
ماتھا ہے تڑکا نور کا
پلکوں کے سایے رحمتیں
عارض سویرا نور کا
قرآن بولے والضحیٰ
یا جان رحمت مصطفیٰ

نوری تیرا پیرہن
نوری روش نوری چمن
ہر گل میں نور رنگ و بو
ہر شمع نوری انجمن
مہتاب میرا تیری ضو
سورج میرا تری کرن
وجہ حیات دو جہاں
ہے روح تو کونین تن
پونم میرا ذرہ تیرا
میری جبیں تلوا تیرا
بدر الدجیٰ نور الہدیٰ
یا جان رحمت مصطفیٰ

نعت ایک موضوعاتی صنف سخن ہے' غزل' قصیدہ' مثنوی یا رباعی وغیرہ سے نعت کی نوعیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہر وہ بات جس کا تاثر بالواسطہ یا بلاواسطہ حضور ﷺ کی مدح کے پہلو سے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں لے جاتا ہو نعت ہے۔ مکّل اتساہی نے محبوب خدا ﷺ کی بارگاہ میں حاضری کے نئے انداز عطا کیے ہیں موضوعات سے متعلق ان کا مسلک روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ذکر میلاد النبیؐ ان کے یہاں عبادت کا درجہ رکھتا ہے کیوں نہ ہو قرآن میں میلاد کا ثبوت موجود ہے اور قرآن سے بیشتر اعلیٰ موضوعات میسر آتے ہیں مثلاً حضور نور ہیں' حضور حاضر و ناظر ہیں' حضور اللہ کی دلیل ہیں' حضور اللہ کا ذکر ہیں' حضور آخری نبی ہیں۔ حضور ساری خدائی کے نبی ہیں' حضور کو اللہ نے علم غیب دیا ہے' حضور کو جسمانی معراج ہوئی' حضور کا ادب رکن ایمان ہے' اللہ تعالیٰ حضور کی رضا چاہتا ہے' حضور اور ان کے چہیتے اولیاء

کرام کا وسیلہ ضروری ہے اور اللہ وحدہ لاشریک تمام مخلوق کا خالق اور رب ہے اور محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ اللہ کے بعد سب سے بلند ہے وغیرہ۔ نعت میں لامحدود وسعتیں موجود ہیں زمین کے اندر سے لے کر اوپر تک خلا سے لے کر تمام آسمانوں اور لامکاں تک نعت کے مضامین موجود ہیں۔ زمین سے متعلق ہر عمدہ پہلو سیرتِ طیبہ سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً انسانیت کی تعمیر کے لئے شرافت کا پہلو' اخلاق کی بلندی' کردار کی پختگی' انصاف و صداقت کی راہ' گھریلو زندگی' جنگ کا میدان' تعلیم کی اہمیت یعنی انسانی زندگی کا کون سا روشن پہلو ہے جسے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کے توسل سے بنایا اور سنوارا نہیں جاسکتا اور نعتیہ شاعری میں عام طور پر مخصوص موضوعات پر زیادہ لکھا گیا ہے۔ ایسے شعراء بھی موجود ہیں جنھوں نے مخصوص موضوعات کے ساتھ نئے موضوعات کو لے کر نعت کی وسعتوں سے صحیح معنی میں استفادہ کیا ہے۔ بیکل اتساہی انہیں مخصوص شعرا میں سے ایک ہیں اپنے دوسرے موضوعات کو جس حسن و خوبی سے نعتوں میں سمویا ہے وہ انہیں کا حق ہے بیکل کے کچھ اہم موضوع مثالوں کے ساتھ ذیل میں درج ہیں:

نور مصطفےٰ ﷺ

نور توحید مکہ میں چمکا کہ بس کفر کے حوصلے سب ہوا ہو گئے
بحر رحمت میں موجیں اٹھیں نور کی جتنے کشتی میں تھے ناخدا ہو گئے
داغ سجدہ جبیں پر ہے ابھرا مگر نور عشق نبی ہے نہیں قلب میں
ہم سے اچھے تو راہوں کے پتھر ہوئے سرورِ دیںؐ کے جو نقش پا ہو گئے

قرآنی جملوں یا الفاظ کا استعمال

قرآنی آیات کے مفاہیم کو اردو نعتیہ شاعری میں خوب باندھا جاتا ہے۔ قرآن کی آیات یا الفاظ کا مؤثر استعمال کر کے شعر کو مزین کرنا انہیں کے حصے میں آتا ہے جنہیں قرآن کا مطالعہ و مفہوم کے ساتھ نصیب ہو۔ بیکل اتساہی کی نعتیہ شاعری میں قرآنی الفاظ و جملوں کا پروقار استعمال ان کی شاعرانہ قدروں کو اجاگر کرتا ہے۔ ذیل میں ایسا ہی ایک شعر درج ہے۔

والنجم کے بربط کو بڑھ کر مضراب محبت نے چھیڑا
اک نغمہ رحمت گونج گیا انا انزلنا جھوم اٹھا

نعت میں احادیث کا مقام

ارشاداتِ نبوی ﷺ میں انسان اور اس کے مسائل کا حل وضاحت کے ساتھ موجود ہے۔ نعتیہ شاعری میں احادیث کا استعمال بھی انہیں شعرا کے یہاں ملتا ہے جن کی احادیث پر نظر رہی ہے۔ بیکل

اتساہی کو صرف ناموری حاصل نہیں ہے بلکہ ایک عاشقِ رسول کے دل کا سوز و گداز ہے اسی لئے ان کی نعتیہ شاعری میں احادیث کے مفاہیم خوب موجود ہیں۔ حدیث ہے کہ اللہ نے سب سے پہلے نور محمدی ﷺ کو اپنے نور سے بنایا اور تمام کائنات کو حضور ﷺ کے اسی نور سے وجود بخشا۔ شعر ملاحظہ فرمائیں۔

انہیں کے نور کا یہ ماہتاب ہے محتاج — نہ مسکرائیں تو یہ دیپ جل نہیں سکتا

ختمِ نبوت کا موضوع

بیکلؔ کو نعتیہ شاعری میں ختم نبوت کا موضوع اپنے انداز میں اکثر و بیشتر نظر آتا ہے چونکہ یہ ایک اختلافی موضوع ہے اس لیے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

اے ختم رسل اے شاہِ امم' بیتاب ترا شیدائی ہے
بیکلؔ کو بلالو چوکھٹ پر' ہر سانس یہاں گھرائی ہے

اختیاراتِ نبوی ﷺ

اللہ نے اپنے محبوب کو کیا کیا اختیارات عطا فرمائے ہیں بیکلؔ کی نعتیہ شاعری میں ملاحظہ فرمائیں۔

وہ عرش کو جلوؤں کی دولت دھرتی کو نظاروں کی قسمت
ہے لاج تو دونوں عالم کی سرکارؐ تمہارے ہاتھوں میں

جہاں وہ چاہیں ٹھہر جائے گردش ایام — زمانہ دوسری کروٹ بدل نہیں سکتا
یہ اقتدار کہ جھک کر شجر سلام کرے — یہ اختیار کہ سورج بھی ڈھل نہیں سکتا

نعت میں حمد

نعت اور حمد کے فرق کو سمجھنا ہر نعت گو کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ شدت جذبات میں نعت کی نازک حدود سے بڑھنے کا خطرہ کہیں زیادہ ہوتا ہے بیکلؔ نے نعت کی نازک حدود کو کس حد تک سمجھا ہے اور اللہ کی یکتائی کو کس انداز میں نعتیہ شعر میں مزین کیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

مت پوچھ مصطفیٰ کے وسیلے سے کیا ملا — احساسِ بندگی کی قسم اک خدا ملا

نعت میں تلمیح

تلمیحی اشعار کی اپنی ایک الگ اہمیت ہے۔ بیکلؔ کا ایک تلمیحی شعر ذیل میں درج ہے۔

نسبت جے حضور کے منبر سے ہوگئی — کوسوں کا حال جنگ بتاتا ہوا ملا

معراج النبی ﷺ

معراج النبی ﷺ کا واقعہ سائنس کے اس جدید دور میں یوں بہت اہم ہو جاتا ہے کہ انسان کا خلائی سفر جاری ہے چاند پر وہ بہت پہلے اتر چکا ہے وہاں کی بہت سی چیزیں ابھی اس کے تجسس کا حصہ ہیں۔ خلا میں بلیک ہول Black Hole کی حیرتیں بدستور قائم ہیں۔ معراج کا واقعہ جب عمل میں آیا اس دور میں خلائی سفر کا تصور بھی محال تھا۔ اسی لئے ایمان والوں نے اسے ایمان کی حد تک مانا اور دیگر نے شکوک کی گنجائش رکھی۔ لیکن دور جدید کے خلائی پروگرام نے انسان کے خلائی سفر کا عقدہ بھی حل کر دیا۔ اللہ نے اپنے محبوب کو مکانوں سے لامکاں تک جس تیز رفتاری سے سفر کرایا وہ آج کے خلائی ماہرین کے لئے حیرت کا باعث بنا ہوا ہے۔ لیکن خلائی تحقیقات معراج النبی کی صداقت کے جدید پہلو ضرور تلاش کرتی جا رہی ہے اس واقعہ سے انسان کی ترقی کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں اور اسلام کے ابتدا ہی سے ترقی یافتہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

ہیکل اتساہی نے اس اہم موضوع کو نعتیہ شاعری کا موضوع بنا کر اس واقعہ کی صداقت پر اپنے ایمان کا اظہار اشعار کے ذریعہ یوں کیا ہے۔

ایسی گھڑی بھی آئی ہے عرش عظیم پر اسرار قدس کا ہر اک پردہ ہٹا ملا

حیات النبی ﷺ

یہی ہے روح ایماں کی ہے میرا نبی زندہ
جو ان کے تلوؤں سے مس ہو گئی وہ خاک بھی زندہ
سمجھتا ہی رہا بوجہل مردہ اپنی مٹھی میں
سنا کر کلمہ طیب ہوئی ہے کنکری زندہ
نگل جائے گی دھرتی سرور دیں کے مخالف کو
جو آقا کے چہیتے ہیں وہ ہیں بن کر ولی زندہ

اسم محمد ﷺ

یاد کرتے ہیں ان کو نمازوں میں ہم کیونکہ حسن عبادت محمدؐ سے ہے

شہر طیبہ

مہ و نجوم ہیں روشن مینار طیبہ سے بنے ہیں دونوں جہاں تاجدار طیبہ سے
پہنچ سکوں نہ مدینہ تو قافلے والو مرے کفن کو بسانا غبار طیبہ سے

معجزات نبوی ﷺ

ادھر شق ہوا چاند، سورج بھی پلٹا ادھر پیڑ کرتے ہیں سجدہ پہ سجدہ

اللہ رے حلیمہ کے پیارے کا پائے ناز رکھا جہاں پہ موم سا پتھر پگھل گیا

میلاد النبی ﷺ

نہیں ہے اگر آمنہ کا دلارا، یہ قرآں نہیں یہ شریعت نہیں ہے
کہاں سے سجے گی یہ سیرت کی محفل اگر بزم ذکر ولادت نہیں ہے

شفاعت

بروز حشر مرے مصطفیٰ کی کملی نے سبھی گناہ کے ماروں کی آبرو رکھ لی

سراپا

وہ چہرے جس نے نظاروں کی آبرو رکھ لی وہ زلف جس نے بہاروں کی آبرو رکھ لی
ترے ہی نقش کفِ پا کی ایک تجلی نے فلک کے چاند ستاروں کی آبرو رکھ لی

سیرت پاکؐ

اللہ مرا رسول خار اپنائے بانٹے پھول ہونٹ کھلے بولے قرآن چشم کرم جینے کا اصول

موسموں کا موضوع

بیکل اتساہی نے موسموں کو نعت کا موضوع بنانے کا ایک منفرد لہجہ اختیار کیا ہے۔

خزاں کے بعد جب ہریالی پھیلے سرخیاں پھوٹیں کوئی غنچہ چٹک جائے تو طیبہ یاد کر لینا
لہر جائے سمندر اور ندیاں بستیاں لوٹیں کوئی کشتی ابھر آئے تو طیبہ یاد کر لینا
اندھیرا چھا گیا جب گہن ہو چاند سورج پر زمیں ایسے میں تھرائے تو طیبہ یاد کر لینا
زمیں پیاسی ہو جھلسے جا رہے ہوں کھیت کے پودے اگر پانی برس جائے تو طیبہ یاد کر لینا
تپیں جب گرمیوں کے دن بڑھے جب دھوپ کی تیزی کوئی ٹھنڈی ہوا آئے تو طیبہ یاد کر لینا

منافقوں کا موضوع

منافقوں میں کہاں لطفِ ذکر مصطفویؐ یہ بدنصیب ہمیشہ جلن میں رہتے ہیں

بیکل اتساہی صاحب کے نعتیہ کلام میں احتیاط شرعی، احترام نبوت بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہر شعر میں ایمان و عشق کے دل کی دھڑکنیں محسوس ہوتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق (بھارت)

مسرور کیفی کی نعت گوئی

نعت وصفِ محمود کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ اردو زبان کی اصطلاح میں وصف نبی اکرم ﷺ کے لئے مخصوص ہو گیا۔ خلق رسول ﷺ کے تعلق سے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خلقہ القرآن فرما کر گویا حضور اکرم ﷺ کی سیرت کی ساری تفصیل بیان فرمادی گویا چلتے پھرتے 'اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے ہر حال میں آپ مجسم قرآن ہیں ــــــ اور جس طرح کلام الٰہی کی کماحقہ معرفت کا دعویٰ سوائے نبی ﷺ کے اور کوئی نہیں کر سکتا اسی طرح حقیقت محمدی ﷺ کو خالق کائنات کے سوا کماحقہ کوئی نہیں جان سکتا ــــــ پھر بھی حب نبی ﷺ سے سرشار ایمان والوں نے اپنی فہم اور بساط کے موافق بارگاہِ نبوی ﷺ میں نعت کی شکل میں عقیدت کے گلدستے پیش کیے ہیں۔ اس طرح نعت نبی ﷺ پر علمی اور ادبی کام کی تمہید بن کر مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

جس طرح علمی اور ادبی دنیا میں علماء کے طبقات ہیں اسی طرح شعری دنیا میں بھی نعت گو شعراء کے طبقات ہیں مگر جو جذبہ ایمان کی راہ سے سب میں مشترک ہے وہ حب رسول ﷺ ہے۔ نعتیہ شاعری کی یہ قدر مشترک ایسی ہے جو ناقد کو نعت گو شعراء کے احترام کے لئے مجبور کرتی ہے۔ بہر حال نعت گو شعرا کو چند طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جس نے اپنی علمی اور ادبی قابلیت کو بروئے کار لا کر بیان کے نئے اسلوب اختیار کیے اور فنی لحاظ سے نعتیہ شاعری کو چار چاند لگا دیے۔

ایک طبقہ وہ بھی ہے جس نے اس فن کو اصلاح قوم کے لئے برتا اور اسوۂ حسنہ کو اجاگر کرنا ان کا مقصود رہا۔ ہمارے ادب میں اس طبقے میں عظیم شعرا گزرے ہیں جن کے کلام کے گوناگوں محاسن نے نعتیہ شاعری کو مقصدی 'اصلاحی' ملی اور قومی شاعری بنا دیا۔

نعت گو شعرا کا ایک طبقہ وہ بھی ہے جس نے حب رسول ﷺ کا گیت محض حب رسول ﷺ کے اظہار کے لئے گایا۔ اس طبقے کے سربرآوردہ شعرا میں جناب صالح محمد مسرور کیفی بھی نمایاں حیثیت

رکھتے ہیں۔

جناب صالح محمد سرور کیفی کے شعری ذوق کی نمو جوں کی شاعری سے ہوئی۔ یہی ذوق غزل گوئی کے رنگ میں ابھر کر سامنے آیا۔ پھر جب انہیں ۱۹۷۶ء میں فریضۂ حج کی ادائی اور روضۂ اطہر کی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی تو بتوفیق ایزدی ان کی غزل گوئی نے اپنے موضوع کے لئے نعت کی لے اختیار کرلی۔ ان کی نعتیہ شاعری کی عمر کم ہے مگر اس قلیل عرصے میں ان کے کلام کے نو مجموعے ۱۹۹۲ء تک منظر عام پر آچکے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) چراغ حرا جو ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

(۲) ملجا و ماوا جو ۱۹۸۰ء میں منظر عام پر آیا۔

(۳) جمال حرم' جس کی اشاعت ۱۹۸۱ء میں ہوئی۔

(۴) مولائے کل' اس کا سن اشاعت اپریل ۱۹۸۲ء ہے۔

(۵) نور یزداں' جو اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔

(۶) میزاب رحمت کا سن اشاعت مارچ ۱۹۸۴ء ہے۔

(۷) سید الکونین' مارچ ۱۹۸۶ء میں قارئین کے ہاتھوں میں پہنچا۔

(۸) سجدۂ حرف' مجموعہ کلام مارچ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

(۹) حرف عطا کی اشاعت جنوری ۱۹۹۲ء میں ہوئی۔

یہ تفصیل ۱۹۷۸ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصے کی ہے جو راقم الحروف کے علم میں تھی۔ اس تفصیل سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس قلیل عرصے میں شاعر نے اپنے نعتیہ کلام کا کتنا بڑا ذخیرہ اہل ذوق کے سامنے پیش کیا۔

جناب کیفی صاحب سے میری ملاقات ۱۵ر نومبر ۱۹۹۲ء کو کراچی میں صرف ایک بار نہایت مختصر وقت کے لئے ہوئی جب موصوف نے اپنے کلام کے مجموعے مرحمت فرمائے۔ نظریں اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھیں اشک آلود پائیں۔ پھر بعد میں جب کلام پڑھا تو اس شعر نے ملاقات کے منظر کو نظروں کے سامنے پیش کردیا۔

قدموں سے میں سرورؔ لپٹ جاؤں جو مل جائے
سرکارؐ دو عالم کا کوئی چاہنے والا

سرورؔ کیفی صاحب کا کلام پڑھنے کے بعد ان کی شاعری کے کئی پہلو سامنے آئے سب سے پہلے تو یہ کہ وہ محض حب رسول ﷺ سے مجبور ہو کر نعت کہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

داد و تحسین سے ستائش سے   سچ تو یہ ہے کہ دم نکلتا ہے (۱)

ان کا فن حب رسول ﷺ کے سہارے فروغ پاتا ہے۔ اسی لئے اس میں بے تکلفی، سادگی اور بے ساختگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کا کلام ان کے دلی جذبات کا والہانہ اظہار ہے۔ اس کے لئے وہ مجبور ہیں۔ یہ ان کی فطرت کا تقاضا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

نعت مسرورؔ میں نہیں کہتا   یہ تو حصہ ہے میری فطرت کا (۲)

مست ہوتا ہوں جھوم لیتا ہوں   نعت کہنا تو کس کو آیا ہے (۳)

شاعر کے فکر و نظر میں ایک ہی حقیقت بسی ہوئی ہے اور وہ ہے حقیقتِ محمدی ﷺ۔ اسی محبت کے آنسوان کی آنکھوں سے اکثر بہتے رہتے ہیں۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں ملتا ہے ؎

پہلے اشکوں سے آنکھ نم کیجے   پھر ثنائے شہِ امم کیجے (۴)

آپؐ کی رحمت کا اندازہ کیا   ہم نے اپنی چشم نم کو دیکھ کر (۵)

جذبے کی، روانی کی، الگ بات ہے ورنہ   دیکھو تو مرے پاس نہ فن ہے نہ ہنر ہے

توجہ مل گئی سرکارؐ کی لطف و کرم کے ساتھ   بنے ہیں کام کیا کیا ایک دامن بھیگ جانے سے (۶)

مسرورؔ کیفی نے اپنی زندگی کے لمحات کو ذکر رسول کے لئے وقف کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے وہ اسی خیال میں محو ہیں۔ اسی محویت کے عالم میں وہ اپنے جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر بنا دیتے ہیں۔ ان کا کلام دماغ سے زیادہ دل کی گہرائیوں سے نمودار ہوتا ہے۔ ان کی طبیعت نعت کہنے کے لئے ہمیشہ رواں دواں ہے۔ نظم ہو یا نثر، دردن سینہ جذباتی طوفان اپنے ظہور کے لئے جب حرف و صوت کی شکل میں نمودار ہوتا ہے تو وہ شاعری بن جاتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلنے والا نغمہ سننے والوں کی روحوں کو جھنجھوڑتا ہے اور دلوں کو تڑپاتا ہے۔ اسے سن کر سمجھنے والا بھی محظوظ ہوتا ہے اور نہ سمجھنے والا بھی مسرور ہوتا ہے۔ ایسا شاعر اپنی بلند فکر کو عام فہم سطح پر لانے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔ ایسی شاعری اپنے فطری بہاؤ کے ذریعے سبھی کے دلوں میں گھر کر جاتی ہے۔ جناب مسرورؔ کیفی کے کلام کا بڑا حسن ان کا عام فہم انداز بیان ہے جس کی برجستگی کلام کے لئے نور علیٰ نور ہے۔ ان کے کلام کی بڑی خوبی اس کی دل نشینی ہے۔ اس میں اسوۂ حسنہ کے سارے

---

(۱) (۲) (۳) (۴) (۵) (۶) حرف عطا، ص ۹۴، ۱۶، ۶۷، ۶۹، ۶۴، ۳

مضامین حب رسول ﷺ میں ڈوب کر راہ پاتے ہیں۔ قرآن و حدیث کی تلمیحات براہ راست تو کم ملیں گی مگر قرآن اور حدیث کے مضامین کی تشریح دل نشیں پیرائے میں جا بجا یہاں میں ضرور ملے گی۔

سرورؔ کیفی فکرِ سخن میں آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی کاوش میں نہیں رہتے اور نہ صنائع و بدائع کی پیچ در پیچ موشگافیوں کے سہارے کلام کو حسین بنانے کی فکر کرتے ہیں۔ عملاً وہ شعر میں اثر پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ وہ ملاوٹ کے فن سے ناواقف ہیں اور مزاجاً اس کے اہل نہیں ہیں۔ ان کے کلام میں جو بھی ہے آمد ہی آمد ہے آورد کو دخل نہیں۔ ان کے کلام میں اسوۂ رسول ﷺ کا بیان اس غرض سے ہے کہ وہ ہماری زندگیوں کے لئے نمونہ بن جائے۔ وہ قرآن اور حدیث کے مضامین کی تشریح میں دل نشیں پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں جس سے کلام کی عملی افادیت کا ثبوت ملتا ہے۔

جناب سرورؔ کیفی کے نعتیہ کلام کے خدوخال درج ذیل ہیں:

(۱) خلوص اور اثرانگیزی

تسکین قلب و جان کا سامان ہو گیا — طیبہ مری حیات کا عنوان ہو گیا
تا زیست مجھ کو ناز رہے گا نصیب پر — اک شعر بھی جو شان کے شایان ہو گیا (۱)

جب نگاہ لطف مجھ پر ہو گئی — دل منور جان معطر ہو گئی

میری سرورؔ متاع دل و جاں ہے تو یہی — پھر میں یادوں کے دیئے کیوں نہ جلائے رکھوں

ڈھونڈا جو مداوائے دل و جاں ہم نے — سرکارؐ مداوائے دل و جاں نکلے (۲)

جس نور سحر کی تھی تمنا مرے دل میں — قسمت سے وہی نور سحر دیکھ رہا ہوں

مرے فکر و خیال کی ندرت — مرا حسن بیان مدینے سے (۳)

(۲) اتباع رسول ﷺ

جو کچھ کہا ہے آپ نے اے فخر کائنات — وہ میری جان ہو گیا ایمان ہو گیا

ہو جس کا حبیب خدا پیشوا — اسے اور سرورؔ کیا چاہئے (۴)

---

(۱) حرف عطا ص ۸۱ — (۲) چراغ حرا بحوالہ سفینۂ نعت ص ۴۱
(۳) طلوع ماہ بحوالہ سفینۂ نعت ص ۸۷ — (۴) چراغ حرا بحوالہ سفینۂ نعت ص ۴۸

سنت ہی سمجھ کر آقا کی ۔۔۔ سوکھی بھی ملے تو کھایا کر (۱)

(۳) صفاتِ محمدی ﷺ کا بیان

راحتِ قلب و نظر ہے آپ سے ۔۔۔ رونق شمس و قمر ہے آپ سے

آسماں کی رفعتیں اپنی جگہ ۔۔۔ ہے سوا اس سے بھی رفعت آپ سے

بارگاہِ مصطفیٰ میں آگئے ۔۔۔ ہم اندھیرے سے ضیاء میں آگئے

لیجئے بدلہ کسی سے کس طرح ۔۔۔ کیا کبھی سرکار نے بدلہ لیا ؟ (۲)

بندگی کے جس قدر آداب تھے ۔۔۔ وہ ہمیں کس نے سکھائے، آپؐ نے (۳)

کونین کے مالک کے غلاموں کو خبر دو ۔۔۔ کونین کے مالک کی غذا نان جویں ہے

پیٹ پر پتھر جو اپنے باندھ لے ۔۔۔ اس کے ماتھے کا پسینہ چاہئے (۴)

عاصیوں سے بھی پیار کیا کہنا ۔۔۔ آپ سا غمگسار کیا کہنا

(۴) وارفتگی اور حبِ رسول ﷺ کی سرمدی کیفیت

سرورؔ ابھی تک ہے وہ عالم طاری ۔۔۔ قدموں میں محمد کے پڑا ہوں جیسے (۵)

حاصل صد بہار دیکھیں گے ۔۔۔ ہم نبیؐ کا دیار دیکھیں گے (۶)

شوق دیدار میں اک بار اٹھالیں آنکھیں ۔۔۔ روضہ پاک جو دیکھا تو جھکالیں آنکھیں
کیا ہوا ہم نے جو رو رو کے گزاریں راتیں ۔۔۔ انؐ کے دیدار کے قابل تو بنالیں آنکھیں (۷)

سر خمیدہ، ہونٹ لرزاں، اشکبار ۔۔۔ آپؐ کے دربار میں سرورؔ ہے (۸)

سامان سفر کھول کے پھر باندھ رہا ہوں ۔۔۔ آیا تھا مدینے سے، مدینے کو چلا ہوں (۹)

(۵) کلام میں بے ساختگی

پھول میں ہے نہ وہ صبا میں ہے ۔۔۔ ایک خوشبو جو خاک پا میں ہے (۱۰)

---

(۱) سید الکونین ص ۲۱۶ (۲) جلوہ ماہ بحوالہ سفینہ نعت ص ۷۳ (۳) چراغ حرا بحوالہ سفینہ نعت ص ۶۱ (۴) جمال حرم بحوالہ سفینہ نعت ص ۱۰۶ (۵) چراغ حرا بحوالہ سفینہ نعت ص ۵۲ (۶) جمال حرم بحوالہ سفینہ نعت ص ۱۰۱ (۷) حرف عطا ص ۴۱ (۸) میزاب رحمت ص ۱۹۰ (۹) میزاب رحمت ص ۱۸۴ (۱۰) چراغ حرم بحوالہ سفینہ نعت ص ۵۴

رحمتوں کی بہار ہے درکار رحمتوں کی بہار مل جائے
بے قراری سی بے قراری ہے میرے آقا قرار مل جائے (۱)

تم دیکھنا یہ لطف بھی سرکار کریں گے صحرائے دل زار کو گلزار کریں گے
کیوں اذنِ کی حضوری سے وہ انکار کریں گے بیمار کو کیا اور بھی بیمار کریں گے؟ (۲)

(۶) بے احتیاطی میں بھی احتیاط

فرطِ عقیدت میں نعت گو شعراء اکثر بے احتیاطیاں ہوتی ہیں۔ اس لغزش سے اپنے عالمانہ انداز کے باوجود محسن کاکوروی بھی نہ بچ سکے۔ سرورؔ کیفی نعت گو شاعر کے اس نازک موقف کو پہچانتے ہیں اوراس سے پہلوتہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مانا خدا تو نہیں ہیں مگر خدا کی یقیناً زبان آپؐ ہیں (۳)

حقیقت میں حمد خدا بھی یہی ہے محبت کے گن گاؤ سرورؔ کیفی (۴)

غرض یہ کہ جناب سرورؔ کیفی موجودہ دور کے ان نعت گو شعراء میں ہیں جن کی فطرت میں ذوقِ نعت گوئی ودیعت کیا گیا ہے اور جس کی تحریک کے لئے انھیں حب رسول ﷺ کی ایمانی دولت سے نوازا گیا ہے۔ اسی لئے ان کی شخصیت سراپا نعت بن کر شعری دنیا کے سامنے آئی۔ باوجود اس بے پایاں صلاحیت کے اس فن میں وہ اپنی بے مائیگی کا احساس رکھتے ہیں جو ان کے مزاج کی خاکساری کی دلیل ہے۔ اسی لئے ان کی زبان سے جو شعر نکلتا ہے وہ خلوص میں ڈوب کر نکلتا ہے اور سننے والے کے دل کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ نعت واہ واہ اور تحسین کے لئے نہیں کہتے۔ ان کا جذبہ بارگاہِ نبوی ﷺ میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ سرورؔ کیفی کے کلام کا اصل حسن ان کا خلوص ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں برجستگی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ ان کے کلام کی ایک اہم خوبی اس کی دل نشینی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جناب سرورؔ کیفی کا مقام اردو کے نعت گو شعرا میں اپنی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے ان کا شمار ان اکابرین میں ہوتا ہے جنھوں نے نعت کے فروغ میں اہم خدمت انجام دی ہے۔ جو زبان حال سے یہی کہہ رہی ہے ۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

---

(۱) چراغ حرم حوالہ سفینہ نعت ص ۵۴ (۲) میزاب رحمت ص ۱۸۸
(۳) میزاب رحمت حوالہ سفینہ نعت ص ۱۸۶ (۴) چراغ حرا حوالہ سفینہ نعت ص ۱۷۸

ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

امین راحت چغتائی کی نعت گوئی

اُس مسافر کی صدیوں سے جاگتی آنکھوں میں کتنی وادیوں اور کتنے قریوں کے مناظر آباد ہیں۔ ہر منظر روشن، ہر دید اُجلی۔ اور اِن منظروں کے ساتھ ساتھ کتنے ہی چہرے، کتنے ہی کردار، کتنے مقام۔ یو میری باک کا وہ درخت جس کے سفید پھول اپنے افق کی تخلیق خود کرتے ہوئے ستارہ وار دیکھنے والوں سے چشمک زنی کرتے ہیں، اور اُسے ہجر و وصل کے مفاہیم سے آشنا کرتے ہیں۔

یہ مسافر امین راحت چغتائی ہے۔ جس کا نام اُس کی سعادتوں کا اشاریہ ہے۔ بعثت سے پہلے ہمارے سرورِ جاں ﷺ کو اُن کے معاشرے نے امین و صادق کہا۔ ان پر جو حقائق منکشف کیے گئے اور اہلِ زمین سے اُن کا جو معاملہ رہا اس نے انھیں الامین کے درجہ پر فائز کیا۔ ہمارے چغتائی صاحب اُس ذاتِ گرامی (ﷺ) کی محبت کے امین ہیں اور اُس ذات کی صفات اُن پر بقدرِ ظرف منکشف کی گئی ہیں، اور اِس کا اندازہ ہم میں سے کون لگا سکتا ہے کہ رسولِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کی وسعتیں کیا ہوں گی ...... ؟ اور پھر راحت۔ جس رسولِ مرحمت کے سائے میں اقوامِ عالم کو تا ابد رحمت عطا کی گئی، اُس کا نام نامی اپنے محبّ کے سر پر سائبان کی طرح سایہ فگن رہتا ہے۔ میری بات کی صداقت کا اندازہ آپ کو امین راحت چغتائی کے چہرے کے نقوش، روشن پیشانی، ہونٹوں کے تبسم اور لہجے کی غنچہ صفتی سے ہو سکتا ہے۔ خاصانِ محمدؐ اِس ہجومِ دیگراں میں سب سے الگ نظر آتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ مجھے بھی اربابِ حضوری میں شامل کر دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر جمیل نقوی مرحوم کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

میں بھی من جملہ اربابِ حضوری ہوں جمیلؔ
میری خاصانِ محمد ﷺ سے شناسائی ہے

یہ خاصانِ محمد ﷺ عجب انداز میں ہماری زندگی میں شامل ہو جاتے ہیں، بلکہ اُن کی ایک جھلک ہمارے وجود کی کیمیا کو بدل دیتی ہے...... کبھی اُن کا کوئی نمائندہ ہمیں صفہ پر تلاوت میں گم نظر آتا ہے، کبھی اُن میں سے کوئی گنبدِ خضریٰ کے پیغام اور فیضان کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے مل جاتا ہے، کبھی خاصانِ محمدؐ

میں سے کوئی، کسی ہجوم میں چپکے سے آپ کے پاس آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کبھی کوئی اشارے پر آپ کو محمد ﷺ اور اصحابِ محمد رضی اللہ عنہم اجمعین کے بارے میں کوئی کتاب بھیج کر آپ کو "خوش اوقات" بناتا ہے۔

خاصانِ محمد ﷺ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں، لیکن اُن کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جاتے ہیں کہ حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ہمارے معاشرے میں اندھیر ابڑھ جائے اور ہمیں یہ موقع نہ مل پائے کہ ہم اُن کے جلوؤں کی مدد سے زندگی کی شبِ تاریک سحر کر سکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سرورِ کائنات اور وجہ تخلیقِ کائنات ﷺ کے قدموں کے ذرات کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہیں اور چاندنی رات میں جب پھیلی ہوئی دُنیا اپنی وسعتوں کا اعلان کرے تو کسی کا دامانِ کرم صحرا کی وسعتوں پر چھا جائے۔ صحرا کی بے کرانی کا اندازہ کئے بغیر بہت سے حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ انہیں وسعتوں میں آدمی کو آسمان، اپنے سے قریب تر نظر آتا ہے، زمین کے سینے سے اُبھرنے والی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ریت کے ذرات اُس کے نقوشِ قدم کی تابانیوں کا اشارہ بن جاتے ہیں جس نے صحرائے وجود کو گلستان بنایا۔ میں نے چاندنی راتوں میں صحراؤں کی بہار سامانی اور نظر افروزی کو دیکھا ہے اور اِس منظر کے آئینے میں اُس ذات کے وجود کا احساس قوی تر بن گیا ہے جس کا کرم ابرِ رحمت بن کر گنگا سے نیکس تک برسا ہے، جو آج بھی ہر اہل ایمان کے دل کی دھڑکن ہے، جس کے وجودِ پاک سے ہمیں اور ہماری ذات کو معنویت عطا کرنے والی آرزو آگئی ہے۔ امین راحت چغتائی کے دو شعروں میں مجھے اپنے کتنے ہی شب و روز کی تجسیم نظر آئی ہے۔ اُن کی بیشتر نعتیں، غزل کے پیکر میں لکھی گئی ہیں۔ مگر اِن غزلیہ نعتوں کا تسلسل اُن کی شخصیت کی وحدت کی علامت ہے۔ ایک نعتِ مسلسل کے یہ دو شعر اُن کی زندگی کی تمنا کا آئینہ ہیں۔ "تمنا کی جگہ تمناؤں" کا لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، مگر اِس نعت کی ساری تمنائیں، ایک ہی تمنا کے پہلو ہیں ؎

تیرے قدموں کے بھی ذرات ہیں آئینہ بدست
کاش اس آئینے میں اپنا سراپا دیکھوں
یاد آئے ترے دامانِ کرم کی وسعت
چاندنی رات میں جب دامنِ صحرا دیکھوں

وہ ذاتِ گرامی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے جن کا اسم گرامی ہی ہمارے لیے وظیفۂ تسکین دل و جاں ہے۔ انسانیت کی پوری تاریخ میں کسی نبی کا نام معجزۂ الٰہی کے درجہ پر فائز نظر نہیں

آتا۔ "محمد ﷺ" یہ ایک لفظ کامل ترین ثنا اور نعت ہے...... بیسویں صدی کے پہلے دو عشروں تک "نگرام" کی چھوٹی سی بستی صلحاء علما کے وجود سے روشن تھی۔ انھیں میں جواں مرگ مولانا عبدالرحمن نگرامی بھی تھے جنھوں نے اِسمِ پاک محمدؐ پر نہایت خوبصورت ایمان افروز اور فکر انگیز مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون تفسیر ماجدی میں ضمیمہ کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور یوں رسول اکرم ﷺ کے ایک چاہنے والے اور جاں نثار کا نام محفوظ ہو گیا ہے۔ مولانا نگرامی نے لکھا کہ "من جملہ دیگر کمالات و معجزاتِ رسالت کے ایک معجزۂ گرامی حضورِ اقدس کا نام نامی بھی ہے"...... محمد وہ ہے جو موجبِ توصیف ہو، مجموعۂ خوبی ہو اور جس سے زیادہ تکمیل و کمال آدمیت و اخلاق کا کوئی اور نمونہ اور نمائندہ نہ ہو اور جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو...... ذرا غور کیجیے تو اسمِ محمدؐ ختمِ نبوت کی دلیل بھی ہے۔ جب اخلاق و کمالات کسی ذات میں اپنی انتہائی تکمیل تک پہنچ جائیں تو نبوت کے ادارے کا مقطع وہی ذات ہو گی۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مخلوقِ کامل تھے۔ ذات و شخصیت اور نام کی یہ کامل ہم آہنگی پہلی اور آخری بار حضور ﷺ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ ایک بار پھر مولانا نگرامی کے الفاظ حوالے کے طور پر پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

"نوعِ انساں کو جس سرحدِ کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حقِ تخلیق مقرر تھا وہ محمد ﷺ پر پورا کر دیا گیا۔"

امین راحت چغتائی کی نعتوں میں اسمِ محمد ﷺ کے یہ نکات نظر آتے ہیں۔ علم جب وجدان کی مدد سے جذبہ بن جائے اور دل کی دھڑکن بن جائے تو دوسروں کے راستے روشن ہو جاتے ہیں۔ عقل تجزیہ کے عمل سے درجہ بدرجہ جس نتیجے تک پہنچتی ہے، وجدان کسی لمحۂ مقررہ میں اُسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اِسے اقبال کے الفاظ میں "دانشِ نورانی" کہہ لیں۔ اس نورِ مجسم کے فیضان نے ہمارے چغتائی صاحب کو اِس دانشِ نورانی کا امین بنا دیا ہے اور کائنات کے سب سے فصیح انسان کی فصاحت کے عکس نے اِس دانشِ نورانی کے اظہار کے لیے انھیں اسالیب اور الفاظ بھی عطا کر دیے ہیں، ورنہ روحانی تجربے کا اظہار ابلاغ و اظہار کی دُنیا کا سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ جذبات ادیب و شاعر کی گرفت میں آ جاتے ہیں اور یوں کہ شاعر کا اظہار، ہمارا اظہار اور تجربہ بن جاتی ہے۔ فکر کا ابلاغ نسبتاً آسان ہے لیکن روحانی تجربہ اُدھر کے اشارے کے بغیر کاغذ پر الفاظ کی صورت میں نہیں ڈھلتا...... ایسے تجربے ہماری خارجی زندگی کے سیاق و سباق کا احاطہ بھی کر لیتے ہیں اور یوں ذات کا نہاں خانہ، خارجی کائنات کی وسعتوں میں اپنے دروازے کھول دیتا ہے۔ اِس حوالے سے اسمِ محمد ﷺ کے اطراف و جوانب اور پھیلاؤ کو امین راحت چغتائی کے اِن شعروں

میں ملاحظہ کیجیے۔

مہک پھیلی ہوئی ہے ہر طرف اسم محمدؐ کی
جہاں ہوتی نہیں پت جھڑ، میں اُس گلزار میں آیا
محمدؐ نامِ نامی لکھتا جاؤں، چومتا جاؤں
بہ ایں صورت میں اپنے دردِ دل کی داستاں لکھوں
تیرے ہی نام سے مجھے فخرِ سخن ملے   تیرا ہی نام نعت کے الفاظ میں ڈھلے

اسمِ محمد خود ہی بے خزاں گلزار ہے'یا پھر اسلام گلزارِ محمدی ﷺ ہے اور ہمارے صاحب کے نام کی برکت سے یہ گلزار'خزاں نا آشنا ہے'اِس باغ کا ہر پھول اُس کے حسن وجمال کے ایک نئے رُخ اور پہلو کو پیش کرتا ہے جو خالقِ جمال کا شاہکار تھا...... "مہک" اور "گلزار" کے اشاروں کی معنویت بڑی پہلو دار ہے...... پھر "ہر طرف" کے امکانات پر غور کیجیے۔اِس میں ہر مکاں اور ہر زمانہ سمٹ آیا ہے۔اِس نام نے زماں میں بھی سفر کیا ہے اور مکاں میں بھی...... دوسرے شعر میں اسمِ محمد ﷺ کو ہر درد کا درماں کہہ کر بات کو محدود نہیں کیا ہے بلکہ اسے اپنا دردِ دل قرار دیا ہے۔یہ درد'انسانیت کے مسائل ومصائب اور مشکلات کو اپنا غم بنا لینے کا نام ہے۔ یہ ہماری ذات کی توسیع ہے اور سرورِ کائنات کی شب بیداری اور اُن آنسوؤں کی وراثت ہے جو کافروں کے لیے ہدایت اور ایمان کی دعاؤں کے دوران آپ کی آنکھوں سے اپنا سفر شروع کرتے اور رخسارِ مبارک کی تابانیوں سے نئی تابانی حاصل کرتے اور آج بھی زمانے کے دامن پر چمک رہے ہیں۔

یہی نام فکر کا سرچشمہ اور جذبہ کے طلوع ہونے کا مطلع ہے اور یہی نام "نعت کے الفاظ" کی ٹکسال ہے'یہی نام کارگہ'فکر ہے اور اِس میں ڈھلنے والا ہر ستارہ ہمارے مقدر کی سمت کا اشاریہ ہے۔ محمد ﷺ اور اسمِ محمد ﷺ کے کمالات چودہ صدیوں میں وقت کے انقلابات کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آرہے ہیں۔یہ وہ پھول ہے جس کا کھلنا جاری ہے۔ہر پنکھڑی کے کھلنے کے ساتھ صلِ اللہ کی آواز چنگ کا اعلان بن کر کانوں سے قلب تک کا سفر کرتی ہے......اُس ذات کی مدح وثنا کا سلسلہ جاری ہے'اپنوں کے دل اور غیروں کے ذہن اور فکر'اعترافِ عظمتِ سرورِ کائنات میں مصروف ہیں۔

"اِس حیثیت سے نامِ مبارک محمد ﷺ کا ترجمہ سلسلہ'اوصاف ومحامد ہو گا۔" (مولانا نگرامی)
اِس سلسلہ'اوصاف ومحامد'نبی کریم ﷺ کے لیے دعائیں'مقامِ محمود کے ذکر اور اُن سے اپنی نسبت کے اظہار کا نام صلوٰۃ وسلام اور درود ہے...... یہ واحد عمل ہے جو اہلِ ایمان کو اللہ اور فرشتوں کا ہم کار بنا دیتا

ہے۔امین راحت چغتائی کی نعتوں میں درود کے کتنے ہی رنگ ہیں۔ کہیں تکریم کا رنگ ہے، کہیں مدح و ثنا کا آہنگ، کہیں علوئے مرتبۂ محمدی ﷺ کی دعا اور تمنا، کہیں برکت و رحمت کا نغمہ، کہیں وہ صدائے سید سوز جو حریم ناز میں گونجتی ہے اور جس کے لیے جبرئیل امین بھی گوش بر آواز نظر آتے ہیں، کہیں صلوٰۃ و سلام میں محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کے نشان نظر آتے ہیں۔ کہیں لبوں پر دائرے بناتے ہوئے صلوٰۃ وسلام کے الفاظ اذنِ حضوری کی استدعا بن جاتے ہیں۔ اور درود تو وہ جاوداں پھول ہیں جن سے امین راحت چغتائی کا گلستانِ تمنا مہک رہا ہے۔

کچھ درودوں کی صدائیں تھیں حریم ناز میں
اور جبریل امین بھی گوش بر آواز تھا

درودوں کی مہک پھیلی ہوئی ہے عرش اعظم تک
مرے آقا کی عظمت کا نشاں، دیکھو! کہاں تک ہے

منتظر کب سے ہوں سوغات درودوں کی لیے
اب مجھے اذنِ حضوری مرے آقا! ہو جائے

ہر گوشے میں پھول اُن کے درودوں کے کھلے ہیں
دیکھے تو سہی، کوئی گلستانِ تمنا

نعتوں میں یہ درود و سلام مجھے تو قرآنی حکم کی تعمیل کی صورت میں نظر آتے ہیں یاایھاالذین امنو صلوا علیہ وسلموا تسلیما. عملی، لسانی، فکری اور جذباتی پہلوؤں پر محیط تعمیل...... وہ تعمیل جس میں پورا وجود شامل ہو...... پورے وجود کی شرکت کے بغیر ایمان اور اسلام کی تکمیل نہیں ہوتی۔ "اے اہلِ ایمان! اسلام میں سموچے داخل ہو جاؤ۔"

امین راحت چغتائی کے ہاں بیشتر مقامات پر درود کا لفظ صیغۂ جمع میں آیا ہے۔ درود کی تکرار سے وہ پل تعمیر ہوتا ہے جو دوست کو دوست سے ملا دیتا ہے۔ کسی اہلِ دل کی یہ بات مجھے اکثر یاد آتی ہے کہ ہر صاحبِ ایمان کے دل کا تار قلبِ محمدی ﷺ سے جڑا ہوتا ہے اور "خدا نہ کرے" اگر یہ تار ٹوٹ جائے تو آدمی مرتد ہو جاتا ہے۔ اس تار کی مضبوطی اور استواری کا نسخہ یہی ہے کہ لب پہ درود و سلام ہو، دل میں درود و سلام ہو۔

امین راحت چغتائی کی نعت اِسی حقیقت کا فنی اور فکری مرقع ہے...... ایسا مرقع جس میں آواز' نظارہ بن جاتی ہے اور منظر آواز کی صورت سنائی دیتا ہے۔

صلوٰۃ ودرود کے فضائل پر کتنی ہی کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔ ہمارے اسلاف کے دور سے لے کر ہمارے عہد تک...... احادیث کے مجموعوں میں اِس سلسلہ میں مستقل ابواب موجود ہیں۔ ہر پڑھا لکھا مسلمان درود کے فضائل سے واقف ہے' اور جو خواندہ نہیں ہیں اُن کے صحیفۂ قلب پر اِن فضائل کو ربِ محمد ﷺ نے رقم کر دیا ہے۔ خوش بخت ہیں چغتائی صاحب کہ درود و سلام کے لیے اُن کے دل اور ذہن کو رب العزت نے ایسی کشا عطا کی ہے جو آج کی نعتیہ شاعری میں کم ہی نظر آتی ہے۔ درود و صلوٰۃ کے وہ الفاظ جو ہمیں بارگاہِ مصطفوی ﷺ سے عطا ہوئے ہیں اُن کے برگزیدہ ہونے میں کون شک کر سکتا ہے؟ اُن کی فضیلت مسلم' اُن کے ورد سے ہماری شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کے اُمتی اور بالخصوص شاعر و ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں اور جوہر کو اپنے آقا کے اوپر نثار کرنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ سرورِ کائنات کی عظمتوں اور مرتبہ عالی کے کسی ایک گوشے کی جھلک بھی پیش نہیں کر سکتے' لیکن دل زندہ اور ذہن تابندہ تو اظہار کے بہانے مانگتا ہے اور اُس کے ذکر کی تمنا سے بڑھ کر اور کیا چیز محرک بن سکتی ہے جس کا نام نامی ہی ثنا اور مدح ہو۔

حضور ﷺ کے کتنے ہی صفاتی نام قرآن حکیم اور احادیث میں موجود ہیں اور یہ نام مستقل نعتوں کا درجہ رکھتے ہیں۔ حاشر' عاقب' شاہد' مبشر' نذیر' نور' مزمل' مدثر وغیرہ۔ ان ناموں کے معانی و مفاہیم کو بہت تفصیل سے ہمارے اہل قلم پیش کر چکے ہیں اور ان کے معانی کے نئے گوشے مسلسل سامنے آ رہے ہیں۔ ان ناموں کے علاوہ ہمارے تخلیقی ذہنوں میں نئے نام ابھر رہے ہیں۔ امین راحت چغتائی کے ذہن میں ایک ترکیب ابھری جو نام بھی ہے اور تصویر بھی۔

تصویرِ مرتبہ رسالت کی' تصویرِ مقامِ محمدی ﷺ کی تصویر اس ربط کی جو خالق اور مخلوق کامل (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے درمیان ہے۔ اس نعتیہ مجموعہ کا پہلا نغمہ یا مکمل سازینہ ہے محرابِ توحید...... یہی اس مجموعہ کا نام ہے۔ اس امت کو اس محراب کے نیچے توحید کا گوہرِ یک دانہ ملا ہے۔ اسی محرابِ رسالت میں ہم سجدۂ عبدیت اپنے خالق کے حضور پیش کرتے ہیں۔ اس مقام پر اپنا سر اپنے خالق کے سامنے جھکاتے ہوئے ہم اپنے آقا کے لیے اس مقامِ محمود کی دعا کرتے ہیں جو ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

امین راحت چغتائی نے اس سے پہلے جو کچھ لکھا وہ ثنائے خواجہ کے لیے تمہید تھی۔ لفظوں کو صرف

کرنے کا سلیقہ انہوں نے اللہ سے اسی لیے طلب کیا کہ مدحِ سرکار کی راہیں سہل ہو سکیں۔ کم و بیش انہوں نے شعر و سخن کی وادی میں زندگی کے پچاس برس گزارے ہیں۔ اس طویل مدت میں انہوں نے الفاظ کو مسخر کیا' اپنے لہجے کو تراشا' موضوع اور اسلوب کو ہم آہنگ کر کے اپنی انفرادیت کو ابھارا اور یوں وہ مدحتِ سرکار مدینہ کا حق ادا کرنے کے لیے عملی اور فنی طور پر مصروف رہے۔ اِس سے اہم یہ بات ہے کہ مالکِ حرف و نوا سے اُنہوں نے تابِ گویائی کی دعائیں کیں اور سرورِ اعظم ﷺ سے ہنر اور جمالِ فن کی بھیک مانگی۔ یوں اُن کا کشکولِ گدائی' خزینۂ اسلوب بن گیا۔

دے ہنر کی بھیک ہنر ورا کہ جمالِ فن مرا کم نہ ہو
میں تو آنسوؤں سے وضو کرو تری نعت پھر بھی رقم نہ ہو

اِس سلسلے میں انہیں کیا کچھ دربارِ رسالت سے ملا' اُس کا اندازہ قارئین کرام اُن کے مجموعے کے مطالعہ سے کر سکیں گے۔ انہوں نے زندگی' کائنات' تاریخ اور جغرافیہ کو مدحتِ سرکار کا حصہ بنا دیا۔ اپنے پڑھنے والوں کو نواحِ کاظمہ میں پہنچا دیا اور ریگ کے ذروں کو آئینۂ ثنا بنا دیا۔

مدینہ منورہ کا ذکر ہماری نعت کے مرکزی موضوعات میں شامل ہے۔ اب بیشتر شعرا کے ہاں یہ ذکر روایتی بن کر رہ گیا ہے' حالانکہ زندہ ادبی روایت باز آفرینی کی قوت رکھتی ہے اور اُس میں فرسودگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے...... مدینۂ منورہ کا ذکر چغتائی صاحب کے کلام میں ایک زندگی ساز اور حیات آفریں قوت کے طور پر ہوا ہے۔ درِ اقدس پر حاضری ہمارے وجود کو تمنائے محمد ﷺ بنا دیتی ہے...... وہاں پہنچ کر ہمیں یہ خبر دی جاتی ہے کہ اب ہماری زندگی شروع ہو رہی ہے...... مدینہ تو کون و مکاں کا خلاصہ اور انتخاب ہے۔ مدینہ سے محبت' مدینے والے سے محبت کا دیباچہ بھی ہے اور ثبوت بھی...... ذکرِ مدینہ میں ابنِ راحت چغتائی کے ہاں نیا اور تازہ اسلوب ملتا ہے اور اِس نوائے عاشقانہ میں جو تہذیب ہے وہ اپنی داد بھی ہے اور جزا بھی۔

ذرا ٹھہرو' مدینہ آ گیا ہے
ابھی ہونے کو ہے آغازِ ہستی

وہ بھی دن آئے کہ پہنچوں جو درِ اقدس پر
دل مرا دل نہ رہے' اُن کی تمنا ہو جائے

تیری گلیوں میں پھروں' کون و مکاں کو دیکھوں

معجزے تیری عنایت کے دکھاؤں خود کو

اب اللہ کے فضل سے ابنِ راحت چغتائی اُس مقام پر ہیں جس کی خبر انھوں نے ہمیں یوں دی ہے۔

وہ بھی مقام آئے محبت کی راہ میں
خود سے کروں کلام تو تیری خبر ملے

انھیں مژدہ ہو کہ سرکار علیہ السلام کی توجہ اُن کے حال پر ہے اور ہمارے لیے یہ بات نوید ہے کہ ہم چغتائی صاحب سے رشتۂ مودت واخوت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی۔ بھارت

جدید لب و لہجے کا نعت گو...... سعیدؔ وارثی

آج کی نعت نئی غزل اور جدید نظم کی طرح لسانی وہیستی تجربے کرتے ہوئے نئی روشنی اور تہذیب نو کے باطن کے چہرۂ تاریک اور مذہبی' سیاسی' سماجی و معاشی اور گرد و پیش کا آئینہ دکھاتی ہوئی' محسن اعظم انسانیت اور آفاقی رسول سیدنا سرکار محمد عربی ﷺ سے انسانیت کی حالی کے لیے فریاد بھی کرتی ہے۔ اور زمانے کو ان کی عظمت و فضیلت ان کے اسوۂ حسنہ کے ترانے سنا کر اور ان کے عشق و عقیدت کے سرمدی نغمہ سے انسانی قلوب واذہان کو سرشار کرتی ہے۔ اور شاعر ان ہی حوالوں سے اپنے آقا جان جہاں و جان ایمان ﷺ سے اپنی والہانہ عقیدت و محبت کا اظہار بھی کرتا ہے اور اس طرح اپنے دارین کی سرخروئی کا سامان بھی کرتا ہے۔

آج کا انسان بالخصوص مسلمان...... دین سے بیزاری اور بے عملی کا بُری طرح شکار ہے اور اس طرح وہ ہلاکت و فلاکت اور یاس و احساس کمتری کے زندان میں محصور ہے اور نہ صرف تیرگی کے ہر قیدی بلکہ مسلمانوں کی حالی اور انسانیت کی نجات صرف اور صرف مصطفوی ﷺ تعلیم اور اسوۂ نبوی ﷺ کی پیروی میں ہے۔ نور عشق نبوی ﷺ اور قوت مصطفوئی ﷺ سے ہی اجالا برپا کیا جاسکتا ہے اور پستی کو بام رفعت پر پہنچایا جاسکتا ہے۔ آج کا حقیقی نعت گو اسی لیے مروجہ ہیئتوں اور صنفوں کے باوصف جدید لب و لہجے میں نظم آزاد و دیگر زبانوں کی ادبیات کی صنفوں اور ہیئتوں مثلاً سی حرفی' چھند' سانیٹ' ہائیکو وغیرہ میں بھی نعتیں لکھ رہا ہے۔ تاکہ تہذیب جدید کا رسیا انسان...... انسان کامل ﷺ کی عظمتوں سے آشنا ہو کر پھر انسانیت کی سند پر براجمان ہو سکے۔

جدید لب و لہجہ' نئے ڈھنگ اور نئے رنگ و آہنگ میں نغمۂ نعت سنانے والے مدحت گران مصطفیٰ ﷺ میں ایک سعادت مند اور فیروز بخت شخصیت اور مستند و معتبر نام جناب ڈاکٹر محمد سعید خاں وارثی المتخلص بہ

سعیدؔ وارثی کا بھی سعید وارثی بیک وقت غزل گو بھی ہیں۔ اور نعت نگار بھی۔ جناب سعیدؔ نے بہ حیثیت شاعر غزل اپنے شعری سفر کا آغاز کیا تھا اور بہاریہ مجموعہ "خواب خواب چہرہ" میں انہوں نے لفظ و احساس کا بڑا ہی حسین اور کامیاب فاصلہ طے کر کے اپنے لب ولہجہ کی انفرادیت بلاغت خیال اور فکر کی نزاکت کو ادب کے قارئین اور ناقدین سے تسلیم کرالیا تھا۔ لیکن اس شاعر بہار کو خوابوں کی اس وادی میں قرار نہ ملا اور اس نے جانِ بہار و رُوح قرار سرکار لبد قرار علیہ السلام کی بارگاہ میں التجاء کی ؎

اب تو لگتا نہیں جی اور کہیں بھی مولا مجھ کو اذنِ سفر منزل طیبہ دیدے

التجا قبول ہوئی اور اس نے غزل کی پامال راہوں سے ہٹ کر غزل کے الفاظ و علامات و استعارات کو تقدیسی پیراہن میں ملبوس کر کے اسے صراط مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ اور پھر نغمہ ہائے نعت ابلنے اور مچلنے لگے۔ اور اسے وہ فیروز بخت لمحہ بھی نصیب ہوا جس کی اس نے تمنا کی تھی۔

سایۂ گنبد خضرا میں لکھوں نعت سعیدؔ...... اپنے وارث ؒ کی عنایت کا کرشمہ دیکھوں

سعیدؔ وارثی کو نعت گوئی ورثہ میں ملی ہے ؎

دولت دیدۂ بیدار مرا ورثہ ہے...... وارثی مدحت سرکار میرا ورثہ ہے

اور اس لیے سعیدؔ نے اپنے پہلے مجموعۂ نعت کا نام "ورثہ" رکھا۔ ورثہ جدید نعت گوئی کا ایک مہکتا گلزار ہے۔ اس مجموعہ میں فکر نو، جہت تازہ اور پیراہن تقدس میں آراستہ حور صفت نعتیہ غزلیں بھی ہیں اور حصار نور میں محصور روشنی بکھیرتی ہوئی پابند نظمیں بھی اور محبت حبیب خدا کی شعلہ نوائی سے پُر آزاد نظمیں بھی۔ غزل ہو یا نظم ورثہ کا ہر شعر مدنی محبوب علیہ التحیۃ والثناء کے عشق وعقیدت کا فروزاں چراغ اور اظہارِ حسین ولطیف کا کھنکتا ہوا ایاغ ہے۔

سعیدؔ وارثی کو عشق رسالتمآب علیہ السلام کی دولت ونعمت کئی جہت سے ملی ہے۔ اولاً یہ نعت عظمیٰ ان کا آبائی حصہ ہے۔ سعیدؔ وارثی کے والد ماجد حضرت ستارؔ وارثی قدس سرہ العزیز ایک عاشق رسول اور ممتاز نعت گو تھے اور ان کا شمار اپنے وقت کے اساتذہ میں ہوتا تھا وہ عشق شہ کونین کو اپنی آبائی دولت تسلیم کرتے تھے :

عشق سرکار دو عالم ہے وراثت میری میرے مولا تو مجھے دولتِ آبائی دے

دوم۔ سلسلۂ وارثیہ کے "مسلک عشق" نے انہیں عشق شہ والا میں آنکھ کھولتے ہی رچا بسا دیا تھا اور سورج کی ہر نئی کرن کے ساتھ یہ رنگ مزید گہرا اور روشن ہوتا چلا جارہا ہے۔

سوم۔ والد گرامی قدر ستار وارثی علیہ الرحمتہ سے ملی ہوئی عشق و معرفت کی سرزمین۔ امام احمد رضا کے وطن بریلی کی مٹی کا لمس اور مہک اور سب سے بڑھکر خود سعید کی فطرت مومنانہ! اب ظاہر ہے ہر چہار جانب سے دل کی دھرتی پر عشق کے امنڈتے ہوئے اس سیلاب کو اظہار کے بند کے توسط سے زمزمہ ہائے نعت کی لہروں میں رواں دواں ہو کر زمانہ و حالات کی بنجر زمینوں کو کشت زار و لالہ زار بنانا ہی تھا اور جناب سعید وارثی نے یہ فریضہ حسن و خوبی انجام دیا۔

کتاب کے آغاز میں سعید نے اپنی سخنوری کی بابت بارگاہ آقا میں مولانا جامی علیہ الرحمتہ کے حوالے سے کیا حسین اعتراف کیا ہے۔

زِجامِ حُب تو مستم بہ زنجیر تو دل بستم   نمی گویم کہ من ہستم سخنداں یارسول اللہؐ (جامی)

اور سچائی یہی ہے۔ کہ جس رفیع الدرجت رسول کے ذکر پاک کو رب عظیم نے "ورفعنالك ذكرك" فرما کر بلند کر دیا ہو۔ بھلا سوائے اس رب ذوالجلال کے کوئی اور اس کے حبیب اکبر علیہ السلام کی رفعت شان کا اہتمام کر بھی کیسے سکتا ہے؟ ہاں! بارگاہ کبریا میں اظہار عجز اور بارگاہ مصطفیٰ ﷺ میں خود سپردگی ہی اس رسول کونین کی رفعت شان کے بیان کا ایک واحد ذریعہ ہے۔

سعید وارثی کو خود اس حقیقت کا اعتراف ہے:

کیسے ممکن ہے کہ نعت شہؐ والا لکھوں   اس کے معنی ہیں کوئی تازہ صحیفہ لکھوں

نعت تیری کرے رقم سر بسجود ہے قلم!   فکر کہاں ہے محترم حرف کہاں ہیں معتبر

سعید وارثی نے "میں نعت لکھوں تو کیسے لکھوں" کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھ کر اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ کہ آخر نعت لکھوں تو کیسے لکھوں۔ اس لیے کہ ممدوح ﷺ اس قدر باکمال اور بے پایاں اوصاف کا حامل ہے کہ اگر عالم کے تمام جمال و جلال و کمال و عظمت و تقدیس و فضیلت و شرف اور روشنی و خوشبو سب حروف میں تحلیل ہو جائیں۔ پھر بھی ممدوح کی نعت کے ایک مطلع کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔

نظم کے پہلے بند میں شاعر اس حیرانی کا اظہار کرتا ہے۔ کہ وہ ممدوح کو انسان کامل لکھے یا فہم بشر کا حاصل 'تقاضائے عشق کے تحت اسے حسن تمام لکھے یا عکس جنوں اس سے بڑھ کر کچھ اور لکھے یعنی رازِ وصال عیاں کر دے۔

دوسرے بند میں وہ ممدوح کی رفعت کے مقابل اپنی پستی کو دیکھتے شرمندہ شرمندہ اور شکست حوصلہ نظر آتا ہے۔ کہ آخر رفعت شان اہتمام مصطفیٰ ﷺ میں وہ کس منہ سے کس حوصلہ پر زبان کھولے اور قلم

اُٹھائے؟

اس بند کے چند اشعار دیکھیے جن میں تازہ کاری اور جدید لب ولہجہ لو دیتے نظر آتے ہیں اور اس اجالے میں شاعر کی شیفتگی اور فدا کاری کا انداز حسین بھی ملاحظہ کیجیے۔

میں ایک ذرہ حقیر ذرہ وہ آسمانوں کا رہنے والا
میں ایک قطرہ مثالِ شبنم وہ آبشاروں کا سلسلہ ہے
وجود میرا کرن کی صورت وہ آفتاب جہاں نما ہے
میں کور دیدہ، وہ نور پیکر میں شب رسیدہ وہ صبح روشن
میں ایک بندہ وہ سب کا داتا میں زرد پتہ وہ شاخ تازہ
میں ایک راہی وہ عین منزل میں صرف زحمت وہ صرف رحمت
میں شر کا عادی وہ خیر بانٹے میں ابتداء سے بھی بے خبر ہوں
وہ انتہاؤں کی انتہاء ہے میں نعت لکھوں تو کیسے لکھوں

تیسرے بند میں شاعر اپنی بے عملی، عصیاں شعاری وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور اس طرح شاعر خود پر طنز کرتے ہوئے امت مسلمہ پر طنز کرتا ہے۔ اور ہر ایک کو اس کی بے عملی کا آئینہ دکھاتا ہے۔

سراپا عصیاں خطا کا پیکر ہوس کا بندہ غلام دل کا
خیالِ روزِ جزا سے عاجز حدودِ شرعِ مبیں سے نکلا
میں جھوٹ بولوں تو ڈھیٹ بن کر قتیل نام و نمود و شہرت
صنم تراشوں صنم کو پوجوں کھنکتے سکے متاعِ جاں ہیں
فقیہہ بن کر حرم کو بیچوں نہ فقر و فاقہ نہ کیف و مستی
نہ عزمِ خالدؓ نہ جذبِ بوذرؓ اسیر تاج شہی ہوا ہوں
گدائے کوئے طرب بنا ہوں حصارِ عصیاں کو کیسے توڑوں
میں نعت لکھوں تو کیسے لکھوں

چوتھے بند میں شاعر لاکھ بے عملی و گنہ گاری کے باوجود آقا سے وفاداری کا اظہار کرتا ہے اور اس کفیل و وکیل، رؤف و رحیم سے لو لگائے ہوئے ہے۔ وہی تو وہ رحمتوں اور عظمتوں والا داتا ہے۔ جس سے ہر شے نے وجود پایا ہے اور چاند سورج ستاروں کو روشنی عطا ہوئی ہے آخر میں بارگاہ سید کونین علیہ السلام میں

خود سپردگی کے ساتھ شاعر اس طرح عرض کرتا ہے:

میں اس کا عاشق میں اس کا بندہ ، میں اس کے لطف و کرم سے زندہ
اسی کی تسبیح پڑھ رہا ہوں ، اسی کے ٹکڑوں پہ پل رہا ہوں
تمام فکروں کا حاصل ، کلام یہ لاکلام کہہ دوں
نبیؐ کا خود کو غلام کہہ دوں ، میں نعت لکھوں تو کیسے لکھوں

سعید وارثی کی دیگر پابند اور آزاد نظمیں بھی لب ولہجہ اور فکر و خیال کی اسی تازہ کاری اور انفرادیت کی حاصل ہیں۔ نظم "سچائی" میں سعید منظر نگاری کے جلوؤں کے ساتھ عظمتِ جان نور ﷺ کا بڑا ہی خوب صورت اور نرالا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے گاتے دریاؤں، اڑتے بادلوں، بلبل، قمری، پپیہے، گلشن و صحرا، ذرہ و کہکشاں، غنچہ و گل و نکہت، چاند، سورج، ستاروں، جگنو وغیرہ ہر ایک سے...... صبح ازل سے شام ابد تک سب سے بڑی سچائی کا اس طرح اعتراف کرایا ہے:

سب نے سچی بات کہی
سب نے یہ تسلیم کیا
صبح ازل سے
شام ابد تک
اس کی ہی رعنائی ہے
نام نبی کا صلِ علیٰ
یہ سب سے بڑی سچائی ہے

ایک نظم "محبت" میں سعید وارثی نور مجسم سرکارِ دو عالم ﷺ کے اوصاف و کمالات دیکھ دیکھ کر حیران ہیں۔ کہ اس سراپا وصف و مدحت۔ "محمد ﷺ" کو کیا لکھوں؟ پھول کہہ نہیں سکتے کہ اس کا رنگ اڑ جاتا ہے۔ بہار کو بہر حال خزاں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح اسے کہکشاں، چاند، سورج بھی نہیں مان سکتے کہ دوام کسی کو نہیں ہے۔ اس طرح اسے آدمی و انسان، یہاں تک کہ فرشتہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ سب میں کچھ نہ کچھ خامی ضرور ہے۔ آخر میں اعتراف عجز کرتے ہوئے پکار اٹھے ہیں:

وہ کون ہے، اس کی انتہا کیا؟ ، خدا ہی سمجھے، خدا ہی جانے

دلِ شکستہ مگر اُسی کو دوا بھی سمجھے، دُعا بھی جانے
مراد جس کی ہے جو بھی اپنی حضور ربِ جلیل مانگے
سعیدؔ لیکن میں اسؐ کو چاہوں جسے دُعائے خلیلؑ مانگے

ہر مومن درِ سرکار علیہ السلام کی حاضری کی تمنا رکھتا ہے...... سعیدؔ تو اس در اقدس کی حاضری کو زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔

لیکن وہ اس بارگاہ مقدس کی عظمت و بزرگی کو مد نظر رکھتے ہوئے سوچتے ہیں۔ کہ اس قدر جرم و خطا اور غلاظت و ناپاکی کے باوجود اس در اقدس پہ حاضر ہوں تو کیسے۔ چند اشعار دیکھئے شاعر بناوٹ اور جھوٹی پارسائی کے ڈھونگ سے دُور سچائی کے ساتھ اپنے جذبے کا اظہار کرتا ہے اور اس اظہار میں بھولپن اور لہجے کی جدیدیت کا کیسا بانکپن لہریں لے رہا ہے ۔

کہاں یہ ارض مقدس کہاں میں زار و زبول،
تیری عطا کے کرشمے ترے کرم کا فسوں
حضور آپ پہ روشن ہے زندگی میری
گناہ گار ہوں جرم و خطا کا پیکر ہوں
نگاہ بارِ ندامت سے اُٹھ نہیں سکتی جمالِ گنبد خضریٰ میں کس طرح دیکھوں
مجھے پتہ ہے مرے لب ہیں کس قدر ناپاک سنہری جالی کے بوسے کو میں ترستا ہوں
یہ ہاتھ کتنے کثیف و غلیظ ہیں میرے میں سنگِ روضۂ اقدس چھوؤں تو کیسے چھوؤں

حضورؐ عشق کو میرے بھی معتبر کر دیں! یہ انتہائے محبت میں آپؐ کو چاہوں
کسی کے سامنے دستِ طلب دراز نہ ہو کبھی جو مانگنا چاہوں تو آپؐ سے مانگوں
حضورؐ، وہم فراق و وصال مٹ جائے
یہ کشمکش نہ رہے، میں رہوں، رہوں نہ رہوں

(غزل درِ سرکار پر)

آزاد نظم "در حضورؐ پہ حاضری کا ایک تاثر" میں بھی غزل "درِ سرکار پر" ہی کا مضمون ہے البتہ فرق ہے تکنیک اور فارم میں...... اور بیان کے انداز میں...... نظم کی ابتداء میں شاعر روضۂ انور کی حاضری سے قبل زمانہ کی روئداد سناتا ہے۔ کہ ہر سال کی طرح وہ پچھلے سال بھی اسی طرح اُداس و ملول تھا۔ اس کے ساتھی

ولولہ خیزی کے ساتھ دیار حبیبؐ پر حاضری کے لئے جا رہے تھے۔ اس کی بیتابیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو تڑپ تڑپ کر رقیب کی صورت میں بھی دیکھتا تھا اور عقیدت کے ساتھ بھی دیکھتا تھا اور ان کی فیروز بختی پر رشک کرتا ہوا انہیں مبارک باد بھی پیش کرتا تھا اور پھر ان سے درخواست بھی کرتا تھا کہ ۔

حدودِ کوچہٗ جاناں میں جب قدم رکھنا

قریب روضہٗ اقدس کے

جب پہنچ جانا

تو پھر خلوص سے

عجز و نیاز سے کہنا

"حضورؐ! بندہٗ عاجز سعید آورہ"

یہ عرض کرتا تھا

مرے حضورؐ مجھے بھی کبھی بُلا لیجئے

سعید وارثی نے اس نظم میں اس مقام تک عصر حاضر کے ایک مسلم نوجوان مگر مخلص اور بے بناوٹ مسلمان کے احساس و جذبات کی بہت ہی خوبصورت عکاسی کی ہے اور شاعری میں یہی حقیقی منظر کشی ہے اور فنکاری کا کمال! شاعر اس نظم میں ایک صالح فطرت کے حامل مسلم نوجوان اور دردمند شاعر کے ساتھ ساتھ ایک ماہر نفسیات بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ انداز سعید کی تخلیقی حرکیت اور شعری عظمت پر دال ہے۔

سعید کے خیال کی بلاغت کا یہ نمونہ دیکھئے:......

مرے حضورؐ مجھے بھی کبھی بُلا لیجئے   "حقیر ذرّہ ہوں سورج مجھے بنا دیجئے"

اللہ اکبر! فضیلت و بزرگی میں عرش اعظم سے بھی بالا و والا سرکار اعظم ﷺ کے روضہٗ اطہر کی حاضری واقعی ایسی ہے کہ وہاں پہنچنا ذرہ کا سورج پر پہنچانے سے بھی زیادہ مرتبہ کا حامل ہو جاتا ہے۔

بالآخر شاعر دیار حبیبؐ میں پہنچتا ہے۔ سرکار اعظم کا روضہٗ مقدس نظر کے سامنے آتا ہے۔ تو شاعر کی اُداسیاں پھر عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ وہ سنگ در کو چوم پاتا ہے نہ ہی سنہری جالیوں کو چھونے کا حوصلہ کر پاتا ہے۔ اس لئے کہ شاعر کو اپنے نجس لب اور کثیف ہاتھوں کا خیال ہے اور ایسے عالم میں وہ تو اپنی روسیاہی کے سبب جامد و ساکت حیران و پریشان کھڑا ہے۔ لیکن اللہ رے غرور محبت اور محبّ کی اپنے محبین اور غلاموں پر کرم فرمائی اور رحمت لٹانے کا عالم کہ وہ اپنے سعید کو بھی شرم سار اور غمگین دیکھنا گوارہ نہیں کرتا اور مژدہٗ

مسرت سناتا ہے۔ "کہ غلام یہ تو بارگاہ رحمۃ للعالمین ہے۔ جو اپنے غلاموں کی اس دُنیا سے لے کر حشر تک پردہ داری فرمائے گا۔ ہمیں تو تیری شرمساری اور تیرا عجز و نیاز بھا گیا۔ تو نے ہمارے لعل اور ولی وارث کا حوالہ دیا ہے' تو آ کہ۔

متاعِ کیف و جنوں تیرے نام کرتے ہیں
بلند عشق میں تیرا مقام کرتے ہیں
قبول تیرا درود و سلام کرتے ہیں
فراق و وصل کے جھگڑوں سے دور رہنا سعیدؔ
پڑے جو وقت کوئی ہم کو یاد کرنا سعیدؔ

سعیدؔ وارثی کی یہ نظم بلاشبہ ایک شاہکار جدید نظم ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ میں کئی سلام بھی شامل ہیں اور دیگر نظمیں بھی اور ایک تضمین بھی۔

ہر جگہ سعیدؔ کا اپنا جدید انداز اور انفرادی ڈھنگ اور رنگ نمایاں ہے۔

حمد یہ نظم "میرا سائیں" میں سعیدؔ نے منظر نگاری کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ "منجو جیون صحرا سائیں" کا پیوند اور تکرار نظم کو ایک دلربا انداز عطا کرتا ہے۔

سعیدؔ تو فطرتاً شاعرِ محبت ہے اور شاعرِ محبت کا حقیقی شعری رنگ غزل ہی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

"ورثہ" میں کئی حسین و نازک نعتیہ غزلیں بھی شامل ہیں۔ "ورثہ" عنوان سے ایک نعتیہ غزل کا یہ مطلع ہی کس قدر زوردار ہے۔

دولت دیدۂ بیدار مرا ورثہ ہے وارثی مدحتِ سرکارؐ مرا ورثہ ہے

اور مقطع بھی مطلع سے کم نہیں۔ سعیدؔ مقطع میں اپنے والد کی دعاؤں اور جدِ امجد کی عنایات اور ان کے عشقِ محمدی ﷺ پر ناز کرتے ہوئے اعلان کرتے ہیں۔

میری دولت ہے دُعائے دلِ ستارؔ سعید التفاتِ شہِ غفارؔ مرا ورثہ ہے

چند غزلوں سے متفرق اشعار ملاحظہ کیجئے جن میں تازہ کاری کی تجلیاں بھری ہوئی ہیں۔

یہ فکرِ نعت کہاں لا کے مجھ کو چھوڑ گئی فضا میں موسمِ طیبہ ہوا میں بوئے رسولؐ

عکسِ جمال آئینہ گر آئینے میں ہے یہ آئینہ بنا ہے بڑی دیکھ بھال سے

یہ شعر من رآنی فقد راء الحق کی حسین شرح ہے۔

لب پہ کبھی جو ذکرِ حضورؐ آ گیا سعیدؔ
نکلا ہوں چاندنی کے اندھیروں کے جال سے

ہوں طالب دُنیا کہ نظر میں ہے مدینہ
حیران فرشتے ہیں کہ کیا مانگ رہا ہوں

مہکی ہوئی زلفوں کا جسے قرب ملا ہے
جھونکا وہی خوشبو کا صبا مانگ رہا ہوں

ذکر ہر اک کی زبان پر ہے ازل سے اس کا
بات ہوتی ہی نہیں پھر بھی پرانی اس کی

جیسے قرآن کی آیات گرامی کا نزول
کتنی معصوم و مقدس ہے جوانی اس کی

اس شعر میں تشبیہ کی نادرہ کاری لائق دید ہے:۔۔۔۔

ایک خوشبو سی بکھر جاتی ہے ہر سمت سعیدؔ
بات کرتی ہے اگر رات کی رانی اس کی

نظر نظر میں جلے ہیں چراغ عشق حضورؐ
یہ روشنی ہے بہت عمر مختصر کے لئے

تیری ثنا کا حوصلہ اور یہ ذہن نارسا
تو ہے کمال لفظ ’کن‘ میں ہوں سراپا بے ہنر

میرا مذہب میری جنت میرا ایمان ہے تو
اک نظر میری طرف سید ذی شانِ زمن

میرے تاریک گھروندے میں اجالا کر دے
اے مرے نور ازل نورلبد نورِ زمن

سعیدؔ ذکر رسول کریمؐ کرتے رہو
یہ ظلمتوں میں سحر کا نقیب ہے پیارے

یوں مرا شہر بصارت رہے آباد سدا
بند ہو جائیں اگر آپؐ کو پا کر آنکھیں

نمودِ چہرۂ گل سے وجودِ صحرا تک
قدم قدم پہ نمایاں تمہارا جلوہ ہے

مندرجہ بالا اشعار جدید لب و لہجہ کے نور کے ساتھ ساتھ معنی آفرینی کی نکہت بھی بکھیر رہے

ہیں۔ اور جمالیات وامیجری کے جلوے بھی دکھارہے ہیں۔

"ورثہ" میں کئی روایتی نعتیہ غزلیں بھی ہیں...... مست مست 'مدھر اور نازک...... عشق وعقیدت سے شرابور۔ صوتی آہنگ اور اظہار جدید کے رنگ لٹاتی ہوئی...... ان غزلیات سے چند اشعار دیکھئے اور سعیدؔ کے طرزِ ادا کی رعنائی اور رنگینی کی داد دیجئے۔

آگئے مصطفیٰؐ مرحبا مرحبا چھاگئی ہر طرف رحمتوں کی گھٹا

اُن کے نقشِ قدم کا جو بوسہ لیا چاند 'سُورج' ستاروں نے پائی ضیاء

دیپ جلنے لگے پھول کھلنے لگے آج مئے خوار پی کر سنبھلنے لگے

بھی بھی ہوا مہکی مہکی فضا جھوم اُٹھا مے کدہ آئے خیر الوریٰؐ

سبز گنبد کے جلوے ہوں پیش نظر اس طرح دردِ دل کی دوا چاہیے

حاصلِ بندگی ہے یہی اِک دُعا 'ہم کو خاکِ درِ مصطفیٰؐ چاہیے

کوئی پاگل کہے کوئی وحشی کہے اور وحشی تیریؐ یاد میں گم رہے

تیرےؐ نقشِ کفِ پا کو سجدہ کرے ہر قدم یہ کرم یہ عطا چاہیے

کل جواں رات تھی اور حسیں چاندنی ہم نے ایسے میں دل کو جلایا بہت

جب ستارے بجے داغ لو دے اٹھے کوئے طیبہ ہمیں یاد آیا بہت

بہ احتیاطِ محبت بہ چشم تر کہنا صبا حضورؐ سے میرا پیام اگر کہنا

یہ مجال میری کہاں کہ میں ترے قرب کی کروں آرزو یہ کرم بہت ہے خدا کہ تو مجھے نقش پا کا وصال دے

"صاحب 'صاحب جی 'یارسول اللہ اور حضور کا ذکر" ردیفوں سے بھی اچھی نعتیہ غزلیں کہی ہیں اور اپنی شعری استعداد اور تخلیقی حرکیت کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

سعیدؔ وارثی نے نادرہ کار تراکیب کے توسط سے اپنی استعارہ سازی اور بلاغت فکر کا بھی خوب صورت جلوہ دکھایا ہے اور حضور جانِ نور ﷺ کے لئے پیارے پیارے محبت بھرے 'حسین و پاکیزہ القاب واسماء بھی

وضع کیے ہیں۔ اور اس طرح ان کی صفات کو ظاہر کرتے ہوئے ان سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار بھی کیا ہے۔

مہبطِ روح الامین' روحِ قرآن مبین' وجہ بنائے این وآں' صبح روشن' مرہم زخم عاشقاں' کمال لفظ کن' حامل وصف متیں' مالک خُلقِ احسن' اصلِ سرورِ سرمدی' جان عصائے موسویؑ' صنعت دست ایزدی' قافلہ سالار محبت' کعبۂ قدسیاں' وارث کون ومکان' سحر گروہِ قدسیاں' شمع بزم عاشقاں' روشنیٔ قلب وجاں' رونق شام وسحر' مصور خلق حسن' سطوتِ افلاک' مجمع خوبی وغیرہ۔

جناب سعیدؔ کے کلام میں ہندی اور دیسی عناصر کی خوبصورت جھلکیاں بھی موجود ہیں۔ جیسے پریم' بھجن' جیون' کھٹن' کوئل' پپیہا...... سسی پنوں...... ہیر رانجھا...... وغیرہ ان کے کلام میں جلوہ ہائے بیان وبدیع...... تلمیح وحسن تعلیل وغیرہ بھی بڑی سلیقہ مندی وستھرائی کے ساتھ براجمان ہیں۔

الغرض...... سعیدؔ وارثی ایک کامیاب جدید نعت گو ہیں جن کے لفظ لفظ' بیان کے انداز وادا اور اظہار وصدا میں عشق رسول علیہ السلام کی ایسی عطر بیزی ہے کہ ان کے اشعار سن کر یا پڑھ کر ذہن کے دریچے بہار لدی جانفزا ہواؤں کے لئے وا ہو جاتے ہیں اور عقیدۂ ایمان کا گلزار مہک مہک اُٹھتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید

بشیر رحمانی کا کیفِ حضوری

رحمان سے نسبت تلمذ قائم کرنے اور غیب سے نعت کی تحریک حاصل کرنے والے شعراء کا ذکر آئے تو میرے ذہن میں دو نام سب سے پہلے ابھرتے ہیں

اول: اعجاز رحمانی دوم: صبیح رحمانی

اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ان دونوں کی نعتوں کے اشعار ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ اکثر اوقات اعجاز اور صبیح میں امتیاز قائم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دن یوں ہوا کہ اردو کے قادرالکلام شاعر ذوقی مظفر نگری جنہیں میں اپنی کم سنی سے پڑھ رہا ہوں، تشریف لائے تو ان کے ساتھ بشیر رحمانی صاحب بھی تھے۔ وہ ذوقی صاحب کے شاگرد ہیں اور اتنے سعادت مند ہیں کہ اپنے استادِ مکرم کے سامنے اونچی کرسی پر نہیں بیٹھتے، گردن نیچے ڈالے رکھتے ہیں اور آنکھیں اوپر نہیں اٹھاتے۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ میں انہیں اعجاز رحمانی سمجھتا رہا۔ دو ایک مرتبہ میں نے انہیں اسی نام سے مخاطب کیا تو ذوقی صاحب نے فوراً وضاحت کی کہ "یہ بشیر رحمانی ہیں" میں نے اپنی ضعیفی کے باعث حافظے کی کمزوری کا سہارا لیا اور بشیر رحمانی سے "نعت" عنایت کرنے کی درخواست کی۔ ان کی سعادت دیکھئے کہ انہوں نے اپنی نعت سنانے کے بجائے ذوقی صاحب سے گزارش کی کہ "پہلے وہ نعت عطا فرمائیں" اس وقت میرے پاس ریحان منیر زبیری بیٹھے ہوئے تھے جو ان دنوں رسالہ "نعت رسول" مرتب کر رہے تھے۔ انہوں نے نعت گوئی اور نعت خوانی کے حوالے سے ایک سوالنامہ مرتب کر رکھا تھا اور ہر نعت نگار سے ملاقات ہوتے ہی اپنے رسالے کے لئے جوابات حاصل کر لیتے تھے۔ انہوں نے بشیر رحمانی صاحب کو بھی سوالنامہ دیا لیکن پھر ہم دونوں نے دیکھا کہ انہوں نے یہ سوالنامہ ذوقی صاحب کو پیش کر دیا اور گزارش کی "حضرت! پہلے آپ یہ تحریری انٹرویو دیجئے۔"

یہ چند باتیں میں نے اس لئے عرض کی ہیں کہ نعت کے لئے جس عقیدت، محبت اور خود سپردگی کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھے بشیر رحمانی کے ہاں اس تعلق سے نظر آئی جو انہیں اپنے استادِ مکرم سے تھا۔ میں نے سوچا کہ جو شخص دنیا میں خلوص اور محبت کو اس ۔۔۔۔۔۔، صداقت اور استقامت سے استعمال کر سکتا ہے وہ نبی اکرم ﷺ کے لئے کتنی گہری عقیدت رکھتا ہوگا۔ میں نے اسی خیال کو سامنے رکھ کر ان کا مجموعہ کلام "بہارتیں" پڑھا تو احساس ہوا کہ بشیر رحمانی کیفِ حضوری سے سرشار ہیں۔ ان کا ہر بن مو

نہ صرف عشق محمدی ﷺ سے سرشار ہے بلکہ وہ اپنی نعت کے سارے قرینے نبی مکرم ﷺ سے عبارت کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی اپنی پہچان اور اپنا تشخص ہے اور ان کا رنگ سخن اعجاز رحمانی اور صبیح رحمانی سے بھی مختلف ہے۔ چنانچہ اب میں ان کو دیگر رحمانیوں سے الگ شناخت کر سکتا ہوں۔ بشیر رحمانی کی نعت کی ایک خوبی ان کا عجز و نیاز و انکسار ہے۔ وہ دنیا کے مصنوعی خداؤں کے سامنے اپنی خودی اور خودداری کو بلند رکھتے ہیں لیکن جب نبی اکرم ﷺ کا نام گرامی آئے تو ان کی توصیف و مدح میں زمزمہ خواں ہو جاتے ہیں اور اعتراف کر کے کہتے ہیں۔

رنگ بہار کیف گلستاں مرے حضور ﷺ — افسردہ ٹہنیوں کے ہیں ارماں مرے حضور ﷺ
انساں کے زخم زخم کو مرہم نشاط کا — انسانیت کے درد کا درماں مرے حضور ﷺ
مہکا رہی ہیں روح کو یادیں حضور ﷺ کی — خوشبوئے زندگی کا ہیں ساماں مرے حضور ﷺ
پہنائیوں کو شام کی لطف نگاہ سے — پہنا گئے ہیں، صبح درخشاں مرے حضور ﷺ

مجھے بشیر رحمانی کی نعت میں تبلیغی عنصر زیادہ نمایاں نظر آیا لیکن ان کی تبلیغ روایتی قسم کی نہیں بلکہ اس کا طریق شاعری کا بالواسطہ طریق ہے۔ انہوں نے راہ حق سے بھٹک جانے والوں کو اسوۂ رسول مقبول ﷺ قبول کرنے اور پھر دنیا کے علاوہ آخرت کے انعامات حاصل کر لینے کی نوید دی ہے لیکن ساری بات بالواسطہ استعارے میں پیش کی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جس نے بھی ان کے حکم کا پہنا ہے پیرہن — فرمائیں گے اسی کی حمایت رسول پاک
جس نے کیا سنت قرآن کو رفیق — بخشیں گے اس کو اپنی رفاقت رسول پاک
جو ہو گیا ہے حرمت اسلام پر فدا — دے دیں گے اسی کو پرچم عظمت رسول پاک

بشیر رحمانی نے اکرامات و انعامات نبوی ﷺ کا ذکر کیا تو برملا کہا کہ

نطق رسول پاک کا اعجاز مرحبا — پتھر کے ذہن شیشہ ادراک ہو گئے
لطف و عطا کا آپ کی فیضان دیکھئے — درویش ان کے سرورِ لولاک ہو گئے

بشیر رحمانی کو احساس ہے کہ وہ تیرگی اور تاریکی کے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر طرف معصیت اور بے راہ روی پھیلی ہوئی ہے۔ ظلم و تشدد نے یلغار کر رکھی ہے۔ انسان آلام کا شکار ہے اور اس کی روح زخمی ہے۔ تثلیث کے فرزندوں نے دینی قدروں کو مٹانے اور الحاد کے تصورات کو پھیلانے کے لئے ترغیب اور تحریص کے رنگا رنگ اور نظر افروز جال بچھا رکھے ہیں۔ امت مسلمہ پر عجیب وقت آپڑا ہے لیکن بشیر رحمانی کو یقین ہے کہ یہ دور عارضی ہے اور اس شمع کا اجالا دہر کے اندھیروں پر ایک روز غالب آجائے گا جو ۔۔۔۔۔۔ سو برس قبل غارِ حرا میں روشن ہوئی تھی۔ بشیر رحمانی کی نعت کا ایک یہ زاویہ بھی نمایاں ہے کہ وہ اس معصیت کے دور میں اپنی عرضی حضور نبی آخر ﷺ کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

منتشر ہے امت خیرالبشر سحر کی زد میں ہے وحدت کی سحر
ہر طرف سے ہیں ستم کی یورشیں یا رسول اللہ کرم کی اک نظر
ہو رہی ہے زندگی زیر و زبر لیجئے اے رحمت عالم خبر

مژدہ خیزبات یہ ہے کہ جب بشیر رحمانی اپنے خیال کی سلک گوہر کا ایک سرا زمین سے عالم الوریٰ کی طرف بڑھاتے ہیں تو عالم بالا سے ان کی دل پر شبنم اترنے لگتی ہے اور پھر انہیں طمانیت قلب حاصل ہو جاتی ہے۔وہ بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

مل گیا مژدہ شفاعت کا بشیر آ گئے نخل عقیدت پر ثمر

بشیر رحمانی کی نعتیں ان کے نخل عقیدت کے ثمرات شیریں ہیں، نعت کے ان خیابانوں سے جو بھی گزرے گا اس کا سینہ منور اور کاسہ جسم معطر ہو جائے گا۔ میں نے یہ کیفیت خود بھی محسوس کی ہے اور اب آپ کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔
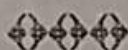
❖❖❖

محمد اسلم فرخی (کراچی)

نذرِ اشرف کے توسط سے پہنچ جائے سلام　به حضورِ ہمہ جود و کرم آقائے انامؐ

اے شہنشاہِ امم مصدرِ خلق عالم　آپؐ کے لطف وکرم سے ہے زمانے کا نظام

باعث رابطۂ خالق و مخلوق ہیں آپؐ　آپؐ ہیں اہلِ جہاں کے لیے حق کا انعام

میرے سرکارؐ! یہ غم دیدہ و مہجور و حزیں　ستم دہر کا مارا ہوا ناچیز غلام

آپؐ کے ہجر میں دن رات تڑپتا ہے یہاں　زندگی کیا ہے فقط جینے کا مبہم الزام

گردش وقت سے ہارا ہوا اپنوں کا قتیل　مضطر و مضطرب و کشتۂ رنج و الام

ہاتھ پھیلائے ہوئے منتظر لطف و کرم　حاضری کے لیے بیتاب ہے شاہا یہ غلام

اک نظر اس پہ بھی ازراہِ کرم ہو جائے　یہ غریب الغربا جس کا حوالہ ہیں نظامؒ

گرمیِ حضرت یونس سے ملے کچھ حصہ　جذبِ ہاشم سے میسر ہو اسے کیفِ دوام

روح سرشار رہے قلب بھی بیدار رہے　ہر نفس وردِ زباں ہو ترا پاکیزہ نام

اسلم خاک نشیں خاک در اقدس ہو
اس گنہ گارِ ازل کا ہو سعادت انجام

(شیخ نذر اشرف کی مدینہ منورہ روانگی کے موقع پر لکھی گئی)

عنایت علی خاں (حیدر آباد)

وہ جن کے نور سے رونق جہاں کو ملتی ہے
وہ جن کے ذکر سے لذت زباں کو ملتی ہے

وہ سنگِ میل کہ صحرائے زیست میں جس سے
دلیلِ راہ ہر اک کارواں کو ملتی ہے

وہ جن کا لطف زمان و مکاں سے ہے آزاد
وہ فصلِ گُل کہ ہر اک گلستان کو ملتی ہے

وہ جن کی فکرِ حقیقت رسا کے صدقے میں
یقیں کی دولتِ محکم گماں کو ملتی ہے

وہ جن کے نقشِ کفِ پا کے چوم لینے پر
بلندیوں کی سند آسماں کو ملتی ہے

وہ جن کی یاد عنایتؔ ہے ایسی دل افروز
قرار روح کو تسکین جاں کو ملتی ہے

پیرزادہ قاسم (کراچی)

شعورِ حق کی ہم کو روشنی دی
انھیؐ نے زندگی کو زندگی دی

ملایا ٹوٹتے رشتوں کو حق سے
پھر ان کو دائمی وابستگی دی

رکھا خود بھی سخن میں نرم لہجہ
ہمیں بھی حرف کی شائستگی دی

ادا ہو کس طرح حق بندگی کا
بشر کو اک مثالِ بندگی دی

گدازِ عشق بھی بخشا ہے دل کو
زباں کو نعت کی توفیق بھی دی

وسیم بریلوی (بھارت)

فلک کو میزبانی کی اجازت جب ملی ہوگی
تو بےچاری زمیں کی رات آنکھوں میں کٹی ہوگی

گلوں کی تمکنت کو کس نظر سے دیکھتی ہوگی
جو خوش بُو آپؐ کو چھُو کر کسی قابل ہوئی ہوگی

عرب کے چاند کی آمد سے پہلے کس نے سوچا تھا
کہ تپتی ریت کی قسمت میں ایسی چاندنی ہوگی

پہنچنا چاند پر تو اک بہانہ تھا مرے آقاؐ
یہ دُنیا آپ کا نقشِ کفِ پا ڈھونڈتی ہوگی

وسیمؔ اُس در پہ دولت کے سہارے کون پہنچا ہے
جسے آقاؐ بلائیں گے اُسی کی حاضری ہوگی

اظہر عنایتی (بھارت)

ایسا نہ ہو کہ ہونٹوں پہ نامِ نبیؐ نہ ہو
جو سانس لے رہے ہو کہیں آخری نہ ہو

جینے نہ دیں یہ دھوپ کی ظالم تمازتیں
انؐ کے کرم کی سر پہ جو چادر تنی نہ ہو

اس نام کو لبوں پہ فروزاں تو کیجیے
ممکن نہیں چراغ جلے روشنی نہ ہو

دورِ محمدیؐ کو بنالے اگر مثال
جس کرب میں ہے آج ہماری صدی نہ ہو

اس بزمِ کائنات میں وہ روشنی ہیں آپؐ
جس روشنی کے بعد کوئی روشنی نہ ہو

وہ زندگی خدا کی قسم زندگی نہیں
جس زندگی میں عکسِ حیاتِ نبیؐ نہ ہو

بس اک کرم یہ اور کہ میدانِ حشر میں
آقاؐ گناہ گار کو شرمندگی نہ ہو

اظہؔر جو نعت کہیے تو رکھیے گا یہ خیال
سیرت ہو، جذبِ عشق ہو، کاریگری نہ ہو

ایاز صدیقی (ملتان)

خوفِ خزاں نہ خدشۂ برق و شرر ہے آج
گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج

شاخیں لدی ہوئی ہیں گل و برگ و بار سے
نشو و نمائے باغ بہشتِ نظر ہے آج

بے رنگ منظروں کو ملا رنگِ خوش نظر
بے آب آئنوں کی جِلا اوج پر ہے آج

پھولوں سے جھانکتی ہیں بہاریں بہشت کی
ذرّوں میں ضوفشانیِ شمس و قمر ہے آج

ظلمت شبِ سیاہ کی کافور ہوگئی
تعبیر کے حصار میں خوابِ سحر ہے آج

شبنم میں ڈھل گئی ہے تپش انتظار کی
جس آنکھ میں جو اشک ہے رشکِ گہر ہے آج

الفاظ کو زبان ملی، بولنے لگے
رُوئے سخن پہ سرخیٔ عرضِ ہنر ہے آج

پھرتا ہے سر چھپائے ہوئے شر اِدھر اُدھر
دنیا میں خیر مقدمِ خیر البشرؐ ہے آج

فرشِ زمیں کو شاہدِ عرشِ بریں ملا
یومِ ولادتِ شہِ گردوں سفر ہے آج

لات و مناتِ وقت زمیں بوس ہوگئے
نورِ خدا بہ شکلِ بشر جلوہ گر ہے آج

اترا بساطِ ہست پہ شائستۂ الست
حدِ ادب میں عالمِ شوریدہ سر ہے آج

آغوشِ آمنہ سے ہوا مہرِ حق طلوع
ہر لب پہ مدحِ صاحبِ شق القمر ہے آج

آپؐ آگئے تو آدمی انسان بن گیا
جو ننگِ اعتبار تھا کل، معتبر ہے آج

وردِ زباں ہے نعتِ گلِ ہاشمی ایازؔ
دنیائے رنگ و بُو مرے زیرِ اثر ہے آج

☆

احمد صغیر صدیقی (کراچی)

نام پھر تیرا لکھوں

دل میں جنت کے دریچے کھولوں
فرش سے عرش کی جانب ابھروں
فکر کی ساری حدوں سے گزروں
ذکر پھر تیرا کروں

رنگ اور نور کی صورت سوچوں
کہکشاؤں کو قلم میں بھر دوں
روشنائی میں ستارے گھولوں
نام پھر تیرا لکھوں

☆

قمر زیدی (کراچی)

قطعات

بیاضِ دل فرازِ طُور ہو تو نعت ہوتی ہے
اگر شاعر کا باطن نُور ہو تو نعت ہوتی ہے
یہاں پرواز کے سارے وسیلے پر شکستہ ہیں
رسول اللہ کو منظور ہو تو نعت ہوتی ہے

تخیل جب عقیدت کی حدِ آخر تک آجائے
تو پھر پیشِ نظر لفظوں کی آرائش نہیں ہوتی
اسی اک لفظ میں زیدیؔ مکمل نعت پنہاں ہے
"محمد" کہہ کے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں ہوتی

خلوصِ قلب کا انعام بن کے اتری ہے
مری نجات کا پیغام بن کے اتری ہے
مری بساط کہاں تھی کہ نعت کہہ سکتا
یہ نعت قلب پہ الہام بن کے اتری ہے

عرش ہاشمی (اسلام آباد)

جس پر نگاہِ لطف شہ بحر و بر کریں
تکریم اس گدا کی نہ کیوں تاجور کریں

"بیگانہ سنتوں سے جو ہو، وہ مرا نہیں"
کیوں اس حدیث پاک سے صرفِ نظر کریں

دشوار کب ہے اسوۂ سرکار پر عمل
پر کیا کہیں کہ خود ہی نہ ہمت اگر کریں

اپنا شعار طاعتِ سرور میں صبر ہو
کوئی ستم بھی ڈھائے تو ہم درگزر کریں

ہم مجرموں کو آپ کی رحمت کی آس ہے
"آقا حضور اپنے کرم پر نظر کریں"

اپنے عمل کی کچھ بھی نہ وقعت نظر میں ہو
ہم لوگ اتباعِ نبی جس قدر کریں

کس طرح زندہ ہوں مرے آقا کی سنتیں
اس دھن میں اپنی شام اسی میں سحر کریں

خاکِ درِ رسول کے بوسے جو ہوں نصیب
محسوس خود کو عرشؔ نہ کیوں عرش پر کریں

☆

منصور ملتانی (کراچی)

ان کا ہے ذکر جن پہ ہوئی دلکشی تمام
پھر کیوں نہ ہو گی رخ پہ بھلا روشنی تمام
دنیا کے چاک پر انھیںؐ تخلیق جب کیا
کر دی ہے کوزہ گر نے بھی کوزہ گری تمام
غارِ حرا سے کوہِ صفا تک گواہ ہیں
ذہنِ رسا کو بخشی گئی آگہی تمام
سجدہ پھر انؐ کا سجدہ کہ محراب کہہ اٹھی
انؐ کی جبیں پہ کر دی گئی بندگی تمام
ذہن و دل و ضمیر پہ انسان کے جو تھی
وہ تیرگی انھیؐ کی نظر سے ہوئی تمام
اوّل وہی کہ نورِ ازل انؐ کی ذات ہے
آخر وہی کہ انؐ پہ ہے پیغمبری تمام
پل بھر بھی دل نے چین نہ لینے دیا کہیں
چوکھٹ پہ انؐ کی آکے ہوئی بے کلی تمام
آؤ اٹھاؤ ہاتھ کرو مل کے یہ دعا
ہو کاش ان کے در پہ مری زندگی تمام
منصورؔ جس میں بیش ہو اخلاص کی مہک
ہوتی ہے بس قبول وہی حاضری تمام

تنویر پھول (کراچی)

بنایا ہے رب نے انھیںؐ سب کا رہبر
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ!
محمدؐ کے صدقے میں دنیا بنی ہے!
وہؐ مطلوبِ حق ہیں وہؐ محبوبِ داورؐ
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ!
انھیؐ کا ہے محشر میں ہم کو سہارا
شفاعت کریں گے وہی روزِ محشر!
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ
خمستانِ عالم کو ٹھکرا دیا ہے!!
پلائیں گے ہم کو وہی جامِ کوثر!
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ
ہمارے دلوں میں ہے انؐ کی محبت!
ہمارے دل و جان قربان انؐ پر
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ
گنہ گار ہوں امتی انؐ کا لیکن!!
ہے انؐ کے کرم سے مرا حال بہتر!!
وہی میرے آقاؐ، وہی میرے سرورؐ
عنایت کی اس پر نظر وہؐ کریں گے
لیے چشمِ تر آیا ہے پھولؔ احقر
وہی میرے آقا، وہی میرے سرور

سید ذوالفقار حسین نقوی (کراچی)

محمدؐ مصطفیٰ کی ذاتِ اقدس عکسِ قرآں ہے
یہی تو خار زارِ زیست میں راحت کا ساماں ہے

سلام انؐ پر کہ جن کی ذاتِ اقدس عین رحمت ہے
اُنھیؐ کا نامِ نامی تو مری بخشش کا عنواں ہے

یہ دوری جان لیوا ہے یہ فرقت کربِ پیہم ہے
مدینے اڑ کے جا پہنچوں یہی بس ایک ارماں ہے

مرے دامن میں بھر دی ہیں زمانے بھر کی سب خوشیاں
یہ سب انؐ کی عنایت ہے یہ سب آقا کا احساں ہے

قلم ہے ہاتھ میں میرے تو یہ انؐ کا تصدّق ہے
یہی میرا یقیں ہے اور یہی تو میرا ایماں ہے

غلامِ مصطفیٰؐ ہوں میں غلامِ مرتضیٰؓ ہوں میں
یہی ہے میری دولت اور یہی بخشش کا ساماں ہے

اے تاریکیوں سے خوف کب آتا ہے اے نقوؔی
چراغِ عشقِ احمدؐ جس کے سینے میں فروزاں ہے

اردو نعت اور جدید اسالیب

مصنف : عزیز احسن

ضخامت : 184 صفحات قیمت : 120 روپے

☆☆☆

اردو میں حمد و مناجات

مصنف : ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

ضخامت : 280 صفحات قیمت: 160 روپے

☆ ناشر ☆

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ : اردو بازار، کراچی

فون : 5-2629720 فیکس : 2633887

E-mail : fazlee@cyber.net.pk